

صغر حسین خان نظیر لدھیانوی ✲ کاروان

کُلّیاتِ غالب (اردو)

کُلّیاتِ غالب (اُردو)

مرتبہ

خان اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی

مکتبۂ کارواں کچہری روڈ لاہور

مطبع ـــــ کارواں پریس ـــــ لاہور

طابع و ناشر: چودھری عبدالحمید ایم۔اے۔

ـــــ قیمت دس روپے ـــــ

فہرست

پیش لفظ ۱-۲

مقدمہ دیوانِ غالب ۲-۱۴۸

(۱) غالب اپنے دور کے پس منظر میں ۳

رندِ شاہد باز ۱۴

درباد داری اور کرسی نشینی کی خواہش ۱۵

(۲) غالب کی شخصیت کا اثر ان کے فن پر ۱۶

تخیل اور طرزِ بیان کی ندرت ۲۱

ایک مخصوص فلسفۂ حیات ۲۸

مذہبی افکار ۳۳

غالب اور تصوّف ۳۴

غالب اور عقلیت ۳۸

غالب اور عشق ۴۰

غالب کی تشبیہات ۴۶

غالب کی انانیت ۴۹

آہنگِ تضاد ۵۵

(۳) غالب فکر و فن کے آئینے میں ۶۰

غالب کی شاعری کے تین دور ۶۰

غالب کا نظریۂ فن ۶۳

غالب کے کلام کی فکر انگیزی ۹۳

غالب کی داخلیت اور معروضیت ۱۰۴

کلامِ غالب کی تہذیبی قدر و قیمت ۱۰۵

نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت ۱۰۶

نسخۂ عرشی کی خصوصیات ۱۰۹

دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام ۱۱۰

"مرقعِ چغتائی" و "نقشِ چغتائی" ۱۱۰
دیوانِ غالب کی شرحیں ۱۱۰
(۴) توضیحات ۱۱۱
مذہب ۱۱۱
غالب اور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء ۱۱۳
تصوّف، عشق اور غزل ۱۱۴
حسّی تشبیہ یعنی ایمیج ۱۲۰
غالب اور معاشیات ۱۲۱
غالب کی لذت پرستی ۱۲۴
جمالیات ۱۲۷
غالب کی گرم گفتاری ۱۲۸
غالب اور مطالعۂ فطرت ۱۳۰
غالب اور سرقہ ۱۳۱
غالب اور عینیّت ۱۳۳
کلامِ غالب میں ترقی پسندانہ رجحانات ۱۳۵
غالب کا طنز ۱۳۷
غالب کی ارضیت ۱۴۲
(۵) غالب کا اسلوبِ بیان ۱۴۶
اغلاق و ابہام ۱۴۶
لفظی اور معنوی دقّت پسندی ۱۴۹
وسعتِ خیال ۱۵۰
نفسیاتی کیفیّت ۱۵۰
معنویّت ۱۵۲
فنی انضباط اور زبان کا برمحل استعمال ۱۵۵
بندش کی چستی ایک جمالیاتی قدر ہے ۱۵۷
کلامِ غالب کا تجزیہ، زبان کے نقطۂ نظر سے ۱۶۳
غالب کی شاعرانہ شخصیّت کا آہنگِ تضاد ۱۶۵

فہرست دیوان

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۱	نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا	۱
۲	جنوں گرم انتظار و نالہ بے تابی کمند آیا	۲
۳	عالم جہاں بعرضِ بساطِ وجود تھا	۳
۴	کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا	۳
۵	عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا	۴
۶	کارخانہ سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا	۵
۷	شوق ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا	۵
۸	دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلّی نہ ہوا	۶
۹	شبِ اختر قدحِ عیش نے محمل باندھا	۶
۱۰	جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا	۷
۱۱	شب کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا	۷
۱۲	نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا	۸
۱۳	شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا	۸
۱۴	نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا	۹
۱۵	نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوق کم میرا	۹
۱۶	پئے نذرِ کرم تحفہ ہے شرمِ نارسائی کا	۱۰
۱۷	نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا	۱۰
۱۸	شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا	۱۱
۱۹	وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا	۱۱
۲۰	گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا	۱۲
۲۱	کس کا خیال آئینۂ انتظار تھا	۱۳
۲۲	زبس خوں گشتۂ رشکِ وفا تھا وہم بسمل کا	۱۳
۲۳	لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا	۱۴

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۲۴	ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا	۱۴
۲۵	بہارِ رنگِ خونِ گل ہے ساماں اشکباری کا	۱۵
۲۶	طاؤس در رکاب ہے ہر ذرّہ آہ کا	۱۵
۲۷	خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا	۱۶
۲۸	یک ذرّۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا	۱۶
۲۹	بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	۱۷
۳۰	گر نہ احوالِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا	۱۷
۳۱	دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا	۱۸
۳۲	قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا	۱۸
۳۳	اُف نہ کی گو سوزِ دل سے بے محابا جل گیا دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا	۱۹
۳۴	پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا	۲۰
۳۵	تو دوست کسو کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا	۲۰
۳۶	عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا	۲۱
۳۷	خلوتِ آبلۂ پا میں ہے جولاں میرا	۲۱
۳۸	شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا	۲۲
۳۹	خود آرا وحشتِ چشمِ پری سے شب وہ بدخو تھا	۲۳
۴۰	دمیدن کے مکیں، جوں ریشۂ زیرِ زمیں پایا	۲۳
۴۱	نزاکت ہے فسونِ دعوئ طاقت شکستن ہا	۲۴
۴۲	بسانِ جوہرِ آئینہ از ویرانی دلہا	۲۴
۴۳	بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شبہا	۲۵
۴۴	بہ رہنِ شرم ہے باوصفِ شہرت اہتمام اس کا	۲۵
۴۵	یاد روزے کہ نفس در گرہِ یارب تھا	۲۶
۴۶	رات دل گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ نہ تھا	۲۶

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۴۷	بسکہ جوشِ گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا	۲۷
۴۸	کرے گر حیرتِ نظارہ طوفاں نکتہ گوئی کا	۲۸
۴۹	یک گام بے خودی سے لوٹیں بہارِ صحرا	۲۸
۵۰	وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا	۲۹
۵۱	کیا کس شوخ نے نازِ ازسرِ تمکیں نشستن کا	۲۹
۵۲	شب کہ دل زخمیِ عرضِ دو جہاں تیر آیا	۲۹
۵۳	سیرِ آں سوئے تماشا ہے طلب گاروں کا	۳۰
۵۴	عیادت سے زبس ٹوٹا ہے دل یارانِ غمگیں کا	۳۰
۵۵	وِردِ اسمِ حق سے دیدارِ صنم حاصل ہوا	۳۱
۵۶	ہے تنگ ز وا ماندہ شدن حوصلۂ پا	۳۱
۵۷	بسکہ عاجز نارسائی سے کبوتر ہو گیا	۳۲
۵۸	گرفتاری میں فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا	۳۲
۵۹	بہ مُہرِ نامہ جو بوسہ گلِ پیام رہا	۳۲
۶۰	سحر گہ باغ میں وہ حیرتِ گلزار ہو پیدا	۳۳
۶۱	دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا	۳۳
۶۲	ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا	۳۴
۶۳	محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا	۳۴
۶۴	بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا	۳۵
۶۵	دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا	۳۵
۶۶	یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا	۳۶
۶۷	ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا	۳۶
۶۸	درخورِ قہر و غضب جب کوئی ہم سا نہ ہوا	۳۷
۶۹	دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا۔	۳۸
۷۰	میں اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا؟	۳۸
۷۱	گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا	۳۹

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	نمبر شمار
۷۲	نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	۳۹
۷۳	ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا	۳۹
۷۴	ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا	۴۰
۷۵	جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا	۴۰
۷۶	عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا	۴۰
۷۷	بسکہ ہے میخانہ ویراں جوں بیابانِ خراب	۴۱
۷۸	ہے بہاراں میں خزاں پرور خیالِ عندلیب	۴۲
۷۹	پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب	۴۲
۸۰	جاتا ہوں جدھر سب کی اٹھتی ہے ادھر انگشت	۴۳
۸۱	افسوس کہ دنداں[1] کا کیا رزق فلک نے جن لوگوں کے تھے درخورِ عقدِ گہر انگشت	۴۴
۸۲	نیم رنگی جلوہ ہے بزمِ تجلی زارِ دوست	۴۴
۸۳	آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست	۴۴
۸۴	اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست	۴۴
۸۵	رہا گر کوئی تا قیامت سلامت	۴۵
۸۶	مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب یار لائے مرے بالیں پہ اسے پر کس وقت	۴۶
۸۷	دودِ شمعِ کشتہ گُل بزم سامانی عبث	۴۶
۸۸	نازِ لطفِ عشق با وصفِ توانائی عبث	۴۶
۸۹	گلشن میں بندوبست بہ ضبطِ دگر ہے آج گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج	۴۷
۹۰	جنبشِ گلبرگ سے ہے گل کے لب کو اختلاج	۴۸
۹۱	لو ہم مریضِ عشق کے تیماردار ہیں اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج	۴۸

[1] دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام میں دنداں کی بجائے "دیداں" ہے ملاحظہ ہو ص ۸۳

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۹۲	نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ	۴۸
۹۳	بے دل نہ نازِ وحشتِ جیبِ دریدہ کھینچ	۴۹
۹۴	قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ	۴۹
۹۵	دعویِٔ عشقِ بتاں سے بہ گلستاں گل و صبح	۵۰
۹۶	حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد	۵۰
۹۷	بسکہ وہ پاکوبیاں در پردۂ وحشت ہیں یاد	۵۱
۹۸	تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند	۵۲
۹۹	حسرت دستگرو پائے تحمل تا چند	۵۲
۱۰۰	بہ کامِ دل کریں کس طرح گمرہاں فریاد	۵۳
۱۰۱	بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار	۵۳
۱۰۲	نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر	۵۴
۱۰۳	صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر	۵۵
۱۰۴	دیا یاروں نے بیہوشی میں درماں کا فریب آخر	۵۵
۱۰۵	فسونِ یک دلی ہے لذتِ بیدادِ دشمن پر	۵۵
۱۰۶	شیشۂ آتشیں، رُخِ پُر نور	۵۶
۱۰۷	بسکہ مائل ہے وہ رشکِ ماہتاب آئینہ پر	۵۶
۱۰۸	بنیش بسعیِ ضبطِ جنوں نو بہار تر	۵۷
۱۰۹	گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر	۵۷
۱۱۰	کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر	۵۸
۱۱۱	ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور	۵۹
۱۱۲	لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور	۵۹
۱۱۳	بیگانۂ وفا ہے ہوائے چمن ہنوز	۶۰
۱۱۴	میں ہوں سراب یک تپش آموختن ہنوز	۶۰
۱۱۵	حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز	۶۱
۱۱۶	نہ گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز	۶۱
۱۱۷	داغِ اطفال ہے دیوانہ بہ کہسار ہنوز	۶۲

صفحہ	پہلا مصرع یا شعر	نمبر شمار
۶۳	حسنِ خود آرا کو ہے مشقِ تغافل ہنوز	۱۱۸
۶۳	چاکِ گریباں کو ہے ربطِ تامّل ہنوز	۱۱۹
۶۳	کو بیابانِ تمنّا و کجا جولانِ عجز	۱۲۰
۶۴	نہ بندھا تھا بہ عدم نقشِ دلِ مور ہنوز	۱۲۱
۶۴	کیونکر اس بُت سے رکھوں جان عزیز	۱۲۲
۶۵	کب فقیروں کو رسائی بتِ میخوار کے پاس	۱۲۳
۶۵	حاصلِ دل بستگی ہے عمرِ کوتاہ اور بس	۱۲۴
۶۶	دشتِ الفت میں ہے خاکِ کشتگاں محبوس و بس	۱۲۵
۶۶	کرتا ہے بہ یادِ بتِ رنگیں دلِ مایوس	۱۲۶
۶۶	ہوتی ہے بسکہ صرفِ مشقِ تمکینِ بہار آتش	۱۲۷
۶۷	بہ اقلیمِ سخن ہے جلوۂ گردِ سوادِ آتش	۱۲۸
۶۸	جادۂ رہ خور کو وقتِ شام ہے تارِ شعاع	۱۲۹
۶۸	رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیٔ شمع	۱۳۰
۶۹	عشاق اشکِ چشم سے دھوویں ہزار داغ	۱۳۱
۶۹	بلبلوں کو دور سے کرتا ہے منعِ بارِ باغ	۱۳۲
۷۰	نامہ بھی لکھتے ہو تو بخطِ غبارِ حیف	۱۳۳
۷۰	علیسیٰ مہرباں ہے شفارِیز یک طرف	۱۳۴
۷۱	زخم پر باندھے ہیں کب طفلانِ بے پروا نمک	۱۳۵
۷۱	آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک	۱۳۶
۷۲	آتے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک	۱۳۷
۷۳	گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ	۱۳۸
۷۳	ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل	۱۳۹
۷۴	بدر ہے آئینۂ طاقِ ہلال	۱۴۰
۷۴	ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل	۱۴۱
۷۵	ہوں بہ وحشت انتظار آوارہ دشتِ خیال	۱۴۲
۷۵	بہرِ عرضِ حالِ شبنم ہے رقمِ ایجادِ گل	۱۴۳

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۱۴۴	گرچہ ہے یک بیضۂ طاؤس آسا تنگ دِل	۷۶
۱۴۵	اثر کمندیِ فریادِ نارسا معلوم	۷۶
۱۴۶	بسکہ ہیں بدمستِ بشکن بشکنِ میخانہ ہم	۷۷
۱۴۷	رہتے ہیں افسردگی سے سخت بیدردانہ ہم	۷۷
۱۴۸	ازانجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم	۷۸
۱۴۹	جس دم کہ جادہ وارِ ہو تارِ نفس تمام	۷۸
۱۵۰	مجھکو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم	۷۹
۱۵۱	خوش وحشتے کہ عرضِ جنونِ فنا کروں	۷۹
۱۵۲	وہ فراق اور وہ وصال کہاں	۸۰
۱۵۳	غنچۂ ناشگفتہ کو دُور سے مت دکھا کہ یوں	۸۱
۱۵۴	غیر سے رات کیا بنی یہ جو کہا تو دیکھئے سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں	۸۱
۱۵۵	آنسو کہوں کہ آہ، سوارِ ہوا کہوں	۸۱
۱۵۶	ہم سے کھُل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن	۸۲
۱۵۷	جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں	۸۲
۱۵۸	مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں	۸۳
۱۵۹	جائیکہ پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں	۸۳
۱۶۰	ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں	۸۳
۱۶۱	ہے ترحّم آفریں آرائشِ بیدادیاں	۸۵
۱۶۲	سرشکِ آشفتہ سر تھا قطرہ زن مژگاں سے جانے میں	۸۵
۱۶۳	فزوں کی دوستوں نے حرصِ قاتل ذوقِ کشتن میں	۸۶
۱۶۴	نہیں ہے زخم کوئی بخیئے کے درخور مرے تن میں	۸۶
۱۶۵	پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں	۸۶
۱۶۶	تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں	۸۷
۱۶۷	صاف ہے ازبسکہ عکسِ گل سے گلزارِ چمن	۸۷

صفحہ	پہلا مصرع یا شعر	نمبر شمار
۸۸	جوں مردمکِ چشم سے ہوں جمع نگاہیں	۱۶۸
۸۸	حیرت کشِ یک جلوۂ معنی ہیں نگاہیں	۱۶۹
۸۸	تنے بہ بندِ ہوس در ندادہ رکھتے ہیں	۱۷۰
۸۹	طاؤس نمط داغ کے گر رنگ نکالوں	۱۷۱
۸۹	کس ضعف میں امید کو دل تنگ نکالوں	۱۷۲
۹۰	سودائے عشق سے دمِ سردِ کشیدہ ہوں	۱۷۳
۹۰	خوں در جگر نہفتہ بہ زردی رسیدہ ہوں	۱۷۴
۹۱	بقدرِ لفظ و معنی فکرت احرامِ گریباں ہے	۱۷۵
۹۱	مرگِ شیریں ہو گئی تھی کوہکن کی فکر میں	۱۷۶
۹۲	اے نوا سازِ تماشا سر بکف جلتا ہوں میں	۱۷۷
۹۲	فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں	۱۷۸
۹۲	بہ غفلت عطرِ گل ہم آگہی مخمور ملتے ہیں	۱۷۹
۹۳	ہوئی ہیں آبِ شرمِ کوشش بے جا سے تدبیریں	۱۸۰
۹۳	بے دماغی حیلہ جوئے ترکِ تنہائی نہیں	۱۸۱
۹۴	ظاہرا سر پنجۂ افتادگاں گیرا نہیں	۱۸۲
۹۴	ضبط سے مطلب بجز وارستگی دیگر نہیں	۱۸۳
۹۵	دیکھیے مت چشمِ کم سے سوئے ضبط افسرگاں	۱۸۴
۹۵	کی وفا ہم سے تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں	۱۸۵
۹۶	آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں	۱۸۶
۹۶	مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں	۱۸۷
۹۷	عشق تاثیر سے نومید نہیں	۱۸۸
۹۷	ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں	۱۸۹
۹۸	کل کے لئے کر آج نہ خشت شراب میں	۱۹۰
۹۸	حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں	۱۹۱
۹۹	ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں	۱۹۲

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۱۹۳	نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں	۹۹
۱۹۴	دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں	۱۰۰
۱۹۵	ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کارگر عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں	۱۰۰
۱۹۶	یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں	۱۰۰
۱۹۷	نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں	۱۰۰
۱۹۸	دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں	۱۰۱
۱۹۹	سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں	۱۰۱
۲۰۰	دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں	۱۰۲
۲۰۱	مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں	۱۰۳
۲۰۲	دِل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں	۱۰۳
۲۰۳	حسد پیمانہ سے دل عالمِ آب تماشا ہو	۱۰۴
۲۰۴	اگر وہ آفتِ نظارہ جلوہ گستر ہو	۱۰۵
۲۰۵	بے دردِ سر بسجدۂ الفت فرو نہ ہو	۱۰۵
۲۰۶	مبادا بے تکلّف فصل کا برگِ دل نوا گُم ہو	۱۰۶
۲۰۷	خشکیٔ مے نے تلف کی میکدے کی آبرو	۱۰۶
۲۰۸	رنگِ طرب ہے صورتِ عہدِ وفا گرو	۱۰۷
۲۰۹	کعبہ میں جا رہا تو نہ دو طعنہ کیا کہیں بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو	۱۰۷
۲۱۰	وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو	۱۰۷
۲۱۱	قفس میں ہوں، گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو	۱۰۸
۲۱۲	دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں	۱۰۹
۲۱۳	واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو	۱۰۹
۲۱۴	واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو	۱۰۹

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۲۱۵	تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو	۱۱۰
۲۱۶	گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو	۱۱۱
۲۱۷	کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو	۱۱۱
۲۱۸	رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو	۱۱۲
۲۱۹	از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ	۱۱۲
۲۲۰	جز دل سراغِ دردِ بدل خفتگاں نہ پوچھ	۱۱۳
۲۲۱	ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ! جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ	۱۱۳
۲۲۲	رفتار سے شیرازۂ اجزائے قدم باندھ	۱۱۳
۲۲۳	خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ	۱۱۴
۲۲۴	بسکہ مے پیتے ہیں اربابِ فنا پوشیدہ	۱۱۴
۲۲۵	جوشِ دل ہے نشہ ہائے فطرتِ بیدل نہ پوچھ	۱۱۵
۲۲۶	شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ	۱۱۵
۲۲۷	کلفتِ ربطِ این و آں غفلتِ مدعا سمجھ	۱۱۵
۲۲۸	دل ہی نہیں کہ منتِ درباں اٹھائیے	۱۱۶
۲۲۹	ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے	۱۱۷
۲۳۰	غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی	۱۱۷
۲۳۱	بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی	۱۱۸
۲۳۲	حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی	۱۱۸
۲۳۳	کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے	۱۱۹
۲۳۴	درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے	۱۱۹
۲۳۵	سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے	۱۲۰
۲۳۶	گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے	۱۲۰
۲۳۷	نظر بہ نقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے	۱۲۱
۲۳۸	رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے	۱۲۲
۲۳۹	ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے	۱۲۲

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۲۴۰	کہوں کیا گرمجوشی مے کشی میں شعلہ رویاں کی	۱۲۳
۲۴۱	جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی	۱۲۳
۲۴۲	نکوہش ہے سزا، فریادیِ بیدادِ دلبر کی	۱۲۴
۲۴۳	آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے	۱۲۴
۲۴۴	ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے	۱۲۵
۲۴۵	تشنۂ خونِ تماشا جو وہ پانی مانگے	۱۲۵
۲۴۶	ہم زباں آیا نظر فکرِ سخن میں تو مجھے	۱۲۶
۲۴۷	باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے	۱۲۷
۲۴۸	نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی	۱۲۷
۲۴۹	دلِ بیمار از خود رفتہ تصویرِ نہالی ہے	۱۲۸
۲۵۰	تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے	۱۲۸
۲۵۱	نشۂ مے بے چمن دودِ چراغِ کشتہ ہے	۱۲۹
۲۵۲	گلشن کو تری صحبت از بسکہ خوش آئی ہے	۱۲۹
۲۵۳	یوں بعدِ ضبطِ اشک پھروں گرد یار کے	۱۳۰
۲۵۴	بہ نقصِ ظاہری رنگِ کمالِ طبع پنہاں ہے	۱۳۰
۲۵۵	جہاں زندانِ موحشتانِ دلہائے پریشاں ہے	۱۳۰
۲۵۶	ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے	۱۳۱
۲۵۷	عاشق نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیے	۱۳۲
۲۵۸	چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے	۱۳۲
۲۵۹	چشمِ خوباں مے فروشِ نشۂ زارِ ناز ہے	۱۳۲
۲۶۰	خرابِ جمعیتِ مہمل ہے پریشاں مجھ سے	۱۳۳
۲۶۱	ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے	۱۳۳
۲۶۲	بسکہ حیرت سے زپا افتادۂ زنہار ہے	۱۳۴
۲۶۳	تغافل مشربی سے ناتمامی بسکہ پیدا ہے	۱۳۵
۲۶۴	اثر سوزِ محبت کا قیامت بے محابا ہے	۱۳۵
۲۶۵	بہ بزمِ مے پرستی حسرتِ تکلیف بے جا ہے	۱۳۶

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۲۶۶	عیادت بسکہ تجھ سے گرمیٔ بازارِ بستر ہے	۱۳۶
۲۶۷	خطر ہے رشتۂ الفت رگِ گردن نہ ہو جائے	۱۳۷
۲۶۸	دہ مژہ بر آہ رہ وا بانیدن از دل تیز ہے	۱۳۷
۲۶۹	تر جبیں رکھتی ہے شرمِ قطرہ سامانی مجھے	۱۳۸
۲۷۰	دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے	۱۳۸
۲۷۱	یاد ہے شادی میں عقدِ نالۂ "یارب" مجھے یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ یارب مجھے	۱۳۹
۲۷۲	زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے	۱۳۹
۲۷۳	شوخیِ مضرابِ جولاں آبیارِ نغمہ ہے	۱۴۰
۲۷۴	خود فروشی ہائے ہستی، بسکہ جائے خندہ ہے	۱۴۰
۲۷۵	حسنِ بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے	۱۴۱
۲۷۶	جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی	۱۴۱
۲۷۷	بلاغ تجھ بن گُلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے	۱۴۲
۲۷۸	کوہ کے ہوں بارِ خاطر گر صدا ہو جائیے	۱۴۳
۲۷۹	داغ، پشتِ دستِ عجز شعلہ خس بہ دنداں ہے	۱۴۳
۲۸۰	غمِ عشرت قدم بوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے	۱۴۴
۲۸۱	دیکھتا ہوں وحشتِ شوقِ خروش آمادہ سے	۱۴۴
۲۸۲	منّت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے	۱۴۴
۲۸۳	جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے	۱۴۵
۲۸۴	خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے	۱۴۶
۲۸۵	آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے	۱۴۶
۲۸۶	شبنم، بہ گُلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے	۱۴۷
۲۸۷	پھونکتا ہے نالہ ہر شب صورِ اسرافیل کی	۱۴۷
۲۸۸	کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے	۱۴۸
۲۸۹	نگاہ اس چشم کی افزوں کرے ہے ناتوانائی	۱۴۸
۲۹۰	بسکہ زیرِ خاک با آبِ طراوت راہ ہے	۱۴۹

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۲۹۱	بسکہ چشم از انتظارِ خوش خطاں بے نور ہے	۱۴۹
۲۹۲	اے خیالِ وصل نادر ہے مے آشامی تری	۱۵۰
۲۹۳	ربطِ تمیزِ اعیاں، دُردِ مئے صدا ہے	۱۵۰
۲۹۴	گر یاس سر نہ کھینچے، تنگی عجب فضا ہے	۱۵۱
۲۹۵	ضبط سے جوں مردمک اسپند اقامت گیر ہے	۱۵۱
۲۹۶	ذوقِ بے پروا خرابِ وحشتِ تسخیر ہے	۱۵۱
۲۹۷	یہ سرنوشت میں تیری ہے اشک افشانی	۱۵۲
۲۹۸	بے خود زبسکہ خاطرِ بیتاب ہو گئی	۱۵۲
۲۹۹	ہر رنگِ سوز پردۂ یک ساز ہے مجھے	۱۵۳
۳۰۰	نگاہِ یار نے جب عرضِ تکلیفِ شرارت کی	۱۵۳
۳۰۱	خدایا! دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے	۱۵۴
۳۰۲	ہوا جب حسن کم، خط بر عذارِ سادہ آتا ہے۔	۱۵۴
۳۰۳	بہ فکرِ حیرتِ رم آئنہ پرواز زانو ہے	۱۵۴
۳۰۴	خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے	۱۵۵
۳۰۵	دیکھ تیری خوئے گرم دل بہ تپش رام ہے	۱۵۵
۳۰۶	کاوشِ دزدِ حنا پوشیدہ افسوں ہے مجھے	۱۵۵
۳۰۷	دلا! عبث ہے تمنائے خاطر افروزی	۱۵۶
۳۰۸	مجھ آرامیدگی سامانِ بے تابی کرے	۱۵۶
۳۰۹	صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے	۱۵۷
۳۱۰	اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے	۱۵۷
۳۱۱	بہارِ تعزیت آبادِ عشق ماتم ہے	۱۵۷
۳۱۲	عذارِ یار نظر بندِ چشمِ گریاں ہے	۱۵۸
۳۱۳	شفق بدعوئے عاشق گواہِ رنگیں ہے	۱۵۸
۳۱۴	جوہرِ آئینہ ساں مژگاں بہ دل آسودہ ہے	۱۵۹
۳۱۵	بہرِ پروردن سراسر لطف گستر سایہ ہے	۱۵۹
۳۱۶	چشمِ گریاں بسملِ شوقِ بہارِ دید ہے	۱۵۹

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۳۱۷	فرصتِ آئینہ صد رنگِ خود آرائی ہے	۱۶۰
۳۱۸	نوائے خفتۂ الفت اگر بیتاب ہو جاوے	۱۶۰
۳۱۹	تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے	۱۶۱
۳۲۰	دامانِ دل بہ وہمِ تماشا نہ کھینچیے	۱۶۱
۳۲۱	زلفِ سیہ افعی نظرِ بد قلمی ہے	۱۶۱
۳۲۲	بسکہ سودائے خیالِ زلف وحشت ناک ہے	۱۶۲
۳۲۳	مژہ، پہلوئے چشم، اے جلوۂ ادراک باقی ہے	۱۶۲
۳۲۴	شکلِ طاؤس، گرفتار بنایا ہے مجھے	۱۶۳
۳۲۵	جنوں رسوائیٔ وارستگی زنجیر بہتر ہے	۱۶۳
۳۲۶	دریوزۂ ساماں ہا، اے بے سر و سامانی	۱۶۴
۳۲۷	گریہ، سرشاریٔ شوقے بہ بیاباں زدہ ہے	۱۶۴
۳۲۸	خوابِ غفلت بہ کمیں گاہِ نظر پنہاں ہے	۱۶۴
۳۲۹	مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے	۱۶۵
۳۳۰	نظر پرستی و بیکاری و خود آرائی	۱۶۵
۳۳۱	کوشش ہمہ بیتابِ تردد شکنی ہے	۱۶۶
۳۳۲	کاشانۂ ہستی کہ برانداختنی ہے	۱۶۶
۳۳۳	گلستاں بے تکلف پیش پا افتادہ مضموں ہے	۱۶۶
۳۳۴	گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے	۱۶۷
۳۳۵	حکمِ بیتابی نہیں اور آرمیدن منع ہے	۱۶۷
۳۳۶	قتلِ عشاق نہ غفلت کشِ تدبیر آوے	۱۶۸
۳۳۷	تا چند نفس غفلتِ ہستی سے بر آوے	۱۶۸
۳۳۸	چار سوئے عشق میں صاحب دکانی مفت ہے	۱۶۹
۳۳۹	بیتابیٔ یادِ دوست ہم رنگِ تسلی ہے	۱۶۹
۳۴۰	اگر گل حسن و الفت کی بہم جوشیدنی جانے	۱۶۹
۳۴۱	سوختگاں کی خاک میں ریزشِ نقشِ داغ ہے	۱۷۰
۳۴۲	مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے	۱۷۰

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۳۴۳	تاہم کہ شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا سن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے	۱۷۱
۳۴۴	گھر میں تھا کیا؟ کہ ترا غم اسے غارت کرتا وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر سو ہے	۱۷۱
۳۴۵	پینس سے گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ میرے کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے	۱۷۱
۳۴۶	عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی	۱۷۱
۳۴۷	زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے ہیں	۱۷۲
۳۴۸	اس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے	۱۷۲
۳۴۹	دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے	۱۷۲
۳۵۰	گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے	۱۷۳
۳۵۱	اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے	۱۷۳
۳۵۲	سادگی پر اس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے	۱۷۳
۳۵۳	دِل آپ کا؟ کہ دل میں جو کچھ سب ہے آپ کا دل لیجئے، مگر مرے ارماں نکال کے	۱۷۴
۳۵۴	دل سے تری نگاہ جگر تک اتر گئی	۱۷۴
۳۵۵	تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے	۱۷۵
۳۵۶	کوئی دن گر زندگانی اور ہے	۱۷۵
۳۵۷	کوئی امید بر نہیں آتی	۱۷۵
۳۵۸	دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟	۱۷۶
۳۵۹	کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے	۱۷۷
۳۶۰	پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے	۱۷۷
۳۶۱	بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے	۱۷۸
۳۶۲	ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے	۱۷۸

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۳۶۳	عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے	۱۷۹
۳۶۴	شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے	۱۸۰
۳۶۵	ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم، کہ "تو کیا ہے"	۱۸۰
۳۶۶	میں انہیں چھیڑوں، اور وہ کچھ نہ کہیں چل نکلتے جو مے پیے ہوتے	۱۸۱
۳۶۷	جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے	۱۸۱
۳۶۸	حسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے	۱۸۲
۳۶۹	غیر لیں محفل میں بوسے جام کے	۱۸۲
۳۷۰	پھر اس انداز سے بہار آئی	۱۸۳
۳۷۱	کب وہ سنتا ہے کہانی میری	۱۸۳
۳۷۲	جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی	۱۸۴
۳۷۳	چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے	۱۸۴
۳۷۴	نکتہ چیں ہے غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے	۱۸۵
۳۷۵	وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے	۱۸۵
۳۷۶	فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے	۱۸۵
۳۷۷	نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے	۱۸۶
۳۷۸	ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے	۱۸۶
۳۷۹	کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگ فروغ خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے	۱۸۶
۳۸۰	دیا ہے دل، اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے	۱۸۷
۳۸۱	حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے	۱۸۷
۳۸۲	کبھی نیکی بھی اس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے	۱۸۸
۳۸۳	لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے	۱۸۸
۳۸۴	بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے	۱۸۸
۳۸۵	کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے!"	۱۸۹

صفحہ	پہلا مصرع یا شعر	نمبر شمار
۱۹۰	رونے سے اور عشق میں بیباک ہو گئے	۳۸۶
۱۹۰	ابنِ مریم ہوا کرے کوئی	۳۸۷
۱۹۱	بہت سہی، غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے	۳۸۸
۱۹۱	رونمائی ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی	۳۸۹
۱۹۱	ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے	۳۹۰
۱۹۲	ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنا مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے	۳۹۱
۱۹۲	منظور تھی یہ شکل تجلی کو نور کی	۳۹۲
۱۹۳	غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے	۳۹۳
۱۹۳	مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے	۳۹۴
۱۹۴	نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے	۳۹۵
۱۹۵	میں ہوں مشتاقِ جفا مجھ پہ جفا اور سہی	۳۹۶

قصائد

صفحہ	پہلا مصرع یا شعر	نمبر شمار
۱۹۶	بہرِ ترویجِ جنابِ والئی یوم الحساب	۳۹۷
۱۹۹	سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار	۳۹۸
۳۰۵	توڑے ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمیں	۳۹۹
۲۰۹	جو نہ نقدِ داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی	۴۰۰
۲۱۱	ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام	۴۰۱
۲۱۲	(غزل) زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام	۴۰۲
۲۱۴	صبحدم دروازۂ خاور کھلا	۴۰۳
۲۱۵	(غزل) کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا	۴۰۴
۲۱۶	(در صفتِ انبہ) ہاں دلِ درد مند زمزمہ ساز (مثنوی) کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز	۴۰۵

قطعات

صفحہ	پہلا مصرع یا شعر	نمبر شمار
۲۱۹	اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر اے جہاں دارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل	۴۰۶

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۴۰۷	گئے وہ دن کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے	۲۲۰
۴۰۸	کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے	۲۲۰
۴۰۹	(چکنی ڈلی کی تعریف) ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے	۲۲۰
۴۱۰	(بیسنی روٹی) نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی	۲۲۱
۴۱۱	(سہرا) خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا	۲۲۱
۴۱۲	(گزارش) منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی اپنا بیانِ حسنِ طبیعت، نہیں مجھے	۲۲۲
۴۱۳	(مدح) نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے	۲۲۲
۴۱۴	ہے چار شنبہ آخر ماہِ صفر چلو رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند	۲۲۳
۴۱۵	(در مدحِ شاہ) اے شاہِ جہانگیر جہاں بخش جہاں دار ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت	۲۲۳
۴۱۶	افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے	۲۲۴
۴۱۷	(گزارشِ مصنف بحضورِ شاہ) اے شہنشاہِ آسماں اورنگ اے جہاندارِ آفتاب آثار	۲۲۴
۴۱۸	سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے	۲۲۶
۴۱۹	سہل تھا مسہل ولے یہ سخت مشکل آ پڑی مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بن ہوئے	۲۲۶
۴۲۰	بسکہ فعّالِ ما یرید ہے آج ہر سلحشور انگلستان کا	

صفحہ	پہلا مصرع یا شعر	نمبر شمار
	قطعاتِ تاریخ	
۲۲۷	خجستہ انجمنِ طوے میرزا جعفر / کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ	۴۲۱
۲۲۷	ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی / ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید	۴۲۲
۲۲۷	گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں / دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں	۴۲۳
	رباعیات	
۲۲۸	بعد از اتمام بزمِ عیدِ اطفال	۴۲۴
۲۲۸	شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا	۴۲۵
۲۲۸	دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی	۴۲۶
۲۲۸	ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے	۴۲۷
۲۲۸	مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل	۴۲۸
۲۲۹	ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا	۴۲۹
۲۲۹	سامانِ ہزار جستجو یعنی دل	۴۳۰
۲۲۹	اے کاشِ بتاں کا خنجرِ سینہ شگاف	۴۳۱
۲۲۹	اے کثرتِ فہم بے شمار اندیشہ	۴۳۲
۲۲۹	دل سوزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج	۴۳۳
۲۲۹	گر جوہر امتیاز ہوتا ہم میں	۴۳۴
۲۲۹	آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال	۴۳۵
۲۳۰	دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا	۴۳۶
۲۳۰	دکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ	۴۳۷
۲۳۰	بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جم جاہ نے دال	۴۳۸
۲۳۰	ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم	۴۳۹
۲۳۰	حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے	۴۴۰
۲۳۰	اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا	۴۴۱
۲۳۰	کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں	۴۴۲

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۴۴۳	ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے	۲۲۰
۴۴۴	سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں	۲۳۱
۴۴۵	الٰہی سیم کے بجوں کو کوئی کیا جانے	۲۳۱
۴۴۶	ضمیمۂ دیوانِ غالب	۲۳۳

قطعات

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۴۴۷	ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو - رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشکبو کی ناند	۲۳۳
۴۴۸	اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ میں جوشِ وحشت میں - پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے	۲۳۴
۴۴۹	ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس ؛ یوں کہا آتی نہیں کیوں اے صدائے عندلیب	۲۳۴
۴۵۰	مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قل ؛ بجے ہے جوگ مایا اور دیبی	۲۳۴
۴۵۱	جبکہ سید غلام بابا نے ؛ مسندِ عیش پر جگہ پائی	۲۳۵
۴۵۲	اس کتابِ طرب نصاب نے جب ؛ آب و تابِ انطباع کی پائی	۲۳۵
۴۵۳	ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے ؛ جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور	۲۳۵
۴۵۴	گرہ گانویں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم ؛ عاشق ہے اپنے حاکمِ عادل کے نام کی	۲۳۶
۴۵۵	سلیم خاں کہ وہ نورِ چشمِ واصل خاں ؛ حکیم حاذق و دانا ہے وہ لطیف کلام	۲۳۶
۴۵۶	خوشی ہے یہ، آنے کی برسات ہے ؛ پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں	۲۳۷
۴۵۷	مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطۂ خاک ؛ رہا ہے زور سے، ابرِ ستارہ بار، برس	۲۳۷
۴۵۸	پور وہ فرزند احمد کو ملا ؛ رحمتِ باری کا جو گنجینہ ہے	۲۳۷
۴۵۹	ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں ؛ حیدر آباد دکن، رشکِ گلستانِ ارم	۲۳۸

مثنویات

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۴۶۰	ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی ؛ لے کے دل سر رشتۂ آزادگی	۲۳۹
۴۶۱	(پنج گنج کا منظوم اشتہار) مژدہ اے رہروانِ راہِ سخن ؛ پایہ سنجانِ دستگاہِ سخن	۲۳۹
۴۶۲	(قادر نامہ) قادر اور اللہ اور یزداں ہے خدا ؛ ہے نبی، مرسل، پیغمبر، رہنما	۲۴۱
۴۶۳	(غزل) صبح سے دیکھیں گے رستا یار کا	۲۴۶
۴۶۴	(غزل) شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں	۲۴۸
۴۶۵	اے جہاں آفریں خدائے کریم ؛ صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم	۲۴۸
۴۶۶	(قصائد) بلاذِ کشور و لشکر پناہِ شہر و سپاہ	۲۴۸
۴۶۷	گئی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ	۲۵

صفحہ	پہلا مصرع یا شعر	نمبر شمار
۲۵۱	مرحبا سالِ فرخی آئین	۴۶۸
۲۵۳	کرتا ہے چرخ روز بصد گونہ احترام	۴۶۹
۲۵۵	(مرثیہ) ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو	۴۷۰
۲۵۵	(سہرا) چرخ تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا	۴۷۱
۲۵۶	ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں ∴ بزم شادی ہے فلک کاہکشاں ہے سہرا	۴۷۲
۲۵۶	(مخمس) گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی	۴۷۳
۲۵۸	(غزلیات) جگر سے ٹوٹے ہوئے ہو گئی ہے سناں پیدا	۴۷۴
۲۵۸	سات جلدوں کا پارسل پہنچا	۴۷۵
۲۵۸	اِن دلفریبیوں پہ نہ کیوں اُس پہ پیار آئے روٹھا جو بے گناہ تو بے عذر من گیا	۴۷۶
۲۵۸	خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا	۴۷۸
۲۵۸	تھا تو خط پر نہ تھا جواب طلب ∴ کوئی اس کا جواب کیا لکھتا	۴۷۹
۲۵۸	دو رنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی ہیں سب ∴ کہ مردوں کو نہ بدلتے ہوئے کفن دیکھا	۴۸۰
۲۵۸	پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی ∴ روزن کی طرح، دید کا آزار رہ گیا	۴۸۱
۲۵۸	آفت آہنگ ہے کچھ نالۂ بلبل ورنہ ∴ پھول ہنس ہنس کے گلستاں میں فنا ہو جاتا	۴۸۲
۲۵۹	ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب ∴ نظام الدین کو خسرو، سراج الدین کو غالب	۴۸۳
۲۵۹	کوئی اس کا جواب دو صاحب	۴۸۴
۲۵۹	خدا سے میں بھی چاہوں از رہِ مہر ∴ فروغِ میرزا حاتم علی مہر	۴۸۵
۲۵۹	بنازِ عشق خرمن سوزِ اربابِ ہوس بہتر	۴۸۶
۲۵۹	سنین عمر کے، ستر ہوئے شمار برس	۴۸۷
۲۵۹	یاد آیا جو وہ کہنا کہ نہیں، واہ غلط	۴۸۸
۲۵۹	بدتر از ویرانہ ہے فصلِ خزاں میں صحنِ باغ	۴۸۹
۲۶۰	دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک	۴۹۰
۲۶۰	ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک	۴۹۱
۲۶۰	پیر و مرشد معاف کیجیے گا ∴ میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال	۴۹۲
۲۶۱	محفلِ شمعِ عذاراں میں جو آ جاتا ہوں	۴۹۳
۲۶۱	اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں	۴۹۴

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۴۹۵	جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں	۲۶۱
۴۹۶	تم سلامت رہو قیامت تک ✽ دولت و عزّ و جاہ روز افزوں	۲۶۱
۴۹۷	درہم و دام اپنے پاس کہاں	۲۶۱
۴۹۸	جوں شمع ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں	۲۶۱
۴۹۹	در پر امیر کلب علی خاں کے ہوں مقیم	
۵۰۰	شائستۂ گدائی ہر در نہیں ہوں میں	۲۶۲
۵۰۱	ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں	۲۶۲
۵۰۲	میں بھولا نہیں تجھ کو اے مری جاں	۲۶۳
۵۰۳	نسخۂ سوزشِ دل درخورِ عتاب نہیں	۲۶۳
۵۰۴	بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے شیخ جی ✽ کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں	۲۶۳
۵۰۵	دیکھتا ہوں اسے، تھی جس کی تمنّا مجھ کو	۲۶۳
۵۰۶	شمشیرِ صافِ یار، جو زہرآب دادہ ہو	۲۶۳
۵۰۷	وضعِ نیرنگیِ آفاق نے مارا ہم کو	۲۶۳
۵۰۸	حسنِ بے پروا، گرفتارِ خود آرائی نہ ہو	۲۶۴
۵۰۹	بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں، تو شام ہو	۲۶۴
۵۱۰	گاتی تھیں شمرو کی بیگم، تلناہا یا ہو ✽ دودھ میں پکے تھے شلغم تلناہا یا ہو	۲۶۵
۵۱۱	شبِ وصال میں مونس گیا ہے بن تکیہ	۲۶۵
۵۱۲	نہ پوچھ حال اس انداز، اس عتاب کے ساتھ	۲۶۵
۵۱۳	ہنستے ہیں، دیکھ دیکھ کے، سب ناتواں مجھے	۲۶۶
۵۱۴	دیکھ وہ برقِ تبسّم بسکہ دل بیتاب ہے	۲۶۶
۵۱۵	اب گرم آہ کی تو ہزاروں کے گھر جلے	۲۶۶
۵۱۶	ماہِ نو ہوں، کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے	۲۶۶
۵۱۷	زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانتا ہے	۲۶۶
۵۱۸	صبا لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی ✽ کہ روئے غنچہ گل سوئے آشیاں پھر جائے	۲۶۶
۵۱۹	نسیمِ صبح جب کنعاں میں بوئے پیرہن لائی	۲۶۶
۵۲۰	وفا جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے	۲۶۷
۵۲۱	رحم بہ مایوسیِ عاشق ہے تغافل ان کا ✽ یہ کبھی قتل کریں گے نہ پشیماں ہوں گے	۲۶۷

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۵۲۲	نمائش پردہ دارِ طرزِ بیدادِ تغافل ہے	۲۶۷
۵۲۳	بھولے ہوئے جو غم ہیں انہیں یاد کیجیے	۲۶۸
۵۲۴	ہم سے خوبانِ جہاں پہلو تہی کرتے رہے	۲۶۸
۵۲۵	درد ہو دل میں، تو دوا کیجیے	۲۶۸
۵۲۶	سکوت و خامشی، اظہارِ حالِ بے زبانی ہے	۲۶۹
۵۲۷	کس کی برقِ شوخیِ رفتار کا دلدادہ ہے	۲۶۹
۵۲۸	اس جور و جفا پر بھی بدظن نہیں ہم تجھ سے	۲۶۹
۵۲۹	روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے	۲۷۰
۵۳۰	دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ ہے آپ کا ؛ دل لیجیے مگر مرے ارمان نکال کے	۲۷۰
۵۳۱	زر افشاں مانگ ہے، اور سبزہ اس پر اک دوشالا ہے	۲۷۰
۵۳۲	بتو، توبہ کرو، تم کیا ہو جب ادبار آتا ہے	۲۷۰
۵۳۳	بجا ہے شیر جی اگر چھوڑ دلی حج کو چلی	۲۷۰
۵۳۴	ذرا کر زور سینے پر، کہ تیرِ پُرستم نکلے	۲۷۰
۵۳۵	گو نہ ملتے تھے، پر اک شہر میں تو رہتے تھے	۲۷۰
۵۳۶	آپ نے مسّنی الضّر کہا ہے تو سہی	۲۷۰
۵۳۷	کٹے تو شب کہیں، کاٹے نہ سانپ کہلائے ؛ کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خم بخم کیا ہے	۲۷۱
۵۳۸	لطفِ نظارۂ قاتل، دمِ بسمل آئے	۲۷۱
۵۳۹	مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے ؛ یہ بندۂ کمینہ ہمسایۂ خدا ہے	۲۷۱
۵۴۰	آج یک شنبے کا دن ہے آؤ گے	۲۷۱
۵۴۱	تحریر ہے یہ غالبِ یزداں پرست کی ؛ تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست کی	۲۷۲
۵۴۲	دمِ واپسیں برسرِ راہ ہے ؛ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے	۲۷۲
۵۴۳	جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری	۲۷۲
۵۴۴	رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے	۲۷۲
۵۴۵	اے روشنیٔ دیدہ شہاب الدین خاں	۲۷۲
۵۴۶	اے غشیِ خیرہ سر! سخن ساز نہ ہو	۲۷۲
۵۴۷	کھاتا نہ انہیں کہ یہ پرائے ہیں آم	۲۷۲
۵۴۸	سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اسکو	۲۷۳
۵۴۹	اتمّہ، اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے ہیں	۲۷۴

نمبر شمار	پہلا مصرع یا شعر	صفحہ
۵۵۰	(مصرع) معلوم ہوا خیر کہ ٹھینگا باجا	۲۷۵
۵۵۱	(مصرع) خوشنودیٔ احباب کا طالب غالبؔ	۲۷۵
۵۵۲	خدا کے بعد نبیؐ اور نبیؐ کے بعد امام ؛ یہی ہے مذہب حق والسّلام والاکرام	۲۷۵
۵۵۳	میں قائلِ خدا و نبیؐ و امام ہوں ؛ بندہ خدا کا اور علیؑ کا غلام ہوں	۲۷۵
۵۵۴	(مصرع) جو پائے حالِ دہلی والو رسلام لو	۲۷۵
۵۵۵	(مصرع) دیکھئے کیا جواب آتا ہے	۲۷۵
۵۵۶	یہ خبط نہیں تو پھر کیا ہے؟	۲۷۵
۵۵۷	(مصرع) اے اہلِ بزم کوئی تو بولو خدا لگی	۲۷۵
۵۵۸	(رباعی) اصحاب کو جو ناسزا کہتے ہیں	۲۷۵
۵۵۹	" یارانِ رسولؐ یعنی اصحاب کبار	۲۷۵
۵۶۰	" یارانِ نبیؐ میں تھی لڑائی کس میں	۲۷۵
۵۶۱	" یارانِ نبیؐ سے رکھ تولاّ باللہ	۲۷۵
۵۶۲	" اسقدر ضبط کہاں ہے، کبھی آ بھی نہ سکوں	۲۷۶
۵۶۳	" شاہا تجھے یا دولت و بختِ فیروز	۲۷۶
۵۶۴	قطعہ - عید آئی ہے، دلِ اہلِ زمانہ شاد ہے	۲۷۶
۵۶۵	" گلشنِ دہر میں بسنت آئی	۲۷۶
۵۶۶	مزا تو جب ہے، کہ اے آہِ نارسا ہم سے ؛ وہ خود کہے کہ بتا، تیری آرزو کیا ہے	۲۷۶
۵۶۷	جو معشوق زلفِ دوتا باندھتے ہیں	۲۷۶
۵۶۸	وصل میں ہجر کا ڈر یاد آیا	۲۷۷
۵۶۹	پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ عشق ؛ جوں شمع اپنی آپ وہ خوراک ہو گئے	۲۷۷
۵۷۰	حالت ترے عاشق کی یہ اب آن بنی ہے	۲۷۷
۵۷۱	گھر سے نکلنا ہے اگر ہاں نکلئے	۲۷۷
۵۷۲	لیں بوسہ، یا مصیبتِ ہجراں بیاں کریں ؛ اک منہ ہے، کون کون سے ارماں نکالئے	۲۷۷
۵۷۳	(مخمس) دل کو ہر چند میں دنیا قسم چند رہا	۲۷۷
۵۷۴	" واہ وا اثرِ طالعِ محبت ہے یہی	۲۷۸
۵۷۵	نتیجہ اپنی آہوں کا ہے شکلِ مثنوی پورا ؛ ہیولہ صورت کابوس پھر خواب گراں کیوں ہو	۲۷۸
۵۷۶	جو حدِ تقویٰ ادا نہ ہووے - تو اپنا مذہب یہی ہے غالبؔ ؛ ہوس نہ رہ جائے کوئی باقی، گناہ کیجے تو خوب کیجے	۲۷۸

پیش لفظ

(از اصغر حسین خاں نظیرؔ لودھیانوی)

کوکبم را در عدم اوجِ قبولے بودہ است
شہرتِ شعرم بہ گیتی بعد من خواہد شدن (غالب)

مرزا غالب کا اردو دیوان پہلی بار ۱۸۴۹ء میں شائع ہُوا تھا۔ جسے مصنّف تذکرہ "آبِ حیات" کے بیان کے مطابق مولوی فضل حق سر رشتہ دار عدالتِ ضلع اور مرزا خاں عرف مرزا خانی کوتوال شہر نے مرتب کیا تھا۔ اس میں کچھ تمام اور کچھ ناتمام غزلیں اور کچھ متفرق اشعار ہیں۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ "یہی وہ دیوان ہے جو کہ ہم آج عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔ جس قدر عالم میں مرزا کا نام بلند ہے اس سے ہزاروں درجے عالمِ معنی میں کلام بلند ہے۔" اس منتخب دیوان کی اشاعت کے بعد وقتاً فوقتاً اس دیوان کے کئی نئے اڈیشن شائع ہوئے۔ جن میں چھ سات نئی غزلیں شامل ہیں۔ آخر ریاست بھوپال کے کتب خانے سے مرزا غالب کا مکمل دیوان مل گیا۔ جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ مرزا غالب کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔ یہ نسخہ دیوانِ غالب (نسخۂ حمیدیہ) کے نام سے شائع ہوا۔ اور یہ سمجھا جانے لگا کہ یہی مرزا کا مکمل دیوان ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی مرزا

کی بعض نایاب غزلیں رسالوں اور اخبارات میں وقتاً فوقتاً چھپتی رہیں جو نسخۂ حمیدیہ میں شامل نہیں تھیں انجام کار ریاست رامپور کے کتب خانے سے دیوان غالبؔ کا ایک اور نسخہ ہاتھ آ گیا۔ جس میں نسخۂ حمیدیہ کے علاوہ مرزا کا آخر عمر کا کلام بھی تھا۔ یہ نسخہ امتیاز علی عرشی نے ضروری حواشی کے ساتھ ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع کیا۔

اب مکتبۂ کارواں لاہور کے ادب پرور اور علم دوست مالک چودھری عبدالحمید ایم اے (علیگ) نے دیوانِ غالب کے تمام مطبوعہ نسخے فراہم کیے۔ تاکہ مرزا غالب کے کلام کی ایک مکمل جلد شائع کی جائے۔ انھوں نے اس کی ترتیب میرے سپرد کی۔ میں نے ان تمام نسخوں کا مطالعہ کر کے یہ "کلیات" مرتب کیا ہے۔ اس میں نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب بجنسہٖ برقرار رکھی گئی ہے اور جو غزلیں، قطعات، نظمیں اور رباعیات نسخۂ حمیدیہ میں موجود نہیں تھیں۔ انھیں دوسرے نسخوں سے نقل کر کے آخر میں بطورِ ضمیمہ شامل کر دیا گیا ہے۔ اور بعض اشعار کی "شانِ نزول" اور دوسری معلومات حواشی کے طور پر درج کر دی گئی ہیں۔ اب کہا جا سکتا ہے کہ یہ دیوان غالب کا مکمل ترین نسخہ ہے۔ اسی لیے اسے کلیاتِ غالب (اردو) کا نام دیا گیا ہے۔

لاہور
۶ر اکتوبر ۱۹۶۳ء

اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی

مقدمۂ دیوانِ غالب

یوسف جمال انصاری

(۱)

غالبؔ اپنے دور کے پس منظر میں

غالبؔ ایک مہم جو ترک خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے دادا سمرقند سے دہلی آئے تو ایک روایت کے مطابق اُن دنوں محمد شاہ[1] رنگیلے کا دور دورہ تھا۔ سلطنتِ مغلیہ کا انحطاط اس حد کو پہنچ گیا تھا کہ مغلوں کی فوجی طاقت برائے نام رہ گئی تھی۔ ان دنوں معاشرے کا طرز ایسا تھا کہ شاہی دربار کے آداب امرا و عمائدین کو پوری طرح متأثر کرتے تھے۔ جب بادشاہ ہی عیش و عشرت میں محو ہو تو حکام اور رؤسا کا اپنے فرائض سے غافل ہو کر ناچ رنگ میں مست ہونا آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ ان حالات سے فائدہ اُٹھا کر پائے تخت سے دور دراز صوبوں میں سازشوں اور بغاوتوں کا ایک جال بچھ گیا تھا۔ محمد شاہ رنگیلے کی تخت نشینی سے لے کر بہادر شاہ ظفرؔ کی شکست اور جلا وطنی تک سترفاگردی کا ایک ایسا دور آیا جو اسلامی ہند کی تاریخ میں کبھی نہ آیا تھا۔ مرزا غالب کا خاندان اس زمانے

---

[1] ذکرِ غالب از مالک رام دوسرا ایڈیشن صفحہ ۱۴ (غالبؔ نے شاہ عالم کے دور میں اپنے دادا کا واردِ ہند ہونا اور شاہی متوسلین میں شامل ہونا بیان کیا ہے) میں نے صدقِ ثقاہت کی بنا پر مالک رام کے بیان کو پسند کیا ہے۔

میں ہندوستان پہنچا۔ جب یہاں اسلامی حکومت کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ اس کا ماتم غالب نے خود بھی کیا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ افسوس نہ کوئی ممدوح ایسا ہے کہ جس کی شان میں قصیدہ لکھا جائے اور نہ کوئی معشوق ایسا ہے کہ جس کے لیے غزل کہی جائے۔ انوری نے گویا غالب کی ترجمانی کی ہے

اے دریغا نیست ممدوحے سزاوارِ مدیح

اے دریغا نیست معشوقے سزاوارِ غزل

محمد شاہ رنگیلے کے بعد سلطنتِ مغلیہ کا شیرازہ تیزی کے ساتھ بکھرنے لگا۔ غالب کا خاندان ہندوستان میں کوئی مضبوط جڑیں نہیں رکھتا تھا۔ یہ تو ایک نووارد ترک خاندان تھا اور مہم جوئی اس کا خاصہ تھا۔ اپنی تلوار پہ بھروسہ کر کے مرزا قوقان بیگ سمرقند سے دہلی آئے اور شاہ عالم[1] کے عہد میں ان کو جاگیر اور منصب ملا۔ مرزا کے باپ اور چچا سپاہی تھے اور ان کی وفاداری وقت کے ساتھ بدلتی رہی۔ جہاں کہیں ملازمت ملی اور عزت و توقیر ہوئی۔ وہیں اپنی تلوار کے جوہر دکھانے لگے۔ کسی عبوری دور میں خاص کر جب مضبوط مرکز نہ ہو تو وفاداریاں یوں ہی بدلتی رہتی ہیں۔ چنانچہ مرزا یاس یگانہ چنگیزی کا احتجاج کہ غالب وطن پرست نہیں تھے۔ اور بین السطور میں یہ اشارہ کہ غالب غدار تھے۔ غیر منطقی ہے اور ناانصافی پر مبنی۔ یگانہ نے ایک رباعی میں مرزا پر یوں پھبتی کسی ہے :

شہزادے پڑے فرنگیوں کے پالے	مرزا کے گلے میں موتیوں کے مالے
واللہ گریبان میں منہ ڈال کے دیکھ	غالب کو وطن پرست کہنے والے[2]

ہندوستان کی تاریخ میں یہ دور ایک بحرانی دور تھا۔ خود مرکزی حکومت میں مغل شہزادے ایک ڈرامائی انداز میں تخت پر قبضہ کرتے تھے اور امرا کی سازشوں کا شکار ہو کر لقمۂ اجل بن جاتے تھے۔ امرا کا ایک گروہ جسے کل عزت ملی تھی۔ آج منتشر ہو کر اس گروہ میں شامل ہو جاتا جس کے قبضے میں نیا حکمران ہو۔ یہی سلسلہ جاری تھا۔ پھر ملک کے دور افتادہ صوبوں میں تو عجب

---

[1] احوالِ غالب (جون ۱۹۵۳ء) ص ۲۷ ہو سکتا ہے کہ واقعاتی صداقت کے لحاظ سے یہی درست ہو۔

[2] کالوں کے ہاتھوں گوروں کے مارے جانے پر غالب نے آٹھ آٹھ آنسو بہائے ہیں، مغلوں کی سلطنت کا چراغ گل ہونے پر خاموشی برتی ہے یہ سب سچ۔ مگر اہلِ ہند کی تباہی کا ماتم بین السطور بھی کیا ہے اندھُس کر بھی۔

افراتفری کا عالم تھا۔ دکن کے بڑے حصے میں مرہٹوں نے لوٹ مچا رکھی تھی۔ مرہٹوں کی رَو بڑھتے بڑھتے آگرے تک آ گئی تھی۔ اس میں کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ مرزا غالبؔ کے چچا نصراللہ خان مرہٹوں کی طرف سے آگرے کے حاکم تھے اور پھر جب فتح و کامرانی نے انگریزوں کے قدم چومے۔ اور مرہٹوں کے پاؤں اکھڑے تو یہی نصراللہ خاں انگریزوں سے مفاہمت کر کے انگریزی حکومت کے مقرب ٹھہرے۔ انھوں نے آگرہ انگریزوں کے حوالے کر دیا اور اس کے عوض سرکارِ انگریزی سے انعام و اکرام پایا۔ مرزا غالبؔ کے باپ نے بھی کئی جگہ ملازمت اختیار کی۔ کبھی نظام حیدرآباد اور کبھی والیٔ الور کے درباروں سے منسلک رہے۔ اور ریاست الور میں ایک باغی سردار کے خلاف لڑتے ہوئے مارے گئے۔ پھر غالبؔ سے یہ امید رکھنا کہ وہ انتزاعِ سلطنتِ مغلیہ کے دور میں انگریزی حکام سے کوئی مفاہمت نہ کریں گے، حقیقت پسندی کے خلاف ہوگا اور غالبؔ تو بڑے زمانہ شناس تھے [۱]۔

مرہٹوں کی دست بُرد سے دہلی بھی نہ بچ سکی۔ آگرے اور دہلی کے درمیان مرہٹے، جاٹ روہیلے اور ایسے ہی جانے کتنے منظم گروہ تاخت و تاراج میں مصروف تھے۔ روہیلے سردار غلام قادر کے ہاتھوں شاہ عالم پر جو کچھ بیتی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغل حکمران کس حد تک بے دست و پا ہو چکے تھے۔ گوالیار کے راجہ مہادجی سندھیا نے اپنی فوجی طاقت اتنی بڑھالی کہ شاہ عالم کو مجبور ہو کر اسے اپنا معتمد قرار دینا پڑا۔ ادھر انگریزوں کا ریلا بڑھتے بڑھتے دہلی تک آ پہنچا تھا۔ سکھوں کا تسلط پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد پنجاب کشمیر اور صوبہ سرحد پر ہو گیا تھا۔ اودھ میں نواب وزیر اب بادشاہ کا لقب اختیار کر چکے تھے اور ایک آزادانہ حیثیت کے مالک تھے۔ غرضکہ ایک عجب انتشار کا عالم تھا۔ اس غیر یقینی صورتِ حال میں مرزا غالبؔ کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ مغل دربار کے علاوہ اگر انھیں

---

[۱] داغ کے والد نواب شمس الدین احمد خاں جن کو فریزر کے قتل کے الزام میں پھانسی ہوئی، محب وطن اور با حمیت کہائے اور ہیرو قرار پائے مگر انگریزوں سے ان کی بھی رسم و راہ تھی۔ فریزر سے عداوت تھی اور فرانسس ہاکنس سے یارانہ تھا جو فریزر سے پہلے دلّی کا ریذیڈنٹ تھا۔

کوئی سہارا تھا تو انگریزوں کا تھا۔ انگریزوں کی طاقت روز بروز بڑھتی جارہی تھی اور مستحکم ہوتی جارہی تھی۔ نصراللہ خان کی موت کے بعد انگریز سرکار نے نصراللہ خان کے خاندان والوں کے لیے جو وظیفہ مقرر کیا تھا اس میں مرزا غالب کا حصہ بھی تھا۔ تمام عمر مرزا کی گذر بسر اسی[1] رقم پر ہوئی۔ یوں کہنے کو غالب کا تعلق آخر عمر میں بہادر شاہ ظفر کے دربار سے بہت قریبی ہوگیا تھا لیکن یہ بات ۱۸۵۰ء کے بعد کی ہے۔ ہم اس موقع پر اُس مقدمے کا ذکر کرنا نہیں چاہتے۔ جو غالب کی پنشن کا مقدمہ کہلاتا ہے۔ یہ اشارہ کر دینا کافی ہے کہ ۱۸۲۱ء کے بعد کئی برس انھوں نے سر توڑ کوشش کی کہ انگریزوں کی طرف سے منظور شدہ رقم انھیں ان کے حق کے مطابق ملے اور اس سلسلے میں وہ کلکتہ تک گئے لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ یہاں ہماری مراد یہ ہے کہ حب الوطنی کا جو تصور آج قائم ہے۔ وہ مرزا غالب کے زمانے میں نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو اس کا اطلاق قدیم ہندوستانی خاندانوں پر تو ہو سکتا تھا۔ لیکن دو پشت پہلے سمرقند سے آئے ہوئے کسی طالع آزما خاندان کے افراد پر قطعاً نہیں ہو سکتا۔

ایک طرف تو غالب سمرقندی تُرک تھے اور دوسری جانب انھیں ایرانی الاصل بھی ہونے کا دعویٰ بھی تھا۔ ایرانی ہونے کا دعویٰ نہ ہوتا تو وہ اپنی فارسی پر ناز کیوں کر کرسکتے سمرقندی ترک نہ ہوتے تو یہ کیونکر کہتے کہ ؎

لیکیم از جماعت اتراک   در تمامے ز ماہ دہ چندیم

اور ع   غالب از خاک پاک تورانیم

اور ع   شیعی کیونکر ہو ماورالنہری

لیکن غالب کے خاندانی حالات پر نظر ڈالی جائے تو یہ دونوں دعوے برحق نظر آئیں گے۔ "ترک افراسیابی" ہونے کی بنا پر وہ اپنا سلسلۂ نسب جمشید و فریدوں سے ملاتے ہیں[2] ایران میں بادشاہت کا تصور جتنا قدیم ہے۔ دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں

---

[1] یعنی ساڑھے باسٹھ روپے ماہانہ سرکار انگریزی سے ملتے تھے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں یہ سلسلہ بند ہوگیا اور کئی برس بند رہا۔ یہ دیکھ کر نواب ضیاءالدین نے امراؤ بیگم کا وظیفہ پچاس روپے تاحیات مقرر کر دیا۔

[2] "پدرم سلطان بود" کا تصور کبھی فخر و مباہات کا روپ بھرتا ہے کبھی حسرت و مایوسی بن جاتا ہے ؎

ہے ناز مفلساں زر از دست رفتہ پر   ہوں گل فروش شوخیٔ داغ کہن ہنوز

فلک سے ہم کو عیش رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے   متاع بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن کا

یہی وجہ ہے کہ آج بھی ایرانی شاہِ ایران کے دلدادہ ہیں۔ اور اس جمہوری دَور میں بھی ایرانیوں کی شاہ پرستی جوں کی توں قائم ہے۔ مرزا غالبؔ کے مورثِ اعلیٰ کو ایرانی سلطنت کا وہ حصّہ وراثت میں ملا۔ جو توران کہلاتا ہے۔ شاہنامۂ فردوسی میں رستم و افراسیاب کی جنگوں کا حال بیان کیا گیا ہے۔ افراسیاب وہ ایرانی الاصل بادشاہ تھا۔ جسے وراثتاً توران کا ملک ہاتھ آیا تھا اور جو ایران پر اپنا حق منوانا چاہتا تھا۔ صدیوں اس علاقے میں رہنے کی وجہ سے مرزا غالبؔ کے مورث اپنے کو ترکانِ سلجوقی کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ غالبؔ کا خاندان حکومت سے بے دخل ہوا۔ اور ان کے پاس نام و نشاں کے لیے تھوڑی بہت زمین رہ گئی۔ لیکن رگوں میں وہی سلجوقی خون تھا۔ یہاں تک کہ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں۔ قوقان بیگ سمرقند سے ترکِ وطن کر کے دہلی آ گیا۔ دو پشت تک تلوار کے سہارے گزر اوقات کرنے کے بعد آخر یہ خاندان بھی دوسرے رئیس خاندانوں کی طرح ایک عیش پسند خاندان ہو کر رہ گیا۔ پھر بھی مرزا کس طنطنے کے ساتھ کہتے ہیں ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

غالبؔ کو اپنے نسب پر بے حد ناز تھا۔ ان کا رہن سہن امیرزادوں کا سا تھا۔ ان کی پرورش بھی ایسے ہی ماحول میں ہوئی تھی۔ ان دنوں قدیم شریف خاندانوں میں سپہ گری اور علوم متداولہ دونوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تب کوئی شخص اپنے کو ایک باعزّت انسان سمجھتا تھا۔ وہ دَور ہندوستان کی تاریخ میں جاگیردارانہ دَور تھا۔ اکثر شریف خاندان وہ تھے۔ جنھیں جاگیریں ملی ہوئی تھیں۔ جنگ پیش آنے کی صورت میں یہ لوگ اپنی جاگیر اور منصب کے مطابق ایک خاص تعداد اپنے ملازم فوجیوں کی بادشاہ کے حضور پیش کرتے تھے۔ غالبؔ کے دادا جب شاہِ عالم کے دربار سے منسلک ہوئے۔ تو انھیں منصب اور جاگیر عطا ہوئی اور پچاس سوار حاضر کرنا ان کا فرض قرار پایا۔ یعنی ان کی جائداد اتنی تھی کہ پچاس سپاہی اور پچاس گھوڑے مہیا کرنا جائداد کی آمدنی سے ان کے لیے فرض تھا۔ غرضکہ ایک ایرانی الاصل ترک سلجوقی جس کا تعلق ہندوستان آکر بھی دربارِ سلطانی ہی سے رہا۔ اگر ناز کہ سکتا تھا تو یہی کہ اس کی رگوں میں بادشاہوں کا

خون ہے اور اس کے آبا سو پشت سے تلوار کے جوہر دکھاتے آئے ہیں۔ ان حالات میں ہمیں حیرت نہ ہونی چاہیے کہ مرزا غالب اپنے خطوط میں بار بار خلعت و منصب کا ذکر کرتے ہیں غالب کو اس پر بھی ناز تھا کہ آلِ تیمور کے آخری فرمانروا بہادر شاہ ظفر نے انھیں خطابات سے نوازا تھا اور تنخواہ مقرر کی تھی یعنی وقائع نگاری کے عوض میں پچاس روپے ماہانہ جولائی ۱۸۵۰ء سے مئی ۱۸۵۷ء یعنی "غدر" شروع ہونے تک البتہ ۱۸۵۴ء میں استاد ذوق کے مرنے پر ظفر نے غالب کی شاگردی اختیار کی ولی عہد مرزا فخرو غالب کے شاگرد ہوئے تو چار سو روپیہ سالانہ ان کی طرف سے ملنے لگے۔ یہ بات بھی ۱۸۵۴ء ہی کی ہے۔ وقائع نگار مقرر ہونے پر پہلی غزل جو کہی اس کا مقطع ہے ؎

غالب وظیفہ خوار ہو دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں[1]

ویسے غالب کوئی نادان نہ تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مغل بادشاہ کی حیثیت شاہِ شطرنج سے زیادہ نہیں رہ گئی ہے اور اس کی حکومت دہلی کے قلعہ معلیٰ تک محدود ہے لیکن غالب کے نسبی فخر کو بہادر شاہ ظفر کے دیے ہوئے خطابات[2] سے ضرور تسکین ہوگئی ہوگی اور پھر جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہوا تو ایک مدت تک مرزا اس کوشش میں لگے رہے کہ انگریزی حکومت سے انھیں خطاب و منصب عطا ہو۔ آخر کار ان کی کوشش بار آور ہوئی۔ اور انھیں دربار میں کرسی ملی اور خلعت عطا ہوا۔ اس کا ذکر غالب نے اپنے خطوط میں بڑے فخر کے ساتھ کیا ہے۔ اس میں غالب کا کچھ قصور نہیں بظاہر ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ غالب خطاب و منصب کے بھوکے تھے۔ دراصل وہ دور ہی ایسا تھا جس میں ایک مفلس اور مقروض جاگیر دار کو ایک متمول تاجر پر ترجیح دی جاتی تھی اور سرمایہ داری کا دور تو بہر حال آرہا تھا۔ لیکن عوام کی حاکمیت کا تصور کسی کے خیال و خواب میں بھی نہ تھا۔ غالب کا تعلق جس معاشرے

---

[1] اس شعر میں اور "آپ کا بندہ اور پھروں ننگا۔ آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار" والے قطعے میں حسنِ طلب ہے، مگر بین السطور طنز یہ لہجہ جھلکتا ہے کہ آپ کا ملازم ہوں لیکن آپ کی شہنشاہی کی حقیقت سے بھی واقف ہوں۔

[2] "نجم الدولہ دبیر الملک نظامِ جنگ"۔ شیخ ابراہیم ذوق کی موجودگی میں اُستادِ شاہ تو ہو نہیں سکتے تھے۔ ذوق "ملک الشعراء" تھے اس لیے غالب کو "دبیر الملک" ہونے پر قناعت کرنی پڑی۔

سے تھا۔ اس کی کچھ مسلّمہ اقدار تھیں۔ یہ اقدار غالبؔ کی طبیعت سے پوری طرح ہم آہنگ تھی۔ اس لیے کہ غالبؔ کا خاندان خود بھی ایک جاگیردار خاندان تھا۔ سرداری کی بوان کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ اور درباداری ان کی شرائطِ ملازمت میں شامل تھی۔ افسوس یہ ہے کہ غالبؔ ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جسے ہندوستانی تاریخ کا ایک موڑ قرار دیا جاتا ہے۔ بار بار ماتم کرتے ہیں کہ کسی ایسے دَور میں نہ پیدا ہوئے۔ جب شہنشاہیت اپنے جاہ و جلال پر تھی۔ فردوسی کے دور میں پیدا ہوئے ہوتے تو ان کی کچھ قدر بھی ہوتی۔ یا پھر اکبر کے زمانے میں ہندوستان آئے ہوتے۔ جس طرح عرفیؔ آیا تھا۔ ان کو زمانہ بھی نصیب ہوا تو بہادر شاہ ظفرؔ کا۔ شاہی خزانے سے تنخواہ باقاعدگی کے ساتھ نہ ملتی تھی۔ چنانچہ ایک قطعہ عرضِ حال کا بادشاہ کی خدمت میں گزرانا جو یوں شروع ہوتا ہے ؎

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ   اے جہاندارِ آفتاب آثار

آگے چل کر یوں شکایت کرتے ہیں ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا   آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ   تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یہ عرضِ حال کا قطعہ اس لیے گزرانا کہ قلعے کے ملازمین کو تنخواہ سال میں دو بار، ششماہی ملتی تھی اور غالبؔ اس سے تنگ تھے۔ اسی لیے جب سلطنتِ مغلیہ کا چراغ گُل ہوا تو غالبؔ نے آسانی کے ساتھ اپنی وفاداری کو انگریزی حکومت کے ساتھ منسلک کر لیا۔ اس سلسلے میں بعض دلچسپ لطائف ہیں۔ دیوانِ غالبؔ (اُردو) میں ایسے قطعات اور قصائد موجود ہیں۔ جن کا تعلق بہادر شاہ ظفرؔ سے ہے۔ فارسی کلیات میں اس قسم کے بہت سے قصائد کو انگریزی عمل داری قائم ہونے کے بعد انگریز عمائدین سے منسوب کر دیا گیا۔ اور غالبؔ کو ذرا بھی ضمیر کی خلش محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے نزدیک وہ قصیدہ جو اصلاً "مغل بادشاہ" کے نام تھا۔ اگر بتقاضائے مصلحتِ وقت

لہ تفصیل کے لیے دیکھیے سالنامہ "نقوش" لاہور ۱۹۶۳ء میں مالک رام کا مضمون

........انگریز کمشنر کے نام سے منسوب ہو تو اس میں کوئی عجیب بات نہ تھی، وقت اور حالات کا تقاضا تھا۔ شاعری مرزا غالب کے لیے ایک کھیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان کے نزدیک ان کی شخصیت ان کی شاعری سے کہیں زیادہ بلند اور ہمہ گیر تھی اور پھر شاعری میں بھی وہ صنفِ خاص جسے قصیدہ کہا جاتا ہے۔ وہ تو محض لفظوں کا کھیل تھا اور مقصد برآری کا ایک ذریعہ ورنہ وہ اپنے کو کسی مغل بادشاہ یا کسی انگریزی اہل کار سے کہیں زیادہ وقیع خیال کرتے تھے اور زمانے کا فیصلہ بھی یہی ہے

عربی اور فارسی شاعری میں قصیدہ ہی ایک ایسی صنف ہے جس میں شاعر کو اپنے کمالات کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔ فارسی قصائد خواہ وہ شعرائے ایران کی تصنیف ہوں۔ خواہ فارسی گویانِ ہند کی عموماً والیانِ ملک اور رئیسانِ عالی مرتبت کی شان میں ہیں۔ لہٰذا ان میں درباداری کا رنگ نمایاں ہے۔ اس کے باوجود فارسی قصیدہ بھی عربی قصیدے کی طرح دراصل شاعر ہی کے کمالاتِ فن کے اظہار کا ایک مؤثر طریقہ ہے۔ ممدوح خواہ بہادر شاہ ظفر ہی کیوں نہ ہو۔ غالب کو تو یہ دکھانا مقصود تھا کہ وہ قصیدہ نگار کس درجے کے تھے۔ نجی زندگی میں غالب ایک خوددار وغیور انسان تھے اور اپنے قصائد سے قطع نظر وہ کسی بڑے سے بڑے شخص کی مدح کرنا بھی اپنے لیے ننگ سمجھتے تھے لیکن قصیدے کی صنف ہی ایسی ہے کہ اس کے لیے کسی ممدوح کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے غالب نے بڑی آسانی کے ساتھ اور بغیر کسی تاسف کے وہی قصائد جو انھوں نے دربارِ مغلیہ میں پیش کرنے کی خاطر لکھے تھے۔ انگریز حکام کو نذر کر دیئے۔ قصیدہ وہی رہا۔ صرف ممدوح کا نام بدل گیا۔ یہاں غالب کے خلوص کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہوتا۔ غالب کی نجی زندگی میں خودداری کی جھلک دیکھنی ہو تو متعدد واقعات ہماری نظر کے سامنے آجائیں گے۔ ایک مشہور واقعہ وہ ہے۔ جب غالب اپنے مقدمے کے سلسلے میں کلکتہ جاتے ہوئے تقریباً ایک سال لکھنؤ میں ٹھہرے تو وزیر اعظم آغا میر نے پیغام بھیجا کہ وہ غالب کو نواب نصیر الدین حیدر (شاہ اودھ) کی خدمت میں لے جانے کے لیے آمادہ ہیں۔ چنانچہ مرزا غالب پر لازم آیا کہ وہ آغا میر سے ملنے جائیں۔ مرزا نے ملاقات کی شرط یہ رکھی کہ وزیر اعظم کھڑے ہو کر ان کا استقبال کریں گے اور پورے ادب آداب کے ساتھ پیش آئیں گے۔ یہ بات سلطنتِ اودھ کے وزیر اعظم کو پسند

نہ آئی۔ چنانچہ غالب کو شاہِ اودھ کے دربار میں باریابی کا موقع نہ مل سکا۔ ظاہر ہے کہ دربارِ اودھ تک رسائی سے غالب کو انواع و اقسام کے فوائد حاصل ہو سکتے تھے[۱] لیکن انھوں نے اپنی وہ شرط کسی قیمت پر واپس نہ لی۔ جو انھوں نے وزیر اعظم سے ملاقات کے سلسلے میں پیش کی تھی۔ ایک اور مشہور واقعہ وہ ہے۔ جب مرزا غالب کا تقرر دہلی کالج میں صرف اس لیے نہ ہو سکا کہ مسٹر ٹامسن سکرٹری گورنمنٹ ہندان کی پیش وائی کے لیے نہ آئے اور غالب نے اس کو اپنی سبکی جانا کہ بغیر پیشوائی کے محض ایک امیدوار ملازمت کی حیثیت میں سکرٹری موصوف کی خدمت میں حاضر ہوں۔ ان دو واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مرزا غالب میں کتنی انانیت تھی۔ عزت کے معاملے میں وہ کسی قسم کی مفاہمت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔

قدرت کی یہ عجب ستم ظریفی تھی کہ مرزا غالب کو ایک ایسا دور نصیب ہوا جب ہندوستان میں اسلامی تہذیب انتہائی زوال کے عالم میں تھی۔ مرزا خود بھی پوتڑوں کے رئیس تھے۔ ان میں وہ تمام خوبیاں اور برائیاں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھیں۔ جن سے درباریوں اور امرائے وقت کی زندگی عبارت تھی۔ بچپن کھیل کود میں گزرا۔ ان دنوں مرزا آگرے[۲] میں مقیم تھے۔ ایک خط میں منشی شو نرائن کو لکھتے ہیں کہ آگرے میں ہماری اتنی املاک تھیں اور اتنی حویلیاں تھیں۔ "ایک کٹڑہ کہ وہ کشمیرن والا کہلاتا تھا۔ اس کٹڑے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔" اس زمانے کے امیرزادے جس قسم کے شوق رکھتے تھے۔ وہ سب مرزا نے پورے کیے۔ ظاہر ہے کہ پتنگ بازی کا دور ۱۸۱۰ء تک ہی رہا ہوگا۔ اسی سال مرزا کی شادی نواب الٰہی بخش معروف کی صاحبزادی

---

[۱] لکھنؤ پہلی دفعہ ۱۸۲۶ء میں کلکتے جاتے ہوئے گئے۔ پھر کلکتے سے واپسی پر ٹھہرے اور اس مرتبہ یعنی ۱۸۲۹ء میں قصیدہ لکھ کر نواب وزیر کی خدمت میں پیش کیا مگر انعام کی رقم بیچ والے ہضم کر گئے۔ ۱۸۵۴ء میں واجد علی شاہ نے پانسو روپے سالانہ مقرر کیے۔ دو برس بعد خود اُن کی نوابی ہی ختم ہو گئی۔

[۲] نصر اللہ بیگ کے مرنے کے بعد غالب کی تربیت مرزا غلام حسین کمیدان کے ہاں نقل ہوئی۔ یہ غالب کے نانا تھے اور آگرے کے رؤسا میں تھے مذہباً اثنا عشری ہوں گے مگر البتہ یہ تحقیق طلب ہے۔

امراؤ بیگم سے ہوگئی۔ اور مرزا غالب جنھیں اپنی سسرال (یعنی رئیسانِ لوہارو) کی طرف سے مرزا نوشہ کا خطاب ملا۔ ۱۸۱۲ء یا ۱۸۱۳ء میں آگرے سے دلّی آگئے اور پھر زندگی بھر دلّی میں ہی رہے اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے۔ سوائے اس کے کہ مقدمے کے سلسلے میں کانپور، لکھنؤ اور بنارس ٹھہرتے ہوئے کلکتے گئے۔ دو مرتبہ سفر رام پور[۱] اس لیے اختیار کیا کہ والیانِ رام پور سے ان کے تعلقات خصوصی نوعیت کے تھے۔ ایک دفعہ باندہ اور بھوپال بھی گئے ؎

پیرانہ سال غالبِ میکش کرے گا کیا

بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

ممکن ہے کہ دو ایک بار لوہارو جانا ہوا ہو۔ شادی کے وقت مرزا غالب کی عمر تیرہ سال کی تھی اور امراؤ بیگم کی گیارہ سال کی۔ دولت کی فراوانی تھی اور دہلی میں امیرانہ ٹھاٹھ کا رہن سہن۔ جلد ہی تماش بینی میں پڑ گئے۔ اور بازارِ حسن میں آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ساتھ ہی شراب کا چسکا بھی پڑ گیا۔ حسن پرستی کا زور شور تو موسمِ شباب کا پابند ہے۔ لیکن شراب منہ کو لگ جائے تو کسی طرح نہیں چھوٹتی۔ میرزا غالب آخر تک شراب نوشی ترک نہ کر سکے۔ یہ سارے شوق تو تھے ہی۔ چوسر اور گنجفہ کھیلنے کی لت بھی پڑ گئی۔ ان دنوں دہلی کے امیرزادے شراب نوشی اور قمار بازی کے بڑے دلدادہ تھے۔ مرزا کسی سے پیچھے کیوں رہتے۔ قمار بازی میں وہ نام پیدا کیا کہ پشتنی رئیس زادوں کے علاوہ سیٹھ ساہوکار بھی جوا کھیلنے مرزا کے مکان پر آجاتے۔ اس سلسلے میں ایک ایسا عبرت انگیز واقعہ مئی ۱۸۴۷ء میں قضائے الٰہی سے نمودار ہوا کہ غالب کو اپنی شوقینی کی قیمت عزتِ نفس کی قربانی دے کر ادا کرنی پڑی۔ کوتوالِ شہر جو مرزا کے اوصافِ حمیدہ سے واقف نہ تھا۔ ان کے درپے ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ جس طرح بھی ہو۔ غالب کے مکان سے قمار بازی کا سلسلہ ختم کیا جائے۔ اس نے سپاہیوں کو کہاروں کا لباس پہنا کر اور خود زنانے کپڑے پہن کر مرزا کا دروازہ جا کھٹکھٹایا۔ مرزا تو ازل کے حسن پرست تھے۔ بلا توقف دروازہ کھول دیا

---

[۱] پہلی بار نواب یوسف علی خاں ناظم کی طلبی پر ۱۸۶۰ء میں گئے۔ ناظم بچپن میں غالب سے فارسی پڑھتے تھے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے کچھ قبل غالب ناظم کے کلام کی اصلاح کرنے لگے۔ تاحیات سَو روپے غالب کے مقرر ہوئے۔ رامپور رہیں تو سَو کے بجائے دو سَو۔ دوبارہ کلب علی خاں کی تخت نشینی پر ۱۸۶۵ء میں گئے اور بارہ سو بطور انعام پائے

اس وقت مرزا کی نشست گاہ میں جوئے کی بازی لگی ہوئی تھی۔ چنانچہ حراست میں لے لیے گئے۔ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے اور چھ ماہ قید با مشقت اور دو سو روپے جرمانے کی سزا ملی لیکن آخر کار سول سرجن کی سفارش پر قید کی آدھی میعاد کاٹنے کے بعد رہائی پائی[1]۔ یہاں غالب کی طبیعت کا دو رُخا پن ملاحظہ ہو۔ ایک طرف تو ندامت کا یہ عالم کہ اپنے ایک فارسی کے خط میں لکھتے ہیں۔ "میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو خود کعبہ آزادوں کی جائے پناہ اور آستانہ رحمۃ اللعالمین دلدادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھیے وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے جو اس گزری ہوئی قید سے زیادہ جانفرسا ہے نجات پاؤں اور بغیر اس کے کہ کوئی منزلِ مقصود قرار دوں سر بصحرا نکل جاؤں۔" (یادگارِ غالب از حالی)

دوسری طرف طبیعت کی شوخی کا یہ حال کہ جب کسی نے قید سے چھوٹنے کی مبارک باد دی۔ تو بولے کون۔۔۔۔ قید سے چھوٹا ہے۔ "پہلے گورے کی قید میں تھا اب کالے کی قید میں ہوں" یہاں لطیفہ یہ ہے کہ رہائی کے بعد مرزا جن صاحب کے ہاں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان کا نام کالے صاحب تھا اور جس حکومت نے انھیں قید خانے میں بند کیا تھا۔ وہ گورے صاحبوں کی حکومت تھی مستزاد اس پر غالب کی انانیت تھی۔ قید خانے میں یوں گئے جیسے کوئی حاکمِ وقت اپنے پائے تخت میں نزولِ اجلال کرے۔ مرزا نے قید میں ایک ترکیب بند زندانیہ لکھا جو بقولِ حالی مرزا کی عمدہ ترین عالیہ نظموں میں سے ہے۔ یہ ترکیب بند سات بند کا ہے۔ ایک بند کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔ ان کا لہجہ المیہ نہیں۔ رجزیہ ہے ؎

پاسباناں بہم آئید کہ من می آیم　　درِ زنداں بکشائید کہ من می آیم
ہر کہ دیدے بدرِ خویش سپاسم گفتے　　خیر مقدم بسرائید کہ من می آیم
رہروِ جادۂ تسلیم درشتی نکنند　　سخت گیرندہ چرائید کہ من می آیم
ہاں عزیزاں کہ دریں کلبہ اقامت دارید　　بختِ خود را بستائید کہ من می آیم
جادہ نشناسم و زانبوہِ شماری ترسم　　راہم از دور نمائید کہ من می آیم

[1] دہلی کی آخری سانس (خواجہ حسن نظامی) اور ذکرِ غالب (مالک رام)

تا بدروازۂ زنداں پئے آوردنِ من قدمے رنجہ نمائید کہ من می آیم
چوں سخن سنجی و فرزانگی آئینِ من است
بہرہ از من بربائید کہ من می آیم

رندِ شاہد باز

دہلی کے رئیسانہ ماحول میں ایک نوعمر امیرزادے کا کردار جس طرح ارتقا پذیر ہونا چاہیے تھا۔ مرزا غالبؔ کا کردار اُسی طرح ارتقا پذیر ہوا۔ حافظ نے تو کہا تھا ع

رندی و ہوسناکی در عہدِ شباب اولیٰ

لیکن غالبؔ کی رگ و پے میں گرم خون تھا۔ غالبؔ کوئی ہندی الاصل امیرزادے نہ تھے۔ وہ ترک بچے تھے۔ جب رزم آرائی کا کوئی موقع نہ نکلا۔ تو انھوں نے بزم آرائی میں اپنے جوہر دکھائے۔ مرزا اوائل عمر ہی سے شراب و شاہد کے رسیا تھے۔ اور یہ کیفیت اس وقت تک قائم رہی۔ جب تک ان کے قویٰ مضمحل نہ ہو گئے۔ کثرت شراب نوشی نے احتراقِ دم میں مبتلا کر دیا۔ اور ان کو مختلف عوارضِ جسمانی لاحق ہو گئے۔ اپنی بیماریوں کا حال انھوں نے اپنے خطوط میں بڑے درد کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہمارے پاس یہ کہنے کے لیے کوئی طبی شہادت تو نہیں ہے۔ لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ سوداویت کے غلبے کا نتیجہ یہ نکلا کہ اُن کے بچے زندہ نہ رہے۔ کئی اولادیں ہوئیں۔ مگر ہر بچہ سال سوا سال کی عمر میں داغِ مفارقت دے گیا۔ یہ بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کوچہ حسن میں ان کا آنا جانا مختلف عوارض کا سبب بنا ہو۔ بعض خطوط میں انھوں نے اپنے جسم پر پھوڑے پھنسیوں کی کثرت کا ذکر کیا ہے۔ بعض اشعار میں اس قسم کے مضامین بھی نظم ہو گئے ہیں ؎

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہمارے زخم کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

ا؎ ہاں غالبؔ خلوت نشیں ہیے چناں عیشے چنیں — جاسوسِ سلطاں در کمیں، مطلوبِ سلطاں در بغل
ندیم و مطرب و ساقی نہ انجمن رانیم — نگارہ بارزنِ کار داں بگردانیم

یہ درست ہے کہ مرہم و زخم و رفو کا تذکرہ غزل کے رسمی مضامین میں سے ہے۔ لہٰذا کسی غزل گو کے لیے ضروری نہیں کہ وہ اس تجربے سے گزرا ہو۔ لیکن جب خطوط کی داخلی شہادت بھی فراہم ہو جائے تو قیاس کرنا پڑتا ہے کہ شاعر نے حقیقتِ حال بیان کی ہے اور یہ محض لفاظی اور خیال آرائی نہیں ہے۔

دربارداری اور کرسی نشینی کی خواہش

جاگیرداری نظام میں کسی فرد کی بلند ترین خواہش یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی رسائی شاہی دربار تک ہو جائے اور دربار میں اسے اونچا مقام ملے اور کرسی دی جائے۔ غالب کے دور میں ہر امیر زادے کی یہی خواہش تھی۔ ہر چند کہ بہادر شاہ ظفر کا دربار کوئی اکبر یا شاہ جہان کا دربار نہ تھا۔ پھر بھی ادب آداب وہی تھے۔ مغل حکومت کو گزشتہ سو سوا سو برس سے گھن لگ چکا تھا لیکن اوپری خول کی ٹیپ ٹاپ وہی تھی۔ چنانچہ جب مرزا غالب کو دربار شاہی میں جگہ ملی۔ تو ان کی ایک بہت بڑی خواہش کی تسکین ہوئی۔ نواب اسداللہ خاں غالب کہلائے اور نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ خطابات پائے۔

انگریز حکام سے مرزا غالب کے خاندانی تعلقات دو پشت سے تھے۔ اوائل شباب ہی سے غالب نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر صاحبان کے درباروں میں جگہ پائی۔ اور جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ برپا ہوا تو مرزا کو نقد و جنس کی بربادی عزیزوں دوستوں اور شرفا کے قتلِ عام کا صدمہ اتنا نہ تھا، جتنا اس بات کا تھا کہ ان کا دربار موقوف ہو گیا۔ ایک مدت تک وہ انگریز حکام کو یقین دلاتے رہے کہ وہ تو وفادارِ سرکارِ برطانیہ ہیں۔ دربار میں انھیں کرسی ملے اور معزز مقام پر ملے۔ آخر کار ان کی مرادِ دلی بر آئی۔ اور ان کا دربار کھل گیا۔ پنشن کا معاملہ جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے تیس سال پہلے سے چل رہا تھا۔ غالب کی مرضی کے مطابق طے نہ ہو سکا۔ لیکن اس عرصے میں انھوں نے انگریز حکام کی مدح میں بیسیوں قصائد لکھے۔ یہاں تک کہ قیصرۂ ہند ملکہ وکٹوریہ کو بھی قصائد ارسال کیے۔ اور ان کے صلے میں "کوئن پوئٹ" (Queen Poet) کے خطاب کے طلبگار ہوئے۔ یہ ۱۸۵۵-۵۶ء کا ذکر ہے۔ غرض کہ درباداری میں مرزا غالب کامل تھے۔ اور

کیوں نہ ہوتا۔ ان کا تعلق رؤسائے ہم عصر سے بہت قریبی تھا۔خاندانی اعتبار سے تو وہ امیرزادے تھے ہی، شادی نوابان لوہارو کے خاندان میں ہوئی۔ بہادر شاہ ظفر کے علاوہ انھوں نے اودھ کے بادشاہوں اور رام پور کے نوابوں کی خدمت میں بھی قصائد نذر کیے تھے۔ قصیدے کی روایت کا اصل تعلق درباداری سے ہے۔ ان کے ہم عصروں میں ایک مومن ایسے ضرور تھے[1] جنھوں نے ایک آدھ قصیدے کے علاوہ اگر قصائد لکھے تو منقبت میں۔ لیکن ذوق جو مدت العمر شاعرِ دربار رہے قصیدہ نگاری میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ غرض کہ جس ماحول میں غالب نے گزراوقات کی وہ درباداری کا ماحول تھا مگر بدلتے ہوئے زمانے کے نئے تقاضوں سے بھی پوری طرح آگاہ تھے۔ "آئینِ اکبری" کی تقریظ سے یہ پوری طرح ثابت ہے۔ کلکتے کے سفر نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اور آنے والے مغربی سرمایہ داری کے دور کی جھلک دکھادی تھی۔

سطورِ بالا میں غالب کے ماحول کی عکاسی کی گئی ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ ماحول کیسا تھا جس کی پیداوار غالب تھے۔ کردار اور ماحول میں ایک انتہائی قریبی ربط ہے کوئی کردار اپنے ماحول سے قطعی طور پر مختلف نہیں ہوسکتا۔ شخصیت کی ترکیب میں ماحول اور وراثت ایک اہم حیثیت رکھتے ہیں۔ شخصیت کے اجزائے ترکیبی تین ہیں۔ اوّل وراثت، دوم ماحول اور سوم ایک نامعلوم اور پراسرار عنصر جسے جینئس (Genius) کہتے ہیں۔ ہم نے غالب کے ماحول کا جائزہ لیتے وقت یہ خیال بھی رکھا ہے کہ ان کے خاندانی حالات سے بحث کی جائے۔ اور اس طرح وراثت کا جائزہ بھی لیا ہے۔

(۲)

غالب کی شخصیت کا اثر ان کے فن پر

جب ہم ولی دکنی کے وقت سے اپنے دور تک نظر دوڑاتے ہیں۔ تو بے شمار شاعرانہ شخصیتیں ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ ان کا تقابلی مطالعہ کرنے سے اس نتیجے پر پہنچنا چنداں

---

[1] ایک قصیدہ راجہ پٹیالہ کے بھائی کی شان میں اور ایک والیٔ ٹونک کی شان میں۔ والیٔ ٹونک سے شدتِ مذہبی تھی۔ مومن کی طرح وہ بھی وہابی تھے اور شاہ عبدالعزیز کے معتقد تھے۔

دشوار نہیں کہ غالب کی سی پہلو دار شخصیت اُردو شاعری کے آغاز سے آج تک پیدا نہیں ہوئی۔ غالب کی شخصیت ہمہ گیری اور گہرائی دونوں کے اعتبار سے اُردو شعرا میں منفرد ہے۔

انگریز شعرا میں ایسی پہلو دار شخصیت اگر کسی کی تھی تو شیکسپیئر کی۔ یہاں دشواری یہ ہے کہ کھُل کر غالب اور شیکسپیئر کا موازنہ کرنا بھی غیر ممکن ہے۔ اقبال نے شیکسپیئر کو یوں خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

چشمِ عالم سے تو ہستی رہی مستور تری
اور عالم کو تری آنکھ نے عریاں دیکھا

بارہا یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ شیکسپیئر[1] کی ہستی کوئی تاریخی ہستی نہ تھی۔ اس کے متعلق بے شمار روایات کا ایک سلسلہ ہے۔ لیکن کوئی شخص یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ شیکسپیئر کون تھا۔ یہ کسی شخص کا نام ہے یا لقب۔ شیکسپیئر کو ہم اس کی تصنیفات کے ذریعے جانتے ہیں۔ وہ ایک ڈرامائی شاعر تھا۔ اور اس نے بے شمار کردار ادب کو دیئے ہیں۔ ہر کردار چند مخصوص تجربات کا مرکب ہوتا ہے۔ ایک ایسا فنکار جو مختلف قسم کے بے شمار کرداروں کی تخلیق کرے۔ بلاشبہ ایک پہلو دار شخصیت کا مالک ہوگا۔ اس کا اپنا کردار وسعت اور گہرائی کا حامل ہوگا۔ اس کی ہمدردیاں بے پایاں ہوں گی اور اس کے تجربات بے شمار۔ اس اصول کے پیشِ نظر یہ کہا گیا کہ انگریز شعرا میں اگر کوئی غالب کی سی پہلو دار شخصیت رکھتا تھا تو وہ شیکسپیئر تھا۔ اسی طرح دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ جرمن شعرا میں اگر ایسی شخصیت کسی کی تھی تو وہ غالب کے ہم عصر شاعر و فلسفی گوئٹے[2] کی تھی۔ غالب کے نوحے میں اقبال نے اس خیال کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے ؎

آہ تو اجڑی ہوئی دلّی میں آرامیدہ ہے
گلشنِ ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

گوئٹے کی عظمت سے انکار کرنا غیر ممکن ہے۔ اس کی ہستی ایک تاریخی ہستی تھی۔ مغربی

---

[1] شکسپیئر کی پیدائش ۱۵۶۴ء میں اور وفات ۱۶۱۶ء میں ہوئی۔
[2] گوئٹے کی پیدائش ۱۷۴۹ء میں اور وفات ۱۸۳۲ء میں ہوئی۔

ادب کو اس نے اپنی ذات میں سمو لیا تھا اور اس کی شاعری مغربی کلچر کی نمائندہ شاعری ہے۔ اس کی شاعری میں روحِ عصر (Zeit - Geist) کارفرما ہے۔ اس کے علاوہ کلاسیکیت اور رومانیت کے دھارے اس کی ذات میں آکر یوں مل جاتے ہیں کہ گویا اس کی ذات ان دونوں رجحانات کا سنگم ہے۔ خیر و شر کی جنگ کا اس نے وہ جیتا جاگتا مرقع پیش کیا ہے کہ فلسفے کو شاعری کی بدولت زندگی مل گئی ہے۔ علاوہ ازیں گوئٹے نے مشرقی خیالات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ چنانچہ حافظِ شیراز کے جواب میں اس نے اپنا دیوانِ مغربی لکھ کر اس احسان کا بدل کر دیا ہے۔ جو مشرقی خیالات نے اہلِ مغرب پر کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ نظر کو گوئٹے کی شخصیت میں جتنی وسعت اور گہرائی نظر آتی ہے۔ اتنی موجودہ دور کے کسی مغربی شاعر کی ذات میں نظر نہیں آتی۔ اسی بنا پر یہ کہنا بجا ہوگا کہ مرزا غالبؔ کا مغربی حریف اگر کوئی ہے تو گوئٹے ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ مرزا غالبؔ کی قدر اُن کے جیتے جی کسی نے نہ کی۔ اس کے برعکس گوئٹے کو اس کی زندگی ہی میں اہلِ یورپ نے اپنے عہد کا عظیم مفکر اور روحِ عصر کا ترجمان مان لیا تھا۔

یادگارِ غالبؔ کی اشاعت کے بعد سے غالب پرستی کا دور شروع ہوتا ہے۔ ورنہ خود غالبؔ کے زمانے میں ذوقؔ اور مومنؔ دونوں کو غالبؔ پر ترجیح دی جاتی تھی۔ ذوقؔ اور مومنؔ دہلی کے دبستانِ شاعری میں دو سلسلہ ہائے شعرا کے بانی تھے۔ ذوقؔ کا سلسلہ داغؔ کے ذریعے ایسا پھیلا کہ پورے ہندوستان پر چھا گیا۔ مومنؔ کا سلسلہ نسیمؔ دہلوی اور ان کے بعد منشی امیر اللہ تسلیمؔ کے ذریعے لکھنؤ پہنچ گیا۔ اور ہر چند کہ اس سلسلے کے شعرا کی تعداد بہت بڑی نہیں تاہم بہت سے نامور شعرا اس سے منسلک ہیں۔ اس کے برخلاف مرزا غالبؔ کے سلسلۂ شاعری کو اتنی مقبولیت نصیب نہ ہوئی۔ غالبؔ کے تلامذہ میں سے بعض نے بہت شہرت پائی۔ حالیؔ و مجروحؔ کو اس باب میں خصوصیت حاصل ہے۔ ان کے تلامذہ کی تعداد بھی کچھ ایسی کم نہیں[1] لیکن یہ سلسلہ آگے نہ بڑھ سکا۔ بظاہر یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی ہے کہ یادگارِ غالبؔ کے بعد

[1] مالک رام نے تلامذۂ غالبؔ میں ان کے ۱۴۶ شاگردوں کے نام گنائے ہیں اور اس طرح ایک غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔ محمد حسین آزادؔ نے اس بات کو ہوا دی تھی کہ غالبؔ کو ماننے والے گویا نمونے کے برابر تھے۔ اور ذوقؔ کی ہر دلعزیزی کا تو کہنا ہی کیا ہے، جگت استاد تھے۔

جو نیا دور شروع ہوا۔ اس نے غالب کو دورِ جدید کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا۔ غالب کی شہرت رفتہ رفتہ اس انتہا کو پہنچ گئی کہ خود ہندوستان میں ان کو اردو کا عظیم ترین شاعر تسلیم کیا گیا۔ یہ وہی غالب ہیں جن کے متعلق ان کے ہم عصروں کا قول تھا ع

مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور مرزا غالب کو یہ معذرت پیش کرنی پڑی۔ "گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل" غالب کا کلام اپنی مقبولیت کے لحاظ سے ایک مدّ و جزر کی کیفیت رکھتا ہے۔ ابتدا میں لوگوں نے ہنسی اڑائی کہ خدا معلوم یہ حضرت کس زبان میں شعر کہتے ہیں۔ اور کونسے مضامین اپنے شعروں میں باندھتے ہیں۔ پھر ایک موڑ آیا۔ جب مرزا نے اپنے حریفوں کو مرعوب کر دیا۔ اور ان کی شہرت ہندوستان بھر میں پھیل گئی۔ اس کے بعد ایک ایسا موڑ آیا کہ داغ و امیر و جلال کا رنگ مقبولِ عام ٹھہرا۔ اور دیوانِ غالب کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد غالب پرستی پورے شد و مد کے ساتھ شروع ہو گئی اور بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اردو زبان آئندہ کسی دور میں غالب کی عظمت کو فراموش نہ کر سکے گی۔ یعنی جب تک اُردو غزل موجود ہے۔ غالب زندہ رہیں گے۔

غالب کی پہلو دار شخصیت اپنے اندر وہ ہمہ گیری اور وسعت رکھتی ہے کہ اگر صنفِ غزل کبھی آگے چل کر غیر مقبول ہو جائے۔ تب بھی غالب کی عظمت پر حرف نہ آسکے گا۔ ایرانی شعرا ہر چند کہ فارسی گویانِ ہند کے قائل نہیں ہیں۔ لیکن مرزا غالب کا فارسی کلام بھی کوئی معمولی درجے کا نہیں۔ غالب کی فارسی غزل اور ان کا فارسی قصیدہ اپنے مقام پر اتنی بلند چیزیں ہیں کہ ان کی مثال فارسی شاعری میں بھی ملنی محال ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے کہ مرزا کے فارسی محاورے پر اہلِ ایران ناک بھوں چڑھائیں۔ اس میں شک نہیں کہ مرزا غالب کا تعلق برِصغیر پاک و ہند سے تھا۔ اس لحاظ سے وہ اہلِ زبان نہیں کہلا سکتے۔ پھر بھی فارسی ان کے گھر کی زبان تھی۔ خواہ وہ شیراز کی فارسی نہ ہو۔ ایک صاحبِ تحقیق بزرگ نے اپنی ساری عمر یہ ثابت کرنے میں صرف کر دی کہ غالب نے ملّا عبدالصمد عرف ہرمزد سے اکتسابِ علم نہیں کیا۔ بلکہ اس نام کا کوئی شخص موجود ہی نہ تھا۔ یہ سب کچھ غالب کی افسانہ طرازی ہے۔ پیروانِ قتیل کے ساتھ معارفے میں اور برہانِ قاطع کی بحث میں غالب یہ جتانا چاہتے تھے کہ اُن کی فارسی

اہلِ زبان کی فارسی ہے۔ لہٰذا انھوں نے ہرمزد کی شخصیت ایجاد کرلی۔ یہاں اس سے غرض نہیں کہ ہرمزد واقعی کوئی شخص تھا۔ یا محض ایک افسانوی کردار تھا۔ نہ اس سے کوئی مطلب ہے کہ لغت دانی میں غالب کا رتبہ ہندی فرہنگ نویسوں سے بلند تھا یا نہ تھا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ مرزا غالب ایک عظیم شاعر تھے۔ فارسی شاعری میں بھی ان کا مقام کم ازکم اتنا بلند ضرور ہے کہ انھیں بھلایا نہیں جاسکتا۔

زمانے کا مذاق خواہ کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے یہاں تک کہ جدید شاعری اور نئے تقاضوں کے اثر سے غالب کی شاعرانہ عظمت دھندلی بھی پڑ جائے لیکن غالب نے اُردو نثر پر جو احسان کیا ہے۔ وہ اپنی جگہ اتنا بڑا ہے کہ اُسے فراموش کرنا ممکن نہیں۔ جدید اُردو نثر غالب سے شروع ہوتی ہے۔ نثر نگاری میں غالب کے بلند مقام سے انکار کرنا ایسا ہے۔ جیسے ہم کسی عمارت کی بنیاد کو اکھاڑ کر پھینک دینا چاہیں اور ساتھ ہی اس مکان کے اُوپر منزلوں پر منزلیں بناتے چلے جائیں۔ میرامن کے بعد غالب اور غالب کے بعد سرسیّد احمد خان اور حالی اُردو نثر کے ایسے معمار ہیں جن کی کوششوں کی بدولت اُردو نثر نگاری اپنی ارتقا کی منزلیں طے کرکے اس قابل ہوگئی کہ اب ہر قسم کے مضامین اُردو میں بیان کیے جاسکتے ہیں۔

اگر ہم اپنی توجہ اردو غزل پر مرکوز کریں اور سوچیں کہ یہ کیا بات ہے کہ غالب کو اپنے زمانے میں وہ شہرت حاصل نہ ہوسکی جو بیسویں صدی میں حاصل ہوئی تو اس کا سراغ لگانا کچھ ایسا مشکل بھی نہیں۔ ذوقؔ و مومنؔ کی شاعری ایک داستانِ پارینہ بن کر رہ گئی ہے اور بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مستقبل میں ان کے کلام کو ایک حیاتِ نو ملے گی۔ اور آنے والا زمانہ ان کی قدر کرے گا۔ کلامِ غالب میں کوئی بات ایسی ضرور ہے کہ نظریات و احساسات کے لحاظ سے غالب کے بعد آنے والے شعرا (امیرؔ و داغؔ وغیرہم) ہمیں پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن غالب ہم کو اپنا ہم عصر نظر آتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کا رُخ اپنے زمانے کی طرف نہ تھا۔ بلکہ مستقبل کی طرف تھا۔ کلامِ غالب کی بہت سی شرحیں لکھی جاچکی ہیں۔ اور بے شمار شرحیں آئندہ لکھے جانے کی توقع ہے۔ کسی عظیم شاعر کی پہچان یہ ہے کہ ہر دور اس کو اپنا نمایندہ تصوّر کرتا ہے اور اپنے خیالات کی روشنی میں اس کے اشعار کی تفسیر کرتا ہے۔ اُردو شعرا میں یہ مقام صرف غالب ہی کو حاصل ہوا۔ آگے

چل کر یہ ممکن ہے کہ کلامِ اقبالؔ کا ایک حصہ اہلِ نظر کی دانست میں اتنا وقیع ٹھہرے کہ اس کی تفسیر پر تفسیر ہو۔ ورنہ ولیؔ کے وقت سے آج تک یہ اہمیت کسی دوسرے شاعر کو نہیں دی گئی انگریز شعرا میں یہ عزت شکسپیئر کے حصے میں آئی۔ جب تک شکسپیئر زندہ تھا اُسے کوئی جانتا بھی نہ تھا۔ یہاں تک کہ اس کے حالاتِ زندگی بھی مصدقہ طور پر نہیں لکھے گئے۔ لیکن گزشتہ تین صدیاں ایسی گزری ہیں کہ ہر دَور شیکسپیئر کو اپنا نمائندہ گردانتا ہے اور شیکسپیئر کے کلام کی تفسیریں ہر دَور میں کی گئی ہیں اور توقع ہے کہ آئندہ بھی کی جائیں گی۔ ایسی شہرت کسی شاعر کو جب ہی ملتی ہے کہ اس کی شخصیت اتنی پہلودار ہو کہ ہر صورتِ حال میں اس کا کلام انسانیت کو ایک پیغام دے سکے۔ سوچنے کے ڈھنگ اور رہن سہن کے طریقے کتنے ہی کیوں نہ بدل جائیں۔ ایک عظیم شاعر کا کلام پرانا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غالبؔ آج بھی ہم کو اپنے ہم عصر نظر آتے ہیں۔

تخئیل اور طرزِ بیان کی ندرت

یہ ایک امرِ مسلّمہ ہے کہ غالبؔ کو اگر ناز تھا تو اپنی فارسی شاعری پر۔ ایک فارسی قطعے میں جو ان کی معاصرانہ چشمک کا آئینہ دار ہے۔ دربارِ شاہی کے ملک الشعراء کو مخاطب کر کے کہتے ہیں ؎

اے کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتہ — کے بہ پُرگوئی فلاں در شعر ہم سنگِ منست

راست گفتی لیک می دانی کہ نبود جائے طعن — کمتر از بانگِ دہل گر نغمۂ چنگِ منست

غالبؔ نے اس قطعے میں اپنی شاعری کو "نغمۂ چنگ" سے اور حریفانِ بزم کی شاعری کو "بانگِ دہل" سے تشبیہ دی ہے۔ محض پُرگوئی اور بلند آہنگی کسی شعر کی عظمت کا معیار نہیں قرار دیے جا سکتے اپنے اردو دیوان کو تو مرزا "یک دو جز" پر مشتمل مانتے تھے[1] چنانچہ دعویٰ کرتے ہیں ؎

نیست نقصاں یک دو جز و است ار سواد ریختہ — کاں دو دم برگے ز نخلستانِ فرہنگِ منست

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ — بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ منست

اور آخر میں اپنے حریف پر یوں پھبتی کستے ہیں ع

---

[1] یہ پھبتی بھی غالبؔ پر کسی گئی تھی ؎

ڈیڑھ جُز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب — غالبؔ آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

ہرچہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ منست

اس قسم کی چشمکیں مرزا کے اردو دیوان میں بھی ملتی ہیں ع

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا [1]

ایک قطعے میں عرضِ حال کرتے ہیں ؎

سَو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری

کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

اس قسم کے قطعات کی تصنیف ایک نفسیاتی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ مرزا کے دَور میں دلّی میں کوئی فارسی گو ان کی ٹکر کا نہ تھا۔ لہٰذا ابتدائی زمانے کو چھوڑ کر ان کی فارسی شاعری پر انگشت نمائی نہ کی جا سکی۔ لیکن اردو شاعری کا حال کم از کم ۱۸۵۰ء تک اس کے برعکس تھا۔ اوّل تو اہلِ دہلی مرزا غالب کو اہلِ زبان ہی تصوّر نہ کرتے تھے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان کے اردو کلام کا بڑا حصّہ "فارسی زدہ" ہے۔ ایسی غزلیں چند ہیں۔ جنھیں سہلِ ممتنع کی بہترین مثال قرار دیا جائے۔ اور یہ غزلیں بھی غالباً ان کی کہنہ مشقی کے زمانے کی ہیں۔ پھر دلّی اردو شعرا سے بھری پڑی تھی۔ مومن و ذوق تو مستند اساتذہ میں سے تھے۔ شاعری کا شوق ان دنوں عام تھا۔ اور ہر شریف زادے کو شاعری کا دعویٰ تھا۔ اہلِ دہلی کو یہ گوارا نہ تھا کہ بیرونِ دہلی کے کسی شخص کو زبان کے معاملے میں اپنے برابر کا سمجھیں۔ مرزا غالب کے آخری دَور کی شاعری (جو سہلِ ممتنع کی بہترین مثال ہے) جہاں تک زبان کا معاملہ ہے، اسقام سے بری نہیں ہے۔ ہر چند کہ غالب اوائلِ عمر میں دلّی آ گئے تھے۔ اور ساری عمر دلّی ہی میں رہے۔ لیکن ان کا بچپن آگرے میں گزرا تھا۔ جہاں کی زبان اہلِ دہلی کے نزدیک مستند نہیں ہے۔ آگرے کی زبان پر راجستھان کا اثر ہے اور غالب کے لہجے میں کہیں کہیں بندیل کھنڈ اور راجپوتانے کا اثر نمایاں ہے۔ شعر تو ٹھوک بجا کر

---

[1] ایک شاعرانہ سی روایت ہے کہ میاں ابراہیم ذوق بیدل اور مرزا غالب پالکی میں قلعۂ معلّیٰ کی طرف رواں دواں تھے۔ جب ایک دوسرے سے قریب ہوئے تو غالب نے برجستہ مصرع چست کیا ع ہوا ہے شاہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا قلعہ پہنچتے پہنچتے غزل بھی کہہ لی اور ذوق کی شکایت پر بازپرس ہوئی تو عرض کی کہ پیر و مرشد! میں تو اپنی غزل کا مقطع کہتا چلا جا رہا تھا۔ استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال۔ ناممکن!

کہتے ہیں۔ خطوط میں بعض اوقات الفاظ کی مزاج شناسی میں کسر نظر آتی ہے۔ ایک مشہور شعر ہے ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی،

اہلِ دہلی یوں کہتے کہ جہاں سے ہم کو بھی خود اپنی خبر نہیں آتی۔ "اپنی" کی بجائے "ہماری" خالص بندھیل کھنڈی زبان ہے[1]۔ ہمارے کے علاوہ جب اپنے کا لفظ استعمال کرنا ہو تو عموماً وہ "اپن" کہتے ہیں جیسے "اپن کو فلاں جگہ چلنا ہے"۔ یہ درست ہے کہ غالب پرستی کے دور میں ہم یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے کہ مندرجہ بالا شعر میں "ہمیں ہماری خبر نہ آنا" انتہائے بلاغت ہے۔ لیکن اہلِ دہلی کے نزدیک یہ فصاحت کی شان کے خلاف ہے۔ ایک آدھ جگہ تذکیر و تانیث کو بھی عجب طرح برتا ہے ع کیوں ترا راہ گزر یاد آیا (بجائے "تری راہ گزر یاد آئی" کے) غرض کہ اس صورتِ حال میں کہ مرزا کے اہلِ زبان ہونے کو مشکوک خیال کیا جاتا تھا۔ وہ یہ حربہ استعمال کرتے تھے کہ "فارسی بیں تا ببینی نقشہائے رنگ رنگ"۔

اِدھر انصاف سے دیکھیے تو دِلّی والوں کا غالب کی زبان پر ناک بھوں چڑھانا بے جا بھی نہ تھا۔ ان دو اشعار میں "سمجھے"[2] کا وزن دیکھیے ؎

وضع میں اس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق — رنگ میں سبزہ نوخیزِ مسیحا کہیے
یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے — لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

"اثبات" کو کہیں مذکر باندھا ہے اور کہیں مؤنث۔ تاہم اس قسم کی اغلاط خال خال ہیں اور اُن کا کلام اتنا بلند رُتبہ ہے کہ محض لفظی صحت کو اُسے پرکھنے کا معیار بنانا سخت حماقت ہوگی۔

مرزا غالب نے زبان کی شاعری غالباً اسی لیے نہیں کی۔ اس کے برخلاف انھوں نے اپنے حریفوں سے اپنی عظمت منوائی تو زورِ تخیل اور حسنِ بیان کے بل بوتے پر۔ وقت کا اثر زباں پر پڑنا ناگزیر ہے۔ زبان وقت کے ساتھ بدلتی جاتی ہے اور محاورے متروک قرار دیے جاتے ہیں اور ادائے مطالب کے نئے سانچے ایجاد کیے جاتے ہیں۔ چنانچہ خالص زبان کی شاعری سے

---

[1] خطوط میں بے تکلفی کا انداز ہے اور بول چال کا لہجہ ہے۔ ملازم لڑکے کو چھوکرا کہہ کر پکارتے ہیں۔ بھڑوے اور پشم اکھاڑنے کو فحش نگاری نہیں خیال کرتے اور کھسکنے اور پھسلنے کو مرکب کر کے کھسلنا بولتے ہیں۔ یہ آگرے اور گوالیار کی بولی ہے۔

[2] بروزن "جھیے" غالب و ناسخ کے دور سے پہلے متروک ہو گیا تھا۔

یہ توقع نہیں رکھی جاسکتی کہ اُسے ابدیت حاصل ہوگی۔ ذوق کی زبان ہمیں ابھی سے پرانی معلوم ہونے لگی ہے اور یہی بڑی وجہ ان کی عدم مقبولیت کی ہے۔ اس کے برعکس غالب کا کلام ہمیں تازہ معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ غالب نے زبان و محاورہ کی شاعری کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ زبان کی شاعری کی اپیل بھی ایک خاص حلقے تک محدود رہتی ہے۔ ذرا مذاقِ عامہ بدلا۔ اور اس قبیل کی شاعری پر زوال آیا۔ جب لوگ چٹخارے دار اشعار کے شوقین ہوتے ہیں۔ اور شاعری کو محض صنعت گری اور بذلہ سنجی خیال کرتے ہیں۔ تو زبان کی شاعری پسندیدہ قرار پاتی ہے۔ لیکن جب لوگ شاعری میں تخیّل کی کارفرمائی تلاش کرتے ہیں۔ اور شاعری کو خیالات کا ذریعۂ اظہار اور جذبات کا آئینہ سمجھتے ہیں تو زبان کی شاعری کی قدر نہیں ہوتی۔ موجودہ زمانے میں خصوصیت کے ساتھ زبان کی شاعری ایک محدود قسم کی شاعری سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے کہ اس شاعری کا ترجمہ شاعرانہ خوبیوں سے عموماً مبرا ہوتا ہے۔ لیکن تخیّل کی شاعری ترجمے کے بعد بھی اپنا حسن برقرار رکھتی ہے۔

غالب نے ایک جگہ کہا ہے ؎

آں مطربم کہ ساز نوائے خیالِ من

غیر از کمندِ جاذبۂ دل نداشت تار

یعنی غالب کی تخیّل کا سرچشمہ ان کی روح یا ذہن سے پھوٹتا ہے نہ کہ مختلف طریقوں سے حاصل کیے ہوئے علوم و فنون یا مشاہدات و تجربات سے ہرچند کہ ہم مشاہدے، مطالعے اور تجربے کو عظیم ادب کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ ان کی مدد کے بغیر بلند پایہ شاعری نہیں کی جاسکتی لیکن مشاہدے یا مطالعے یا تجربے کو ہم قوتِ تخلیق کا مترادف نہیں قرار دے سکتے۔ یہاں غالب نے شاعرانہ تعلّی کے ذریعے شاعری کا ایک نظریہ ہم تک پہنچایا ہے۔ یہ ایک رومانی نظریہ ہے۔ شاعر جو کچھ پیش کرتا ہے۔ وہ کسی خارجی ذریعے سے حاصل کیا ہوا نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ شاعر کے اندر سے آتا ہے۔ کہیں وہ اپنی شاعری کا سرچشمہ الہام کو قرار دیتے ہیں ع

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

یوں سمجھ لیجیے کہ مضمونِ شعر الہام کے ذریعے شاعر تک پہنچتا ہے۔ اور پھر شعر کے ذریعے دوسرے لوگوں تک، غالب کو اپنی ذات پر بڑا ناز تھا۔ اور وہ "ہم چوں ما دیگرے نیست" کے شدت

کے ساتھ قائل تھے[1] یعنی یہ خیالات اور کسی کو کب ملے ہیں۔ کوئی دوسرا شاعر اگر اتنا مشاہدہ، مطالعہ اور تجربہ رکھتا بھی ہو۔ تب بھی ایسے مضامین نہ باندھ سکے گا جیسے غیبی امداد کی بدولت غالب نے باندھے ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ غالب کے تجربات زندگی بھی ایسے تھے۔ جو ان کے معاصرین کو حاصل نہیں ہوئے تھے۔ اس لحاظ سے ان کے اشعار کا ان کے معاصرین کے اشعار سے بلند ہونا ایک منطقی بات ہے۔ اسی طرح غالب کا مطالعہ غالباً عام شعرا کی نسبت وسیع تر تھا۔ یہی حال مشاہدے کا ہے۔ ان کی باریک بینی اور ذہنی بیداری اس قسم کی تھی کہ جتنی چیزیں نظر سے گزرتیں وہ انھیں متاثر کیے بغیر نہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ جینئس کے علاوہ مشاہدے تجربے اور مطالعے نے بھی غالب کی شاعرانہ شخصیت کی تکمیل میں حصہ لیا تھا۔ غالب کی پہلودار شخصیت پر ہم جتنا غور کرتے ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ ایسی شخصیت رکھنے والا ہی ایک عظیم فن کار ہو سکتا ہے۔

غالب شناسوں میں مالک رام کو جو مرتبہ حاصل ہے وہ کسی کو کم ہو گا۔ اور ان کی تحریروں میں ہمارے مشرقی کلچر کی روح کارفرما نظر آتی ہے۔ زبان ایسی برمحل کہ میر امّن مرزا غالب اور خواجہ حسن نظامی کی وراثت ان تک چلتی جاگتی پہنچی ہے۔ لیکن ایک باب میں ان سے ذرا سا اختلاف کیے بغیر رہا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے غالب کی خوبیوں اور خامیوں کو غالب کے ترکمان خون کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ یعنی اگر غالب آزادہ رو تھے۔ تو ترک ایسے ہی ہوتے ہیں وغیرہ۔ لیکن انھوں نے یہ نظر انداز کیا ہے کہ غالب ایرانی بھی تھے[2]۔ اور اہل ایران کو فلسفیانہ خیالات کے ساتھ ہمیشہ لگاؤ رہا ہے۔ آریہ اقوام کو فلسفیانہ خیالات کے ساتھ عموماً ایک فطری مناسبت رہی ہے۔ اور اہل ایران خصوصیت کے ساتھ کچھ تو اپنی آریائی وراثت کی بنا پر کچھ اپنے قدیم مذہب کی وجہ سے اور کچھ اس لیے بھی کہ ان میں یہ ایک روایت رہی ہے نکتہ سے نکتہ نکالتے چلے آئے ہیں۔ فلسفیانہ موشگافیاں ایرانیوں کا خاصہ ہیں۔ اس امر پر غور کیا جائے تو غالب کی نکتہ دانی

---

[1] لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

[2] اس کی شہادت ان کے اس شعر میں ملتی ہے ؎

رموز دیں نہ شناسم درست معذورم　　نہاد من عجمی و طریق من عربی است

ہماری سمجھ میں آجاتی ہے۔ غالب کو صحبت بھی اپنے دور کے بہترین اہلِ کمال کی نصیب ہوئی تھی۔ اور ان کے سوانح نگاروں کی شہادت سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آخر عمر تک یعنی جب تک بینائی جواب نہیں دینے لگی تھی۔ وہ مطالعے میں لگے رہتے تھے۔ اس پر ان کا حسنِ ذوق سونے پر سہاگہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کا مطالعہ بھی اسی قسم کا تھا۔ وہ ان کتابوں کو مطالعہ کے لیے منتخب کرتے ہوں گے۔ جو اہلِ علم کے نزدیک بہترین کتابیں کہلا سکتی ہیں [1]

مرزا غالب حسنِ ذوق کے اعتبار سے اپنے دور میں ممتاز تھے۔ جاگیرداری کے عہد میں ہزار قباحتوں اور خرابیوں کے باوجود چند باتیں قابلِ قدر بھی تھیں۔ امیرزادوں کو اپنی ثروت و وجاہت کی بنا پر بہترین مصاحب و احباب، قیمتی کتابیں اور نفیس ترین ساز و سامان میسر ہو سکتے تھے۔ اس طرح حسنِ ذوق کی تربیت کا جو موقع امیرزادوں کو حاصل ہوتا تھا۔ وہ عوام کو نہیں ہو سکتا تھا۔ غالب اپنی طبیعت کے اعتبار سے بھی حسنِ ذوق کے مالک تھے۔ ان کی زندگی پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک لطیف حس رکھتے ہیں بلکہ انھیں لذت پرستی کا دلدادہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ ذکرِ غالب میں مالک رام نے بتایا ہے کہ مرزا غالب کے دسترخوان پر لذیذ غذائیں تھوڑی مقدار میں موجود ہوتی تھیں۔ یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ ہر چیز بہترین ہو لیکن اتنی تھوڑی مقدار میں کہ جی نہ بھرے اور طبیعت نہ اُکتائے۔ ہر چیز کا بہترین جوہر حاصل کرنا مرزا غالب کا شیوہ تھا۔ کریلے ہوں تو کڑوے ضرور۔ املی کے پھول اس لیے پسندیدہ تھے کہ وہ ترش ہوتے ہیں۔ آم کی تعریف میں تو مرزا انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ "میٹھے ہوں اور بہت ہوں" عمر کے آخری دور میں ان کا مقولہ تھا "آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را" ایک شعر میں اپنی لذت پرستی کا جوہر پیش کیا ہے ؎

غالب من و خدا کہ سر انجام برشگال　　　غیر از شراب و انبہ و برف و قند نیست

غالب کے اشعار اور خطوط سے ایسی بے شمار مثالیں اکٹھی کی جا سکتی ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ایک تربیت یافتہ ذوق رکھتے تھے۔ اور لطیف حس کے مالک تھے۔

---

[1] ایسی کتابیں چند ہی ہوں گی۔ مرزا کو اصلی شوق قدیم داستانوں کے مطالعہ کا تھا، یہ ثابت ہے اور باقی قیاس آرائی۔ پھر بھی عظیم خیالات تک کسی نہ کسی طرح غالب کی رسائی ضرور تھی۔

اپنے حسنِ ذوق کی تربیت میں غالبؔ کو کن مراحل سے گزرنا پڑا۔ یہ کہنا دشوار ہے۔ تاہم غالبؔ کی نفسیات سمجھنے والے کے ذہن میں ایک تصویر اُبھرتی ہے۔ غالبؔ ایک رومانی طبیعت رکھتے تھے۔ یہاں مجھے ایک رومانی مقولہ یاد آیا "انتہاؔ پسندی کا راستہ قصرِ عشرت تک لے جاتا ہے۔" مرزا غالبؔ کے ساتھ یہی ہوا۔ اوائلِ شباب میں انھوں نے حسن پرستی اور صہبا مستی کی حد کر دی۔ پھر سنبھلے اور ایک نقطۂ اعتدال پر آ گئے۔ آخر عمر میں شراب بھی برائے نام پیتے تھے۔ لطافتِ ذوق کا مطالبہ یہ تھا کہ شراب ہو بہترین قسم کی۔ شراب کو عرقِ گلاب میں ملا کر دوگونہ لذّت حاصل کرتے تھے۔ یہ تو ایک مثال ہوئی۔ ہر چیز کے بارے میں ان کا رویہ یہی تھا۔ ایسے تجربے روح کی گہرائیوں تک اثر انداز ہوتے ہیں۔ اور ایک لطیف سا نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ جیسے شیشے کے جام میں کوئی شوخ رنگ سیال انڈیلا جائے اور پھر جام کو الٹ دیا جائے۔ ایک لطیف سا رنگ پھر بھی باقی رہ جائے گا۔ یہی حال غالبؔ کے تجربات کا ہے۔ جوانی کے زمانے میں ہر چیز کی انتہا کو پہنچنے کے بعد اس چیز کو قریب قریب ترک کر دیا۔ لیکن اس کی لذّت اور رس رنگ باقی رہ گیا جو شاعری کے گلدستے میں سجا کر انھوں نے آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ دیا۔ غالبؔ کی طبیعت کو سمجھنے کے لیے ان کے اردو فارسی شعروں اور مکاتیب پر توجہ کرنی چاہیے۔ کہتے ہیں ع

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

مراد ہے کہ شعروں کے انتخاب سے میرا حسنِ ذوق ظاہر ہوتا ہے۔ غرض کہ غالبؔ کا ذوق انتہائی تربیت یافتہ اور بے حد نفیس تھا۔ وہ ہر معاملے میں "بہترین" کے قائل تھے۔ اور ہر چیز کے جوہر تک پہنچنا چاہتے تھے۔

غالبؔ کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں نشاط کا عنصر غالب نظر آتا ہے اور غم انگیز جذبات کو بھی وہ اکثر ظریفانہ پیرایہ دیتے ہیں۔ غالبؔ کی سوانح حیات میں ہمیں بے شمار لطائف ملتے ہیں۔ ان کی طبیعت شوخ تھی۔ ظرافت اور بذلہ سنجی ان کی طبیعت میں رچی ہوئی تھی۔

ؔ یہ قول انگریز رومانی شاعر بلیک (BLAKE) کا ہے جس کا زمانہ اٹھارویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع کا ہے۔ پیدائش ۱۷۵۷ء وفات ۱۸۲۷ء

مثالیں پیش کرنے کی چنداں ضرورت پیش نظر نہیں آتی۔ عبدالباری آسی نے غالب کی شوخیوں اور شوخ نگاریوں پر جو روشنی ڈالی ہے[1] اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب فلسفیانہ خیالات کے ساتھ کھیلتے تھے۔ گہرے فلسفیانہ خیالات جب لطیفہ بنا کر پیش کیے جائیں تو ایک عجیب صورتِ حال سامنے آئے گی۔ خام مواد تو فلسفیانہ خیالات کا ہوگا۔ اور سانچہ بذلہ سنج طبیعت کا۔ افسوس یہ ہے کہ عبدالباری آسی نے اس موضوع کے ساتھ پورا انصاف نہیں کیا۔ الفاظ تو بے شمار صرف کیے۔ لیکن بات بہت واضح نہیں ہوسکی۔ بہر حال یہ نقطۂ نظر قابلِ غور ہے۔ سطورِ بالا میں ہم نے یہ اشارہ کیا ہے کہ نکتے سے نکتہ پیدا کرنا ایرانیوں کی خصوصیت ہے۔ اور مرزا غالب کا ذہن ایران کی تہذیبی روایات کا پروردہ تھا۔ لیکن یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مرزا شوخ طبیعت تھے۔ طنز و مزاح کی چٹکی لیے بغیر سنجیدہ سے سنجیدہ خیال بھی وہ پیش نہ کر سکتے تھے۔ یہی شعر دیکھ لیجیے ؎

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا

طنز اور مزاح کا یک جا موجود ہونا چنداں ضروری بھی نہیں ہے۔ لیکن اتفاق سے دنیا کے بیشتر طنز نگار ظریف الطبع بھی ہوئے ہیں۔ یہ موضوع الجھا ہوا اور بحث طلب ہے۔ ورنہ قدیم یونانی ڈرامہ سے آج تک کے ادب کا جائزہ لے کر ثابت کیا جاسکتا ہے کہ طنز و مزاح جب یک جا ہو جاتے ہیں تو کیا صورتِ حال پیدا ہوتی ہے۔ غالب کے ایک نقّاد نے ان کی طنّازانہ بصیرت پر روشنی ڈالی ہے اور اس خصوصیت کو اُن کی شاعری کا جوہر قرار دیا ہے۔ یہاں اتنا ہی اشارہ کافی ہے۔ آگے چل کر ہم طنز و مزاح کے زیرِ عنوان اس معاملے پر روشنی ڈالیں گے۔

ایک مخصوص فلسفۂ حیات

ہر بڑا ادیب ایک معنی میں مفکّر و فلسفی کہلانے کا حق دار بھی ہوتا ہے۔ فلسفے سے مراد یہاں علمِ فلسفہ میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں ہے۔ بلکہ زندگی سے متعلق کسی خاص نظریے کا مرتب

---

[1] یہ مطالعہ ذرا سطحی ہے۔ آسی غالب کی دُورُخی طبیعت کو نہیں سمجھ سکے۔ کہیں روحانی سرمستی اور کہیں انبساطِ بادہ نوشی کو اور کبھی کبھی طنز کے زہر خند کو آسی نے ظرافت خیال کیا ہے۔

کرنا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ شاعر کے کلام میں کوئی مخصوص رجحان یا نظریہ اس قسم کا پایا جائے جس کی اشاعت اس کلام کے ذریعے کی گئی ہو۔ اگر شاعر کے ہاں فکری تضاد بھی موجود ہو۔ تب بھی کچھ ایسا نقصان واقع نہ ہوگا۔ اسی لیے کہ ہم کسی شاعر کے کلام کو شاعرانہ خصوصیات کی بنا پر پرکھتے ہیں۔ نہ کہ اشاعتِ نظریات کا معیار سامنے رکھ کر۔ اس لحاظ سے اگر ہم کسی شاعر کے کلام میں مرگ و حیات۔ خیر و شر، معرفتِ نفس، جبر و اختیار، تقدیر و تدبیر اور اسی قبیل کے مضامین کی فراوانی دیکھتے ہیں۔ تو ہم اُسے ایک مفکّر شاعر قرار دے دیتے ہیں۔ اس کے برخلاف اگر کسی شاعر کے کلام میں محض زبان کی خوبی، بندش کی چستی، محاورات کا برمحل استعمال اور اس کے ساتھ ہی معاملاتِ حسن و عشق کا تذکرہ پائیں۔ تو خواہ وہ شاعر کتنا ہی مقبولِ عام کیوں نہ ہو۔ فکری لحاظ سے ہم اس کے کلام کو قابلِ قدر نہ کہہ سکیں گے۔ اس کسوٹی پر غالبؔ کا کلام پرکھا جائے تو بلاشبہ وہ ایک فلسفی یا مفکّر شاعر نظر آتا ہے۔ اس میں کچھ غالبؔ کی خصوصیت نہیں ہے ہر بڑے شاعر کے کلام میں زندگی اور کائنات کا ادراک ملنا اس شاعر کی عظمت کی دلیل ہے چنانچہ میرؔ کہتے ہیں ؎

موت اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

ولیؔ کے وقت سے اقبالؔ کے دور تک متعدد اردو شعرا کا کلام فکری لحاظ سے عظمت کا آئینہ دار ہے۔ اس فہرست میں میرؔ اور ایک حد تک سوداؔ اور دردؔ، غالبؔ اور اقبالؔ آجاتے ہیں۔ معاصرینِ غالبؔ میں ذوقؔ کے کلام کو جتنا چاہیے کھنگالیے۔ چند اخلاقی اشعار تو ضرور آپ کی توجہ کے طالب ہوں گے۔ لیکن گہرے خیالات سے ان کا کلام بڑی حد تک عاری ہے، مومنؔ عشق کے کوچے سے ضرور آگاہ تھے۔ صاحبِ علم اور صاحبِ مطالعہ بھی تھے۔ ان کے کلام میں تخیّل کی نزاکت اور جذبات کی گرمی تو ملتی ہے۔ لیکن ان کی شخصیت غالبؔ کی طرح پہلو دار نہ تھی۔ اس لیے خیالات کی گہرائی ان کو نصیب نہ ہوئی۔ داغؔ کی استادی ان کی قادرالکلامی زبان دانی اور معاملہ بندی پر منحصر ہے۔ تفکر کی پرچھائیں بھی ان پر نہ پڑی تھی۔ بلکہ یہ کہنا اور بھی زیادہ مناسب ہوگا کہ جس قسم کی شاعری کو داغؔ کی وجہ سے مقبولیت حاصل

ہوئی۔ اُسے تفکر سے کوئی تعلق ہی نہ تھا۔ البتہ غالب کے بعد اگر کوئی صاحبِ فکر شاعر پیدا ہوا۔ تو وہ علامہ اقبال تھے۔ اقبال کے کلام میں گہرا فلسفیانہ رنگ ہے۔ ان کا ایک مخصوص فلسفۂ حیات بھی ہے۔ فرد اور ملت کا تعلق باہم، تہذیبِ مغرب کی مؤثر تنقید۔ معرفتِ نفس یعنی فلسفۂ خودی کی اہمیت کا احساس، اسلامی تاریخ سے لگاؤ اور اسلامی افکار کی روشنی میں عصرِ حاضر کے مسائل کا حل تلاش کرنے کی ضرورت ایک سچے مسلمان کو اپنی زندگی کیونکر بسر کرنی چاہیے اور کھوئی ہوئی اسلامی عظمت کی بازیابی کی کوشش۔ یہ اور ایسے ہی مسائل اقبال کے سامنے تھے۔ ان میں سے بہت سے مسائل ایسے ہیں۔ جن کا وجود اُس دَور میں نہ تھا جس سے غالب کا تعلق ہے۔ یہ مسائل بیسویں صدی کے ہندوستانی مسلمان مفکر کے مسائل ہیں۔ غالب کے سامنے جو مسائل تھے۔ وہ ان سے بڑی حد تک مختلف تھے غالب کی شخصیت بھی اقبال کی شخصیت سے بڑی حد تک مختلف شخصیت تھی۔ اس کے علاوہ بڑی بات ماحول اور زمانے کی ہوتی ہے۔ غالب کا ماحول اور زمانہ اقبال سے مختلف تھا۔

اوپر بتایا جا چکا ہے کہ فلسفیانہ خیالات سے غالب کو بڑی وابستگی تھی۔ اور یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ غالب ایرانی الاصل تھے۔ پھر غالب ایک شگفتہ طبیعت رکھتے تھے۔ بذلہ سنجی ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ اور طنز و مزاح ان کی سرشت میں داخل تھا۔ یہاں ہم بآسانی اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ زندگی کے متعلق غالب ایک رجائی نقطۂ نگاہ رکھتے ہوں گے۔ ان کی زندگی تکلیفوں کے باوجود خاصی رنگین بھی تھی۔ اور وہ بڑے شوقین مزاج بھی رہ چکے تھے۔ لہٰذا یہ امر حیرت ناک نہ ہوتا۔ اگر وہ زندگی کے متعلق ایک سطحی اور پُر امید زاویۂ نظر اختیار کر لیتے۔ اور یہ ثابت کرتے کہ زندگی کا مقصد محض اکتسابِ لذت ہے۔ براؤننگ نے ایک جگہ اس خیال کا اظہار بڑے خوبصورت طریقے سے کیا ہے "خدا بہشت میں موجود ہے۔ اور دنیا کا کام ٹھیک چل رہا ہے۔" لیکن ان الفاظ کی خوشنمائی کے پیچھے ایک سطحیت کارفرما ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر کو دنیا کے دُکھ درد کی کوئی خبر نہیں ہے۔ اس کے برخلاف غالب نے تکلیفوں اور مصیبتوں کا پورا احساس کرنے کے بعد ایک پیغامِ شادمانی دیا ہے۔ جیسے کوئی غم کی تلخی سے نشۂ مستی حاصل کرنا چاہے۔ ذرا قنوطی انداز میں خیام کی شاعری میں بھی غالب کی طرح بھی

احساس کار فرما ہے کہ اگرچہ زندگی مصائب سے لبریز ہے اور حیات و کائنات کی تمام قوتیں انسان کو مٹانے کے درپے ہیں۔ پھر بھی کیا پروا۔ جینے کی خواہش ایک بڑی طاقتور خواہش ہے۔ انسان ہر دکھ درد کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ تکلیفیں حد سے زیادہ بڑھیں۔ تو انھیں یوں فراموش کر دینا چاہیے جیسے کوئی میخوار شراب کا ایک جام پی کر سب کچھ بھول جاتا ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اِک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

بدانش غم آموزگارِ من است
خزانِ عزیزاں بہارِ من است

نفس گداختگی ہائے شوق را نازم
چہ شمع ہا بسرا پردۂ بیانم سوخت

ورنہ غالب خوب جانتے تھے کہ اس عالمِ کون و فساد میں ؏

باوجودِ دل جمعی خوابِ گل پریشاں ہے

نشہ بھی تسکین نہیں دیتا ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ اِنھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ رُبا کہتے ہیں

اس احساس کے باوجود زندگی میں عشرت و شادمانی ڈھونڈھنا اور ہجوم مصائب میں شگفتہ خاطر رہنا اور مصیبتوں کے سامنے اپنے کو بے بس تصور نہ کرنا بڑی ہمت کا کام ہے ؎

زمن جوے درد بکو زیستن　　　جگر خوردن و تازہ رُو زیستن

غالب کے مزاج کی تفسیر یوں کی جا سکتی ہے کہ وہ غموں سے گزر کر خوشی تک پہنچے ہیں۔ یعنی ان کی عشرت و شادمانی ناواقفیت کی بنا پر نہیں ہے[۱]۔ برخلاف اس کے براؤننگ کے پُرامید

---

[۱] اپنے کو اپنے سے الگ کر کے اپنی مصیبت اور ذلت و رسوائی پر ہنسنا بلکہ اس کیفیت سے لذت حاصل کرنا غالب ہی کا کام ہے۔ یہ ایک مخصوص نفسیاتی کیفیت ہے جو قابلِ لحاظ ہے۔

زاویۂ نگاہ کی بنیاد یہ ہے کہ وہ دنیا کے دُکھ درد سے دانستہ اغماض برتتا ہے۔ تجربے اور شخصیت کی مثال ایسی ہے کہ ہم عشرت و شادمانی کو دو مختلف زاویوں سے دیکھ سکتے ہیں ایک وہ جو سطحی ہے اور نا واقفیت پر مبنی ہے۔ اس کے بعد تجربے کا نمبر آتا ہے یعنی شخصیت غموں کے تجربے سے گزرتی ہے۔ اور پھر ہم اسی نکتے پر پہنچتے ہیں کہ غموں سے بے پروا ہو کر عشرت و شادمانی کی زندگی بسر کرنی چاہیے۔ لیکن اب جس نتیجے پر ہم پہنچے۔ اس کی بنیاد تجربے اور واقفیت پر ہے (یہاں ہیگل کا طریق استدلال ہمارے پیشِ نظر تھا) جہاں تک غالب کی زندگی کی شہادت کا تعلق ہے۔ ہمیں پوری طرح معلوم ہے کہ ان کی زندگی مسرّت و شادمانی سے معمور بے فکری کی زندگی نہ تھی۔ مکاتیبِ غالب میں جا بجا اُس پر آشوب دور کا تذکرہ ملتا ہے۔ جو غالب کو نصیب ہوا تھا۔ اوائل شباب کے چند رنگین سال ضرور ایسے گزرے جب غالباً مرزا غالب کو فارغ البالی کی زندگی نصیب رہی۔ پھر مصائب کی وہ یورش ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ کوئی تیس برس کی عمر سے تا دمِ آخر چین سے نہ بیٹھ سکے۔ جان بھائی دیوانہ ہو گیا۔ پھر ۱۸۵۷ء کے پُرآشوب زمانے میں موت کا شکار ہوا۔ گزر اوقات کے لیے مرزا کے پاس اتنا نہ تھا کہ ان کی ضرورت اور شوق کی تکمیل ہو سکے۔ عسرت[1] کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ آخر عمر میں بیماریوں سے نڈھال رہتے تھے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد کے چند سال بڑی تکلیف میں گزارے۔ ایک غم ہو تو کہا جائے بے اولادی کا غم اپنی جگہ پھر مرزا عارف کو گود لیا۔ تو وہ جوانی میں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان تمام اجزا کو جمع کیا جائے تو ایک غم انگیز افسانہ مرتب ہو سکتا ہے۔ غالب جیسے حساس شاعر کے لیے اس سے بہت تھوڑا غم اس کو مایوسی میں مبتلا کرنے کے لیے کافی ہو سکتا تھا۔ لیکن غالب کے کلام میں قنوطیت کی کوئی جھلک نہیں۔ البتہ یہ تصوّر کرنا کہ غالب کا نقطۂ نظر محض پُر امید ہو گا قطعاً نا مناسب ہے۔ غموں کو نشاطیہ رنگ دینا غالب کا بڑا کمال ہے۔ غالب بڑے صاحبِ ظرف ہی نہ تھے۔ غم و مسرّت کے ادا شناس بھی تھے۔

---

[1] غالب کی زندگی کا معاشی پس منظر آگے پیش کیا جائے گا۔

مذہبی افکار

غالبؔ کا اندازِ نظر آفاقی ہے۔ مذہبی معاملات میں ان کی آزادہ روی پر ان کے ناقدین اور سوانح نگاروں نے بہت روشنی ڈالی ہے۔ ذکرِ غالبؔ میں مالک رام نے اور 'غالب نامہ' میں شیخ محمد اکرام نے غالبؔ کی آزادہ روی کا تجزیہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ترک، ایرانی نسل کے لوگ مذہبی معاملات میں عموماً تنگ نظر نہیں ہوتے۔ ترک بالخصوص آزاد طبیعت ہوتے ہیں۔ اسلام لانے کے بعد بھی ترکوں میں غیر اسلامی اقدار ہمیشہ موجود رہی ہیں اور ایک عنصر روحِ مذہب سے بیگانگی کا ان کی سرشت میں شامل رہا ہے۔ یہاں یہ کہنا تو مشکل ہوگا کہ مرزا غالبؔ کی آزادہ روی کس حد تک وراثت کی بنا پر تھی۔ اور کس حد تک دوسری وجوہ کی بنا پر۔ لیکن ایک بات قابلِ لحاظ ہے اور وہ یہ کہ غالبؔ پکے موحّد تھے۔ عقیدے کے اعتبار[1] سے مرزا غالب اثنا عشری تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں:

ہم اسد اللّٰہم و ہم اسد اللّٰہیم

کلیاتِ فارسی اور دیوانِ اُردو میں متعدد قصائد حضرت علیؓ کی منقبت میں ہیں۔ خطوط میں بھی اپنے عقیدے کا اظہار وہ واشگاف الفاظ میں کرتے ہیں۔ چنانچہ اس میں پس و پیش کی کوئی گنجائش نہیں کہ مرزا غالب شیعی تھے۔ لیکن مذہبی تنگ نظری ان کو چھو کر بھی نہیں گئی تھی ؎

نے سُبحہ سے علاقہ نہ ساغر سے واسطہ	میں معرضِ مثال میں دستِ بریدہ ہوں
آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل	ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم	ملّتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں

ذرا اور فلسفیانہ رنگ میں اپنے مسلک کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلہ کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

مومن وہ ہے جو رضائے الٰہی کی خاطر عبادت کرتا ہے ؎

---

[1] اس کی توضیح آگے کی جائے گی۔

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

یہ مرتبہ وہ ہے، جو بڑے صوفیا کو ملتا ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ کے متعلق روایت ہے کہ ایک ہاتھ میں پانی لے کر چلتی تھیں اور دوسرے ہاتھ میں آگ۔ کسی نے پوچھا تو فرمایا کہ پانی سے دوزخ کی آگ بجھاؤں گی۔ اور آگ سے جنّت کو پھونک دوں گی۔ اور واقعی بات بھی درست ہے جس عبادت کا حاصل وہ آسائش و آرام ہو۔ جسے جنّت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور جس گناہ سے فقط اس لیے ڈرا جائے کہ اس کی سزا کا نام دوزخ ہے۔ ایسی جنّت اور دوزخ مومن کی شان کے شایاں نہیں۔ حق پرست کے لیے رضائے الٰہی سب کچھ ہے ؎

ہم کو معلوم ہے جنّت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

ایک لطیفہ مشہور ہے کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں اپنی بریّت ثابت کرنے کے لیے کسی انگریز حاکم کے سامنے پیش ہوئے۔ اور کہا آدھا مسلمان ہوں۔ شراب پیتا ہوں سوٗر نہیں کھاتا۔" خیر یہ تو ایک لطیفہ ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ غالب بڑے وسیع المشرب تھے۔ عقیدے کی راہ سے اثنا عشری، مسلک کے اعتبار سے موحّد اور بطور ایک انسان کے سب کی بھلائی چاہنے والے۔ ایک جگہ کہتے ہیں خود میری حالت فقیروں جیسی ہے لیکن میں کسی کو بھیک مانگتے نہیں دیکھ سکتا۔ اس حال کو انسان دوستی کا لقب دینا چاہیے۔ تصوّف سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ یہ کہنا تو بے جا ہوگا کہ منازلِ تصوّف سے واقعی گزرے تھے اور وارداتِ تصوف کا تجربہ ضرور رکھتے تھے۔ لیکن جہاں تک تصوّف کے عقائد و افکار کا تعلق ہے۔ ان سے پوری طرح باخبر تھے اور عالمِ تصوّر میں کیا کچھ نہ بیتا ہوگا، کہا نہیں جاسکتا۔ فنکار پر جذب کی سی کیفیت طاری ہوتی رہتی ہے جس میں نظریات کو واردات سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

غالب اور تصوّف

اردو شاعری میں مضامینِ تصوّف فارسی غزل کی ایک قدیم روایت کے طور پر شروع ہی سے

پلئے جاتے ہیں۔ چنانچہ ضروری نہیں کہ جو شاعر منازلِ تصوف سے گزرا ہو۔ وہی مضامینِ تصوّف بیان کرے۔ روائتی غزل میں یہ مضامینِ عشقِ مجازی کے مضامین کے ساتھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ ان کے درمیان امتیاز بہت کم برتا جاتا ہے۔ وارداتِ تصوّف سے آشنا گنتی کے چند شعرا گزرے ہیں۔ فارسی گویانِ ہند میں خسرو اور بیدل اردو شعرا میں میر درد۔ ان کے علاوہ کوئی چوتھا نام ایسا نہیں نظر آتا کہ باتفاقِ رائے اُسے صوفی شاعر تسلیم کر لیا گیا ہو۔ اس کے باوجود تصوف کا اثر اردو شاعری پر بہت گہرا ہے۔ چنانچہ تصوف کی اصطلاحات عشقِ مجازی کی اصطلاحات سے بے حد مماثلت رکھتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے اصطلاحاتِ تصوّف مستعار لے کر معاملاتِ حسن و عشق میں استعمال کی جاتی رہی ہیں۔ یہی حال اصطلاحاتِ رندی و میخواری کا ہے۔ نشّے کی کیفیات کو بھی جس زبان میں بیان کیا ہے۔ وہ بڑی حد تک تصوّف کی زبان ہے۔ ساقی سے مراد شراب فروش بھی ہے۔ اور مسلکِ تصوّف کے پیشِ نظر مرشد روحانی بھی ہے حسنِ ساقی اور حسنِ ازل میں بھی مماثلت ہے۔ معاملاتِ حسن و عشق کے بیان میں وصال کا تذکرہ بھی دو رخے پن ہی سے کیا گیا ہے۔ اس سے مراد جنسی آسودگی بھی ہے اور واصل بحق ہونا بھی۔ اور نفسیات کی رو سے موت اور جنسی آسودگی کی یکسانی ہے۔ ان حالات میں کسی غزل گو کے کلام میں تصوف کا عنصر پایا جانا کچھ ایسا عجیب نہیں پھر اگر غالب کے کلام میں مضامینِ تصوف کی بہتات ہے تو اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیے کہ مرزا غالب فی الواقعہ صوفی شاعر تھے۔ غالب کی زندگی سے تو خیر ہمیں آگاہی ہے بعض قدیم شعرا جنھیں صوفی شعرا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ آج کل کی تحقیق کے مطابق صوفی نہیں ہیں خواجہ حافظ شیرازی کو اہلِ ایران رندِ مشرب مانتے ہیں۔ اور برِ صغیر پاک و ہند میں بھی جدید تنقید کا یہی میلان ہے کہ حافظ اصطلاحی معنی میں صوفی نہ تھے۔ وہ بھی غالب کی طرح ایک رندِ ہزار شیوہ تھے مگر ان کے کلام میں کلامِ غالب سے بڑھ کر متصوّفانہ کیفیت ہے۔

اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ مرزا غالب کو تصوّف کے ساتھ گہرا لگاؤ تھا۔ خود فرماتے ہیں[۱] ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ   تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

---

[۱] مسائلِ تصوف کو جس خوبی سے باندھا ہے اس پر ناز کر رہے ہیں۔ اپنے اندازِ بیان پر ناز کرنا غالب کا شیوہ ہے کہتے ہیں کہ میری بادہ خواری اتنی مشہور نہ ہو گئی ہوتی تو خوبیٔ بیان کی وجہ سے لوگ مجھے ولی اور مرشد جانتے اور مانتے۔

غالبؔ کے فارسی اور اُردو کلام میں مضامینِ تصوّف کی فراوانی ہے۔ تصوّف کے متعلق آگے چل کر کچھ بیان کیا جائے گا۔ غالبؔ کے متصوّفانہ کلام کے چند نمونے درج ذیل ہیں۔ ان کو وحدت الوجود کے عقیدے کی ترجمانی کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا اور کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہوگی ؎

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

دِل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا، لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

پھر خود ہی اپنے ادعائے تصوّف پر ہنستے ہیں اور کہتے ہیں ؎

تصوّف نزیبد سخن پیشہ را
سخن پیشہ تر ندکۂ اندیشہ را

نشاں مند ایں روشنائی نۂ
غزل خوان و میخور سنائی نۂ

غزل گر نباشد نوائے دگر
بہر دل سلامت ہوائے دگر

غزل گر ملال آرد افسانہ گوئی
کہن داستانہائے شاہانہ گوئی

ان اشعار سے غالبؔ کا مسلک متعیّن ہوتا ہے۔ غالباً مرزا اس کے قائل تھے کہ "تصوّف برائے شعر گفتن خوب است" لیکن وہ کسی میدان میں بند نہ تھے۔

بہر دل سلامت ہوائے دگر

جدھر چل پڑے ادھر چل پڑے تصوّف تو ایک فکری مسلک ہے۔ وہ اس کے پابند بھی نہ تھے کہ اپنے کو غزل تک محدود رکھیں ع

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل[1]

اس کے ساتھ ہی یہ کہنا بھی یکسر درست نہ ہوگا کہ غالبؔ کو وارداتِ تصوّف سے کوئی تعلّق نہیں تھا۔ ایک عظیم شاعر اتنی بڑی شخصیت کا مالک ہوتا ہے کہ فکری اور ذہنی طور پر وہ ہزاروں چیزوں کی معرفت رکھ سکتا ہے۔ شاعرِ غزل کی ایک مخصوص شخصیت ہوتی ہے۔ جو اس کی ذاتی زندگی سے مختلف ہوتی ہے۔ اور شاعر جب غزل کہنے بیٹھتا ہے تو اُسے یہ شاعرِ غزل[2] والی شخصیت اپنے

---

[1] یہ مصرع محدود معنی میں غزل سے قصیدے کی طرف رجوع کرنے کا اشارہ ہے، لیکن اصل شکوہ غزل کی تنگ ظرفی کا مقصود ہے۔

PERSONA[2]

اوپر طاری کرنی پڑتی ہے۔ اس شخصیت میں ایک پہلو خود آزاری کا ہوتا ہے۔ ایک پہلو عشق کا ایک پہلو رندی اور ہوسناکی کا۔ وہ اپنے محبوب کو ایک حسین اور بے رحم کا ہے گاہے بے وفا کبھی وفادار شخص تصور کرتا ہے۔ جب یہی غزل کہنے والا شخص اپنی شاعرانہ شخصیت سے دست کش ہو کر دنیاداری کے معاملات میں حصہ لیتا ہے۔ تو اس کی شخصیت قطعاً دوسری ہو جاتی ہے۔ یعنی وہ ایک کاروباری شخص اور ایک مفید شہری اور اپنے خاندان کا ایک فرد بن جاتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ شاعرانہ شخصیت بذاتِ خود اپنی منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے یہ شخصیت ایک نقاب یا پردہ ہے جسے شاعر شعر کہتے وقت اپنے اوپر ڈال لیتا ہے۔ اور جب کاروبارِ حیات میں حصہ لینے کا وقت آئے تو اسے ہٹا دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے صوفی شاعر کی حیثیت بھی ایسی ہی ہے جیسے شاعرِ غزل کی۔ وہ اپنے اُوپر خاص حال طاری کر لیتا ہے اور بالفاظِ دیگر ایک نئی شخصیت کا نقاب یا پردہ اپنے اُوپر ڈال لیتا ہے۔ اسے عدمِ خلوص یا ریاکاری یا تقیّے پر مبنی نہ سمجھنا چاہیے۔ شاعر یہ محسوس کرتا ہے کہ جو شخصیت بھی وہ اختیار کرے ایک خاص وقفے کے لیے وہی اس کی اصلی شخصیت ہوتی ہے۔ جتنا عظیم شاعر ہوگا۔ اتنی ہی اس کی شاعرانہ شخصیت زیادہ پہلودار اور گہری ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ جب غالبؔ معرفت کی شاعری کرتے ہیں۔ تو محسوس ہوتا ہے کہ یہ وارداتی شاعری ہے۔ ورنہ نجی زندگی میں غالبؔ کو تصوّف سے کچھ ایسا سروکار بھی نہ تھا۔ عقیدے[1] کی راہ سے وہ اثنا عشری تھے۔ اس لیے بھی ان کو سلسلۂ تصوّف سے کوئی لگاؤ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اگرچہ بہادر شاہ ظفرؔ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ظفرؔ کے پیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ لیکن انھوں نے عجمی تصوّف بطور شاعر کے شعرائے ایران سے ورثے میں پایا۔ عجمی تصوّف اہلِ ایران کی ایک خصوصیت رہی ہے۔ جس کا شکوہ علامہ اقبالؔ نے کیا ہے۔ غالبؔ کو ویدانتی فلسفے سے بھی تعلّق خاطر تھا۔ ممکن ہے کہ یہ فیضی اور دارا شکوہ اور دوسرے شعرا کا اثر ہو ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اور اسی قبیل کے دوسرے اردو اور فارسی اشعار ویدانتی فلسفے کی نشان دہی کرتے ہیں جس

[1] غالب اور حضرت جی سید علی غمگین شاہ گوالیاری کی باہمی خط و کتابت سامنے آئے گی تو یہ اسرار کھلیں گے۔

میں بتایا گیا ہے کہ دنیا محض دھوکا ہے۔ سراب ہے۔ "مایا" ہے[1]۔ ہمہ اوست کا فلسفہ مرزا غالب کو ایرانی شاعری کی وساطت سے ملا۔ اس تصور نے مرزا کے کلام میں بڑے رنگین پھول کھلائے ہیں ؎

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا
ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

یہ کچھ مرزا غالب ہی سے مخصوص نہیں۔ اردو شعرا ہمہ اوست کے فلسفے سے شدت کے ساتھ متاثر ہوئے ہیں۔

اس کے باوجود اگر ہم یہ نتیجہ نکالیں کہ غالب صوفی شاعر تھے اور ان کے کلام میں وہ رُوحانی تجربہ جھلکتا ہے جو اہل تصوف سے مخصوص ہے۔ تو یہ دُرست نہ ہوگا تاہم یہ کہنا بھی مبالغہ آمیز نظر آتا ہے کہ متصوفانہ رنگ کے اشعار محض رواتی ہیں۔ جیسا کہ اُوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک عظیم شاعر ہر کیفیت کو پُوری طرح سمجھ سکتا ہے۔ بلکہ اپنی ذات پر طاری بھی کر سکتا ہے۔ اس کے لیے کسی خاص مسلک پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال کسی صوفی شاعر سے مقابلہ کرنے پر بڑی حد تک اندازہ ہو سکتا ہے کہ غالب تصوف تک عقل کی راہ سے پہنچے ہیں نہ کہ تجربے کی راہ سے۔ علاوہ ازیں روحانی کیفیات اور وارداتِ عشق میں ایک مشابہت ہے۔ مجاز اور حقیقت کے ڈانڈے اس طرح ملے ہوئے ہیں کہ شاعر اور قاری دونوں حقیقت کو مجاز میں اور مجاز کو حقیقت میں محسوس کر سکتے ہیں۔

غالب اور عقلیت

غالب کی شاعری کی اگر کوئی تعریف پیش کی جا سکتی ہے تو وہ یہ ہے کہ غالب اپنے اشعار میں جذبے کو عقل کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔ یہ تعریف اگرچہ غالب کے فارسی اور اُردو کے ہر شعر پر پوری نہیں اُترتی۔ لیکن کلامِ غالب کی ایک ایسی خصوصیت ضرور ہے۔ جو دوسری خصوصیات

---

[1] ویدانتی فلسفے پر آگے چل کر بحث کی جائے گی۔ غالب اس فلسفے سے متاثر ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ محمد مطالعے کے باوجود اپنشد کے فلسفے سے وہ باخبر نہوں یہ بعید از قیاس نظر آتا ہے۔

پر حاوی معلوم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر ؎

عشرتِ قطرہ ہے' دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

مقصد ہے ناز و غمزہ' دلے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو — خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی — چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال — کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں' ہو تو کیونکر ہو

غالب پر عقل کی گرفت اتنی سخت ہے کہ وہ انہیں جذباتیت کے دھارے پر نہیں بہنے دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات کا تجزیہ کرتے جاتے ہیں۔ اور ہر جذبے کے لیے کوئی دلیل لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلسفے کے ساتھ ان کا گہرا ربط غالباً عقلیت کی طرف ان کی رہنمائی کرنے میں مددگار رہا ہو گا۔ یہ کیفیت اردو کے دوسرے شعرا کے کلام میں نظر نہیں آتی۔ غالب کو قنوطیت سے باز رکھنے میں بھی ان کی عقلیت ہی کی کار فرمائی نظر آتی ہے۔ جتنی شدت کے ساتھ غالب کسی جذبے سے متاثر ہوتے ہیں۔ اسی قدر شدت کے ساتھ وہ اس جذبے کو عقل کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایک نہایت صحت مندانہ رجحان ہے۔ اور شاعری کو اس الزام سے بری قرار دیتا ہے کہ شاعری محض مریضانہ کیفیات کا ایک مجموعہ ہے۔ کم از کم غالب کی شاعری مریضانہ ہرگز نہیں۔ دوسری طرف اگر شاعر محض عقل پر زور دے۔ اور جذبات سے قطع تعلق کر لے۔ تو اس کا کلام پھیکا اور بے رنگ ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ لیکن غالب کے ہاں جذبے اور عقل کا ایسا حسین امتزاج ہے کہ عقلیت بڑھ کر شعر کو پھیکا اور بے رنگ نہیں ہونے دیتی اس لیے کہ شدتِ احساس کا عنصر عقلیت کے عنصر کے ساتھ پہلو بہ پہلو موجود ہوتا ہے۔ البتہ اس طرزِ شاعری کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ کلامِ غالب میں ایک دو رُخا پن پیدا ہو گیا ہے۔ انگریزی شاعری میں اس کی مثال جان ڈن (John Donne) کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ دراصل ڈن اور غالب میں بہت سی خصوصیات مشترک ہیں۔

اور ان کا باہمی تقابل فائدہ مند ہو سکتا ہے۔ ڈن کا زمانہ یورپ کی تاریخ میں ایک ایسا زمانہ تھا جب جغرافیائی حدود کے پرانے تعیّنات ٹوٹ رہے تھے اور نئے دریافتیں ہو رہی ہیں سائنس کی ہر نئی دریافت کا نتیجہ ہوتا ہے کہ ذہنی تعیّنات بھی ٹوٹ جاتے ہیں بعض شعراء ایسے اوقات میں توازن برقرار نہیں رکھ سکتے اور اُن کی تشبیہات نئے علوم سے براہِ راست متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ قاری کو گمان ہوتا ہے کہ شاعر اُسے اپنی علمیّت سے مرعوب کرنا اور بھول بھلیاں میں چکر دینا چاہتا ہے۔ غالبؔ کا دور بھی نئی دریافتوں کا دور تھا۔ قدیم و جدید کی آویزش، مشرق و مغرب کا تصادم، ہندوستانی جاگیرداری نظام اور انگریزی سرمایہ داری نظام کا ٹکراؤ ہو رہا تھا۔ غالبؔ بھی ڈن کی طرح قدیم و جدید اور مشرقی و مغربی کو اپنے اندر سمونا چاہتے تھے۔ چنانچہ غالبؔ پر بھی یہ الزام لگایا گیا کہ وہ شعر کے ذریعے اپنی علمیت کا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ غالبؔ کے کلام میں جذبات و احساس ہی نہیں، ادعائے علمیت بھی ہے اور جذبے کو عقل کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش بھی ہے۔

غالبؔ اور عشق [۱]

یوں تو جوانی میں کون مبتلائے عشق نہیں ہوتا۔ لیکن مکاتیبِ غالبؔ اور کلامِ غالبؔ کے مطالعہ کے بعد کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ غالبؔ جیسا حسن پرست اور عقلیت پر ایمان رکھنے والا اس حد تک عشق میں مبتلا نہ ہوا ہوگا۔ جتنا میرؔ یا جرأتؔ یا مومنؔ۔ مکاتیبِ غالبؔ میں ایک ستم پیشہ ڈومنی کا تذکرہ ملتا ہے۔ اوّل تو غالبؔ نے اردو میں خط لکھنا اس وقت شروع کیا۔ جب ان کی عمر پچاس سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ غالباً ۱۸۵۰ء سے پہلے خط و کتابت کی زبان اردو نہ تھی، فارسی تھی۔ اور ستم پیشہ ڈومنی کا تذکرہ اردو کے خطوط میں ملتا ہے یہ درست ہے، کہ جس دور کو یاد کر کے غالبؔ ستم پیشہ ڈومنی کا تذکرہ کرتے ہیں وہ ان کی بھرپور جوانی کا دور تھا اوائلِ شباب میں غالبؔ ایک ایسی رنگین زندگی بسر کر چکے تھے۔ جسے تماش بینی کہنا موزوں ہوگا امیرزادوں سے اُس دور میں یہی توقع بھی ہو سکتی تھی۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی ایک ستم پیشہ ڈومنی نے

---

[۱] توضیحات میں "تصوف"، "عشق اور غزل" کے تحت دیکھیے "عشق"

ان کے جذبات کی گہرائیوں کو چھولیا ہو۔ لیکن یہ ایسا عشق نہیں ہو سکتا۔ جو عمر بھر کا ہوتا ہے۔ نہ یہ حکیم مومن خاں کی طرح کسی پردہ نشیں کا عشق تھا۔ ستم پیشہ کے لفظ سے بوئے ہوس آتی ہے۔ البتہ ان کی ایک غزل کا رنگ نوحے سے ملتا ہوا ہے۔ ممکن ہے اُسی ستم پیشہ ڈومنی کا نوحہ ہو ؎

عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا
عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں
ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا
دل پہ اک لگنے نہ پایا زخم کاری ہائے ہائے
عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

غزل کے لیے ضروری نہیں کہ اس میں کوئی بنیادی جذبہ موجود ہو۔ یا موڈ کی ہم آہنگی برقرار رہے۔ لیکن اس غزل میں یہ دونوں چیزیں ملتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حقیقتِ حال کو نظم کر دیا گیا ہے۔ اس غزل سے چند نتائج برآمد کیے جا سکتے ہیں :۔

۱۔ یہ کسی پردہ نشین کا عشق نہیں۔ محبوبہ جب پردہ کرتی ہے تو گویا وہ قبر میں ہوتی ہے اسی لیے غالباً یہ اُسی ستم پیشہ ڈومنی کا نوحہ ہے۔

۲۔ جذبۂ عشق ابھی نامکمل ہی تھا کہ محبوبہ کو موت آ گئی۔

۳۔ محبوبہ کی یاد شاعر کو پوری طرح متاثر کرتی ہے۔ اور یہ حسرت کہ کاش وہ زندہ رہتی اور سلسلۂ عشق جاری رہتا۔ غزل میں شدّت کے ساتھ یہ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ مدّتِ عشق نہایت قلیل نہ سہی۔ مختصر ضرور تھی۔

ایک نہایت ہی معروف غزل وہ ہے۔ جس کا مطلع ہے ؎

مدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے　　جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

اس غزل میں بھی بنیادی جذبہ اور موڈ کی ہم آہنگی موجود ہے۔ لیکن عشق سے زیادہ حسن پرستی کا رنگ غالب ہے ؎

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس	زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوئے
اک نوبہار ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ	چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے
جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن	بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کیے ہوئے

مراد یہ ہے کہ محبوبہ غالبؔ کی مہمان ہو اور مے نوشی کا سامان ہو۔ محبوبہ بھی ایسی جس سے غالبؔ تاک جھانک کرتے رہے ہیں۔ شاعر بازارِ حسن سے گزرتا تھا تو محبوبہ بام پر آکر اشارے کرتی تھی لیکن اب وہ حالت نہیں ہے۔ اور اس کی ذمہ داری محبوبہ پر نہیں شاعر کی عدیم الفرصتی پر ہے۔ اس غزل کی مخاطب ایک ایسی محبوبہ ہے جو سنگار کرکے اور بن ٹھن کر بام پر بیٹھتی ہے۔ شاعر کے دل میں اسے حاصل کرنے کی تمنّا شدّت کے ساتھ جاگزیں ہے۔ لیکن زندگی کی مصروفیات مانع آتی ہیں۔ جذبہ گھٹ کر غزل بن جاتا ہے

یہ غزل غالبؔ کی طبیعت کا اصلی رنگ ہم پر کھولتی ہے۔ یعنی شاہدانِ بازاری سے معاشقے ایسے معاشقے قلیل المیعاد ہوتے ہیں۔ لیکن جذبے میں بلا کی شدّت ہوتی ہے۔ مفارقت سے سوز اور تڑپ، قربت سے لطف و نشاط کا تجربہ بڑا شدید ہوتا ہے اور یہی جانِ شاعری ہے۔

غالبؔ نے رشک کے مضامین بڑی خوبصورتی سے باندھے ہیں۔ اور ان کی غزلوں میں اس قسم کے اشعار کی کثرت ہے۔ مضامینِ رشک کے سلسلے میں غالبؔ کے حریف اگر ہیں تو حکیم مومنؔ خاں ہیں۔ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ معاملاتِ عشق میں مضامینِ رشک کو ایک مخصوص اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ رشک کا اظہار روایتِ غزل کا ایک حصّہ ہے۔ یہ ثابت کرنا مشکل ہوگا کہ غالبؔ کا رشک حقیقی ہے کہ محض تخیلی۔ اگر حقیقی ہے تو اس کا تعلق کسی ایسے موضوع کے ساتھ ہے جسے عشق پردہ نشین کہنا چاہیے یا یہ کوچۂ حسن میں آمد و رفت کا نتیجہ ہے۔ کلامِ غالب کا مطالعہ اور غالبؔ کی زندگی پر غور و فکر کرنے کا نتیجہ یہ ظاہر کرتا ہے۔ اوّل تو غالبؔ کا رشک روایتِ غزل سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرے اگر کوئی حقیقی موضوع غالبؔ کے سامنے تھا تو اس کا تعلق

بازارِ حسن سے تھا۔

یہاں یہ ثابت کرنا مقصود نہیں کہ غالبؔ محض حسن پرست تھے۔ اور انھوں نے کبھی کسی کسی سے عشق کیا ہی نہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ غالبؔ کے نزدیک انسان کے بنیادی جذبوں میں ایک عشق بھی ہے۔ دراں حالیکہ میرؔ یا مومنؔ کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق ہی سب کچھ ہے۔ غالبؔ کے موضوعات عشق کے علاوہ بھی بے شمار ہیں۔ حیات و کائنات کے رازہائے سربستہ کو کھولنا خدا اور انسان کی معرفت کی کوشش اور خود اپنے کو جاننے کی لگن اور اُن کے ساتھ ساتھ حسن و عشق کی واردات پر بھی نظر ڈالتے رہنا۔ چنانچہ غالبؔ کی غزلیات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ بنیادی جذبہ ہر صورت اور ہر حال میں محض عشق ہی نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی تہ میں غالبؔ کی عقلیت کام کر رہی ہو۔

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گُل

کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

یوں بھی مرزا غالبؔ حسن پرستی اور لذتیت کے دل دادہ تھے۔ اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے کہ ہر چیز کا پورا پورا لطف اٹھانا ان کا خاصہ تھا۔ آم یوں تو میٹھے ہوں اور بہت ہوں کریلے ہوں تو کڑوے ہوں۔ اِملی کے پھول ہوں تو ترش ہوں۔ شراب ہو تو ایسی تلخ کہ سینہ ریش ہوجائے۔ معاملاتِ عشق میں بھی لذت پرستی کا انداز موجود ہے۔

وداع و وصل جداگانہ لذتے دارد

ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

وصل و ہجر کا مزہ الگ الگ ہے۔ ضعیفی کے عالم میں شوق کی شدت نفاست میں تبدیل ہوگئی۔ خواہش تھی کہ اعلیٰ قسم کی شراب تھوڑی مقدار میں ہو اور عرقِ گلاب میں حل کر لی جائے اپنی اس مزاجی کیفیت کو یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوے اوست

آمیختن بہ بادۂ صافی گلاب را

مے نوشی کے معاملے میں "شراب قندیٔ ہندوستان" کی تندی کے شکوہ سنج ہیں کہ اس نے

نے تو میرا دماغ ہی جلا ڈالا۔ فتحِ پنجاب کے بعد جب انگریزوں کی عملداری ہوئی۔ تو امید بندھی کہ کشمیر کی ساختہ شراب انگوری آسانی کے ساتھ میسر آسکے گی۔ اسی بنا پر فتحِ پنجاب کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ شکوے شکایت کرنا تو شعرا کی طبیعتِ ثانیہ ہوتی ہے۔ لیکن اسی دیسی شراب سے مرزا غالبؔ کو عمر بھر کام رہا۔ اور بعض اوقات یہ بھی ہوا کہ کسی شاگرد نے اعلیٰ ذائقہ رکھنے والی دیسی شراب بھیجی تو پسندِ خاطر ہوئی اور خطوط میں اس کا ذکر مزے سے کر کرتے ہیں۔ تاہم ولائتی شراب کے بڑے دلدادہ تھے۔ ان دنوں ولائتی شراب غالباً آسانی کے ساتھ نہیں مل سکتی تھی۔ مالی حالات بھی اچھے نہ تھے۔ چنانچہ یہ حسرت مکاتیب اور اشعار میں جابجا ملتی ہے کہ انگریزی شراب اور اس سے بھی بڑھ کر فرانسیسی شراب ہاتھ آتی تو مزا ہوتا۔ غالبؔ کے نزدیک جنتِ نشاط یہ ہے کہ پینے کو ولائتی شراب ہو، اور پڑھنے کے لیے قدیم داستانوں کی جلدیں۔ تب وقت عیش و عشرت کے ساتھ گزر سکتا ہے۔ جہاں یہ فلسفۂ زندگی کام کر رہا ہو وہاں عشق کی صعوبتوں کو بار نہیں مل سکتا۔

حسن پرستی غالبؔ کا عمر بھر شعار رہی۔ عبدالرزاق شاکرؔ نے اپنی غزل بغرضِ اصلاح بھیجی تو اس میں ایک شعر تھا ؎

مردمِ چشمِ سیہ جب نظر آتا ہے ترا
بیٹھ جاتا ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

غالبؔ نے پہلے مصرعے کو یوں تبدیل کیا اور شعر نے یہ صورت اختیار کی ؎

نظر آتی ہے جہاں مردمکِ چشمِ سیاہ
بیٹھ جاتی ہے مرے دل میں سویدا ہو کر

اور یہ فقرہ اضافہ کیا کہ علی العموم دعویٰ حسن پرستی کا ہے تو بہتر۔ کہنے کو یہ ایک ذرا سی تبدیلی معلوم ہوتی ہے، لیکن اس سے غالبؔ کی حسن پرستی کا نظریہ پوری طرح سامنے آجاتا ہے یعنی خوبصورت چیزوں کے ساتھ ان کا لگاؤ محض وقتی ہوتا ہے۔ لیکن حسن کے ساتھ ان کا رابطہ ازلی و ابدی ہے۔ اسی بات کو اقبالؔ نے بانگِ درا میں "عاشقِ ہرجائی" کے عنوان سے یوں بیان کیا ہے ؎

گو حسینِ تازہ ہے ہر لحظہ مقصودِ نظر — حسن سے مضبوط پیمانِ وفا رکھتا ہوں میں
جستجوِ گل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے — حسن بے پایاں ہے دردِ لادوا رکھتا ہوں میں

اقبال کی یہ نظم ایک جرمن نظم سے مستعار ہے لیکن جس خیال کا اظہار اس نظم میں کیا گیا ہے۔ وہ اقبال کی طبیعت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ حسن پرستی کے معاملے میں غالب اور اقبال ایک ہی نظریے کے پیرو ہیں۔ یہاں انگریز رومانی شاعر جان کیٹس کے بعض مقولے مفیدِ مطلب ہیں۔ کیٹس اپنے زمانے کا مانا ہوا حسن پرست شاعر تھا

(۱) ہر حسین چیز ایک دائمی ذریعۂ مسرّت ہے (۲) حسن صداقت ہے اور صداقت حسن۔ (۳) حسن میں اوّلیت، قوّت میں اوّلیت کے مترادف ہے۔

یہی حال غالب کا ہے۔ ان کے بعض اردو اور فارسی اشعار فلسفۂ جمال کے کلیّے قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

ہے خیالِ حسن میں حسنِ عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا
نشۂ رنگ سے ہے واشُدِ گل — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں
ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے
صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اٹھائیے — طاقت کہاں کہ دید کا احساں اٹھائیے
عالم آئینۂ راز است چہ پیدا چہ نہاں — تابِ اندیشہ نہ داری بنگہ ہے دریاب
گر بہ معنیٰ نرسی جلوۂ صورت چہ کم است — خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاہے دریاب
وہی اک بات ہے جو یاں نَفَس، واں نکہتِ گل ہے — چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
اسد اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش — لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

حسن یوں تو فنا انجام ہے۔ اس لیے کہ حسن کا ہر مظہر کچھ عرصہ اپنی آب و تاب دکھا کر ماند پڑ جاتا ہے۔ لیکن اس معنی میں قائم و دائم ہے کہ روحِ حسن کوئی اور صورت یا پیکر اختیار کر لیتی ہے اور اس طرح سلسلہ قائم رہتا ہے۔ غالب کی وفاداری حسین پیکروں کے ساتھ تھوڑی مدت کے لیے ہو سکتی ہے لیکن روحِ حسن کے ساتھ ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ ہر چیز سے پورا پورا مزا لینا اور پوری شدّت کے ساتھ لطف اندوز ہونا غالب کا خاصہ تھا۔

غالبؔ کی تشبیہات

یہ موضوع اگرچہ بڑا ہی دلچسپ اور کشش انگیز ہے لیکن اس کے ساتھ انصاف کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں کہ بحث مختصر ہو۔ اور پورے مبحث کو چند سطروں میں سمیٹ لینے کی کوشش کی جائے۔ مختصراً غالبؔ کا قاری ان تشبیہات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو خصوصیت کے ساتھ غالبؔ کے اُردو کلام میں بکھری پڑی ہیں۔ یہاں ہماری مراد حسّی تشبیہات سے ہے۔ غالبؔ کو چمکدار رنگوں کے ساتھ اتنا شغف ہے کہ ان کے بے شمار اشعار میں ایک رنگینی کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں رنگینی کا لفظ ایک خاص مطلب ادا کرنے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ یعنی اشعار میں ایسی تشبیہات استعمال کی جائیں جن کا تعلق رنگوں کی دنیا سے ہو۔ ان تشبیہات کا بصری ہونا ضرور ہے۔ جیسے آگ، پھول، چاندنی، سبزہ ایسی تشبیہات کو بصری تشبیہات کہا جائے گا۔ موجوں کی روانی، بزمِ مے نوشی میں گردشِ جام محفلِ رقص میں رقاصہ کی حرکات وسکنات یہ سب بصری ہیں۔ اس کے برخلاف وہ آوازیں ہیں جو ہمیں متاثر کرتی ہیں۔ خواہ وہ مغنّی کی آواز ہو۔ یا کھلے میدان میں مینہ کی رم جھم، یا دریا میں موجوں کا نغمہ یا آلاتِ موسیقی کا ساز۔ ان سے ہمارے کان متاثر ہوتے ہیں۔ ایسی تشبیہوں کو سمعی کہا جائے گا۔ اسی طرح بعض تشبیہات کا تعلق لمس کے ساتھ ہے اور بعض کا شامہ کے ساتھ۔ غرضیکہ مختلف قسم کی کیفیات تشبیہوں کے ذریعے ادا کی جا سکتی ہیں۔ اب یہ شاعر کی اپنی نفسیات پر منحصر ہے کہ وہ کس قسم کی تشبیہات اپنے اشعار میں لاتا ہے۔ نفسیاتی لحاظ سے تشبیہات کے استعمال میں شاعر بے بس اور بے اختیار ہوتا ہے۔ جب جذبے کی گرفت ذہن پر سخت ہوتی ہے۔ تو تشبیہات خودبخود ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ ایک اضطراری عمل ہے۔ یا کم از کم بڑی حد تک اضطراری۔ اس کو اختیاری عمل کہنا مشکل ہوگا۔ شاعر کے ذہن پر اگر نظاروں کا اثر اتنا گہرا ہے کہ وہ جب بھی کہنا چاہے۔ بصری تشبیہات کا سہارا لینے پر مجبور ہو تو وہ سمعی تشبیہات کا استعمال نہ کر سکے گا۔ تاہم ایک خاص قسم کی ذہنیت اس کے برعکس ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں سمعی

تشبیہات کا استعمال ناگزیر ہوگا۔ اس قسم کی حسی تشبیہہ کو اگرچہ کوئی مخصوص نام نہیں دیا گیا ہے تاہم آسانی کی خاطر ہم اسے تمثال[1] کہہ کر پکاریں گے۔ تمثال کا لفظ ایک بامعنی اور بے ضرر سا لفظ ہے۔ ہر نوع کی حسی تشبیہہ کے لیے اسے آسانی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔ تمثال کا لفظ ایسا کوئی نیا لفظ بھی نہیں۔ میر اور غالب اپنے اشعار کے ذریعے اس لفظ کو لافانی بنا چکے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ حسی تشبیہہ پر اردو میں کچھ نہیں لکھا گیا۔ اسی لیے یہ ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی کہ اس سلسلے میں موزوں الفاظ کی تلاش کی جائے۔ انگریزی میں حسی تشبیہہ کو امیج (image) اور حسی تشبیہات کی صنعت کو امیجری (imagery) کہتے ہیں۔ یہاں یہ مسئلہ سامنے آجاتا ہے کہ آخر حسی تشبیہہ پر نقادوں نے کیوں توجہ نہیں کی۔ میرے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ اردو شاعری میں سب سے مقبول اور اہم صنف غزل کی ہے اور غزل میں حسی تشبیہہ کے لیے بہت کم گنجائش نکل سکتی ہے۔ غزل کا ہر شعر دو مصرعوں پر مشتمل ہوتا ہے اور ہر شعر اپنی جگہ ایک آزاد حیثیت رکھتا ہے۔ اگر حسی تشبیہہ قوی اور بھرپور ہو۔ تو پھر شعر میں اصل بات پر زور دینے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ ساری توجہ تشبیہہ پر صرف ہو جائے گی۔ اصل بات دھری کی دھری رہ جائے گی۔ اس کے باوجود میر اور غالب نے حسی تشبیہہ کا استعمال جا بجا کیا ہے۔ اور غالب تو اس باب میں ایک منفرد حیثیت کے مالک ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ تجربہ ایک حس سے متعلق ہوتا ہے۔ لیکن کمال چابک دستی سے شاعر کسی دوسری حسی تشبیہہ کے ذریعے اس تجربے کا اظہار کرتا ہے جیسے مومن اس شعر میں

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

یہاں تجربہ سمعی ہے اور تشبیہہ بصری ہے۔ گانا سن کر شاعر کا خیال شعلے کی طرف جاتا ہے۔ جو آنکھوں سے دیکھنے کی چیز ہے۔ کبھی یہ عمل پیچیدہ ہوتا ہے جیسا غالب کے ان اشعار میں ؎

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے ——— سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے
نشۂ ہا شادابِ رنگ و سازہا مستِ طرب ——— شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

---

[1] تمثال کے لیے میں پروفیسر اختر اقبال کمالی کا ممنون ہوں۔ کمالی صاحب نے طراز بمعنی پیٹرن بھی مجھے تجویز کیا۔ میرے خیال میں تمثال اور طراز کا استعمال کرنا اس سے بہتر ہے کہ امیج اور پیٹرن کو غلط طور پر اپنایا جائے۔

ایک جگہ اپنے جسمانی عوارض کو حسی تشبیہہ سے ظاہر کیا ہے ؎

دکھاؤں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے

مرا ہر داغِ دل اک تخم ہے سروِ چراغاں کا

غالب نے نئی تشبیہیں وضع کیں۔ ادھر غزل کی زبان کچھ ایسی بن کر رہ گئی ہے کہ جابجا مردہ تشبیہیں تیرِ ستم، گردشِ فلک وغیرہ زبان کا حصّہ بن گئی ہیں۔ اور مضامینِ غزل کچھ اس طرح سکّہ بند ہو کر رہ گئے ہیں کہ بالکل نئی تشبیہات غزل میں کچھ انوکھی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ مردہ تشبیہات (گردشِ فلک، تیرِ ستم وغیرہ) اب "تشبیہہ" کے طور پر استعمال نہیں کی جاتیں اب ان کی حیثیت "علامتی" ہو کر رہ گئی ہے۔ تاہم ایک زمانہ وہ بھی ہوگا۔ جب تیرِ ستم، خنجرِ نگاہ، نوکِ خار، زلفِ رسا وغیرہم کو ادائے معانی کی خاطر اور تشبیہہ کی حیثیت میں استعمال کیا جاتا ہوگا۔ بہر صورت یہ بات بالکل صاف ہے کہ نئی اور نادر تشبیہات کے لیے غزل میں گنجائش بہت کم ہے۔ یہ ایک الگ بحث ہے کہ وہ کونسی اصنافِ سخن ہیں۔ جن کے لیے حسّی تشبیہات موزوں ہیں۔ اس سلسلے میں یہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں آسکتا ہے کہ غزل کی بجائے (جو دو مصرعوں پر مشتمل مختلف المعانی اشعار کا مجموعہ ہوتی ہے)۔ مرثیہ قصیدہ، مثنوی وغیرہ ہیں (جو کثیر الاشعار اصناف ہیں۔ اور جن کے اشعار میں ربط و تسلسل موجود ہوتا ہے) حسّی تشبیہہ کے استعمال کی واقعی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ دوسری طرف یہ بات یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ایک عظیم فن کار ادائے مطالب کے لیے انوکھے سے انوکھا طریقہ اختیار کرے تو وہ بھی نبھ جاتا ہے اور انوکھا نہیں معلوم ہوتا۔ حسّی تشبیہہ شعر کے عمل تخلیق کے ساتھ وابستہ ہے۔ بڑا شاعر جو شعر کہنے بیٹھتا ہے۔ تو اس قسم کی تشبیہہ بے ارادہ یا با قصد کسی نہ کسی طرح ضرور اس کے ذہن میں آتی ہے۔ یہی حال غالبؔ کا ہے۔

غالب کو دیکھنے اور سننے چھونے اور چکھنے اور سونگھنے کے ذریعے لذّت پرستی کا ایک ایسا شوق تھا جو جابجا ان کے کلام میں حسّی تشبیہہ کا روپ دھار لیتا ہے۔ اوپر غالب کے اس شعر کا تجزیہ کر کے بتایا جا چکا ہے کہ ایک حس دوسری حس میں کیونکہ تبدیل ہو جاتی ہے ؎

نشّہ ہا شاداب رنگ و ساز ہا مستِ طرب   شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے

یہی عمل اگرچہ مومنؔ کے اس شعر میں بھی ہوتا ہے جس کی تشریح کی جاچکی ہے لیکن وہاں یہ عمل سادہ ہے۔ اوّل تو دیپک راگ ایک راگ کا مخصوص نام ہے اور مومنؔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور نغمے اور شعلے کو ایک دوسرے میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ دوسرے یہ تبدیلی کسی پیچ دار عمل کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ شعر کی سطح بھی کچھ ایسی بلند نہیں ہے۔ اس کے برعکس غالبؔ کے شعر میں یہ عمل پیچیدہ ہے۔ اسی قسم کا یہ شعر بھی ہے ؎

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا

اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

حسّی تشبیہہ پر مزید روشنی توضیحات کے سلسلے میں ڈالی جائے گی۔ غالبؔ کی حسّی تشبیہہ میں دو کیفیتیں ہیں۔ (۱) سرخ رنگ سے طبیعت کی مناسبت (۲) خیالات کا ارتفاع۔ آگ کے شعلے میں یہ دونوں کیفیتیں بیک وقت موجود ہیں۔ سرخی بھی ہے اور بلندی بھی۔ غالبؔ کی گرم گفتاری کو تشبیہات کی آتشیں کیفیت کے ساتھ مطابقت حاصل ہے۔ خون کی گرمی اور آگ کی گرمی پیمانۂ اشعار میں چھلک اٹھتی ہے۔ جب خیالات نرمی کی طرف مائل ہوں تو آگ اور خون کی بجائے گلاب کی سرخی ان کی توجہ کو کھینچتی ہے۔ سرخ رنگ کی درجہ بندی اشعار کے ذریعے ممکن ہے۔ بہت آتشیں کیفیت والے اشعار کو ایک درجے میں رکھا جاسکتا ہے اور دوسرے درجے میں وہ شعر آتے ہیں، جن میں ان کے گرم خون کا رنگ رواں ہے۔ پھر سرخیٔ گل کا نمبر ہے۔ اس کے علاوہ مختلف قسم کی حسّی تشبیہیں جن میں بصری زیادہ ہیں اور سمعی کم۔ اور کچھ لفظی بھی ہیں۔ ایک متفرق درجے میں رکھی جاسکتی ہیں۔

غالب کی انانیت

مرزا غالبؔ خود شناسی کی اس منزل پر فائز تھے جس میں انسان اپنے متعلق بڑے سے بڑا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے پوری طرح واقف ہوتا ہے چنانچہ اس دور میں جب زمانے نے ان کی قدر نہیں پہچانی تھی اور لوگ ان کے اشعار پر ہنستے تھے اور ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ غالبؔ کسی سے دب کر نہیں رہے اور انھیں یہ

احساس رہا کہ ایک نہ ایک دن دنیا ان کا لوہا مانے گی۔ آج جب ہم غالب کے اس قسم کے بلند آہنگ دعوے سنتے ہیں تو سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اس کی شخصیت اتنی پہلودار تھی۔ اور اس کی ذات ایسی مرجعِ صفات تھی کہ وہ اپنے متعلق جو کچھ دعوے بھی کرے اس کی بنیاد سچائی اور خودشناسی پر نظر آتی ہے۔ فارسی شاعری کے متعلق ان کا دعویٰ تھا کہ ان کے ہم وطنوں کو ان پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس سلسلے میں وہ یہ دلیل لاتے تھے کہ فارسی ان کی مادری زبان کی طرح ہے۔ اور انھوں نے فارسی کی تکمیل ملا عبدالصمد ہرمزد نامی ایرانی عالم سے کی ہے۔ یہ آخری بات امرِ واقع ہو یا نہ ہو۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مرزا غالب فارسی گویانِ ہند میں ایک منفرد اور عظیم شخصیت کے مالک تھے۔

اردو شاعری میں غالب کو اجتہاد کا درجہ حاصل تھا۔ فارسی میں، تو ان کا مقابلہ ان ایرانی شعرا کے ساتھ تھا۔ جو فارسی شاعری میں سند کا درجہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ یہاں مرزا غالب نے روایت سے رُوگردانی نہیں کی بلکہ روایت میں رہتے ہوئے یہ ثابت کرنا چاہا کہ وہ کتنے بڑے اور قادر الکلام شاعر ہیں۔ اردو میں وہ کسی کو اپنا حریف مانتے ہی نہ تھے۔ اردو شاعری کی روایت سے بھی وہ ابتدا میں رُوگردانی کر چکے تھے۔ اگرچہ پختہ مشقی کے دور میں وہ اُردو روایت سے پوری طرح ہم آہنگ نظر آتے ہیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ وہ اعلیٰ مضامین جو ان پر القا ہوتے ہیں جس طرح بھی اردو شاعری کے قالب میں سما جائیں۔ کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے۔ اُردو شاعری میں ایسے اعلیٰ مضامین موجود ہی نہ تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

منجملہ دوسرے شعرا کے نظیری اور بیدل اور ظہوری اوائلِ شباب میں غالب کے دل پسند شاعر تھے۔ اور ان میں سے بھی وہ ابتدا میں بیدل سے زیادہ متاثر ہوئے۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ دونوں کے سوچنے کا طریقہ بڑی حد تک یکساں تھا اور دونوں کے خیالات یکساں طور پر پیچیدہ بلکہ پیچ دار تھے۔ لیکن ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ نومشقی کا زمانہ گزر جانے کے بعد غالب بیدل کی گرفت سے آزاد ہو گئے[۱]۔ اور کسی کو تو وہ خاطر ہی میں کب لاتے تھے۔ عشقیہ رنگ

---

[۱] طرزِ بیدل سے پیچھا چھڑا لینے کے بعد بھی بیدل کے تصوّف سے غالب ہمیشہ متاثر رہے۔

کی شاعری میں نظیری کی وہی حیثیت ہے۔ جو مابعد الطبیعات، الٰہیات اور فلسفے میں بیدل کی ہے۔ چنانچہ غالب نے جا بجا نظیری کی تعریف کی ہے۔ لیکن حقیقی طور پر انھوں نے نظیری کی تقلید نہیں کی۔ یوں وہ اُردو میں میر کے پرستار اور ناسخ کے مداح بھی نظر آتے ہیں۔ لیکن میر کا رنگ غالب کے رنگ سے مختلف ہے۔ ناسخیت ضرور غالب کے لیے دلچسپی کا موجب ہوئی۔ جب ناسخ کا دیوان چھپ کر دلی پہنچا۔ تو مومن و غالب ناسخ کے طرزِ کلام سے کچھ نہ کچھ ضرور متاثر ہوئے۔ لیکن نہ اس حد تک کہ اسے تقلید قرار دیا جائے۔ مرزا غالب کی طبیعت ہی ایسی تھی کہ وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ انھیں اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔[1]

ہنگامہ ۱۸۵۷ء سے پہلے ہی غالب کی حیثیت ہندوستان بھر میں مانی جانے لگی۔ دلی کے اہلِ علم انھیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ ان کے شاگردوں کا سلسلہ دور و نزدیک پھیلا ہوا تھا۔ کیا ہندو کیا مسلمان کیا نواب اور راجے مہاراجے ان کے ہوا خواہ اور شاگرد برّصغیر پاک و ہند میں ہر جگہ موجود تھے۔ اردو اور فارسی شاعری کے علاوہ آلِ تیمور کے وقائع نگار اور آفرینشِ عالم سے مغل شاہنشاہ ہمایوں کے وقت تک حالات مرتب کرنے والے مؤرخ کی حیثیت میں بھی غالب ایک خاص اہمیت کے مالک تھے جو خاقانیِ ہند ذوق دہلوی کے حصے میں بھی نہ آئی تھی۔ مؤرخ کے علاوہ غالب کی ایک حیثیت مکتوب نگاری کی ہے۔ اُردو نثر کو غالب نے بہت کچھ دیا اور خط لکھنے کا ایک ایسا اسلوب نکالا۔ جو اپنی جگہ بالکل نیا تھا۔ پھر اگر غالب اپنی ذات پر فخر کرتے ہیں تو کچھ بے جا بھی نہیں ہے۔

غالب کی انانیت کا ایک نفسیاتی پہلو بھی ہے۔ امیرزادوں کی تربیت جس طرح ہوتی۔ اور ان کو پدرم سلطان بود اور ہم چوما دیگرے نیست کا سبق جس طور پر پڑھایا جاتا تھا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہی ہوتا تھا کہ وہ اپنے کو بہت کچھ سمجھتے تھے اور دوسروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ غالب کی رگوں میں ترک ایرانی خون تھا۔ ہندوستانی زوال آمادہ معاشرے سے ان کا تعلق ایک پشت کا تھا۔ کچھ بہت پرانا نہ تھا۔ وہ اپنے کو ایک شہزادہ تصوّر کرتے تھے۔ یوں بھی وہ ایک مہم جو طالع آزما خاندان کے فرد تھے۔ اور اپنے سلسلے میں وہ پہلے شخص تھے جس نے

---

[1] اس کے برخلاف مومن نے ناسخ کا اثر قبول کیا۔ ناسخ اور مومن کے کلام میں مماثلت ہے۔

تلوار میان میں رکھی اور قلم ہاتھ میں لیا۔ اب قلم سے ان کو وہی کام لینا تھا جو ان کے باپ دادا تلوار سے لیتے آئے تھے۔ یعنی اپنا لوہا منوانا تھا۔ سو اس میں وہ کامیاب ہو گئے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

گہر از رایت شاہانِ عجم بر چیدند
بعوض خامۂ گنجینہ فشانم دادند

افسر از تارکِ ترکانِ پشنگی بردند
بہ سخن ناصیۂ فرِّ کیانم دادند

غالبؔ جیسا قادر الکلام شاعر بلکہ ہمہ داں جب عُسرت کے عالم میں بسر کرے۔ تو اسے اپنے نسلی امتیاز اور اپنی شاہانہ وراثت کا احساس بڑھ جانا نفسیات کی روشنی میں قرینِ قیاس ہے۔ ایسا شخص نرگسیت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یعنی اپنی ذات کی محبت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ سوچتا ہے کہ میں بھی کتنا جوہر قابل ہوں۔ لیکن افسوس ناقدر شناس زمانہ میرے ساتھ آمادۂ پیکار ہے [۱]۔ پھر یہ سوچ کر ایسے شخص کو تسکین ملتی ہے کہ ہر زمانے میں عظیم ہستیوں کے ساتھ زمانے کا سلوک ایسا ہی رہا کیا ہے۔ امرِ الٰہی کے آگے سوائے صبر کے چارہ کار ہی کیا ہے۔ غالبؔ کے علاوہ میرؔ کے ہاں بھی یہی احساس ملتا ہے۔ میرؔ بھی اپنے کو یگانۂ روزگار خیال کرتے تھے۔

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

اور ہمارے دَور میں اقبالؔ نے بھی یوں ہی محسوس کیا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

رومانی جینئس کی نفسیات یہی ہے۔ انگریز شعرا میں شیلؔی (Shelley) اپنی ذات کی محبت میں اسی طرح سے گرفتار تھا۔ غالبؔ کی طرح شیلؔی بھی ناقدریٔ زمانہ کا شکوہ سنج رہا۔ اُسے بھی اس عالم کون و فساد میں تسکین ملتی تھی۔ تو فلسفیانہ خیالات اور رومانی تصوّرات کی دنیا میں لیکن غالبؔ کی شخصیت بہت عظیم تھی۔ میرؔ کی طرح غالبؔ نے مصیبتوں کو جھیلنے اور صدمے اُٹھانے کی استقامت حاصل کی۔ بلکہ غالبؔ کی شخصیت میں ہوش مندی کا عنصر اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ اُسے اپنی ذات کا علم اور اپنی صلاحیتوں سے

---

[۱] حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

پوری طرح واقفیت تھی۔ یہاں دو باتیں قابلِ لحاظ ہیں۔ ہر چیز پر حتیٰ کہ اپنی ذات پر ہنسنے کی عادت۔ مزاح و بذلہ سنجی میں اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ غالب کمال کے ہوشمند تھے[1] اس کے علاوہ عقلیت اور جذبے کو عقل کی روشنی میں پرکھنے کی عادت بھی ہوش مندی کی دلیل ہے۔ چنانچہ ہم نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ایک طرف تو غالب کو اپنی عظمت کا پوری طرح احساس تھا۔ دوسری طرف اُن میں غیر معمولی قوتِ برداشت تھی۔ کسی حالت میں وہ عقل کا دامن ہاتھ سے نہ دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ان جیسا جامع الصفات انسان روز روز پیدا نہیں ہوتا ؎

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ — چوں من از دودۂ آذر نفساں برخیزد
یارب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے — لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

انانیت کا یہ عالم تھا کہ قمار بازی کے جرم میں پکڑے جاتے ہیں۔ لیکن سمجھتے ہیں کہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ قید خانے کے در و دیوار سجائے جا رہے ہیں کہ غالب نامور آرہا ہے۔ ترکیب بند زندانیہ فخر و مباہات سے لبریز ہے۔ ساتھ ہی ندامت سے پانی پانی بھی ہوئے جا رہے ہیں۔ بلکہ سوچتے ہیں کہ کہیں دور چلے جائیں۔ کسی اور ملک کو ہجرت کر جائیں۔ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے۔ مگر کیا خبر موت کب آئے۔ اور کتنے دن زندگی کی ذلت سہنی پڑے۔ غرضکہ غالب کا ذہن گوناگوں مختلف و متضاد تصورات کا ایک رنگین نگارخانہ تھا۔ اپنی یکتائی اور حریفوں کی کمتری کا احساس غالب کا ایک بنیادی احساس ہے جو ان کے فارسی اور اردو کلام میں اور ان کے مکاتیب میں بار بار ملتا ہے۔ یہ احساس نفسیات کی روشنی میں احساسِ کمتری کا ایک نتیجہ ہے۔ اصل صورتِ حال یہ تھی کہ غالب کے دَور میں غالب کی قدر عمر کے آخری حصے بلکہ تقریباً ۱۸۵۰ء کے بعد سے لے کر آخر دم تک یعنی کم و بیش بیس سال کا زمانہ چھوڑتے ہوئے بالکل نہ ہونے کے برابر تھی۔ لیکن آج ہم غالب کی قدر و منزلت سے پوری طرح واقف ہیں اور یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ غالب اپنے دور کے عظیم ترین ادیب و شاعر تھے۔ ان کے زمانے میں ان کی صحیح قدر دانی ہوتی

[1] ہنسنے ہنسانے اور طنز کرنے سے تنقیۂ جذبات نہ ہوتا تو غالباً ذہنی توازن برقرار نہ رہ سکتا۔

تو غالباً ان کے مزاج کی کیفیت بدل جاتی۔ پھر انھیں اپنی عظمت کا دعویٰ کرنے اور اپنے حریفوں پر طنز کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

دربارداری اُس زمانے کے امرا کا دستور تھا۔ جب فرسودہ نظام آخری سانس لے رہا تھا۔ اور زمانہ ایک نئی کروٹ لینے والا تھا۔ ایسے زمانے میں غالب جیسا عظیم انسان اور مردِ ہوش مند شاید اپنے کو کسی دربار کا متوسّل قرار دینا پسند نہ کرتا۔ اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ منصب اور خلعت اور کرسی کے لیے غالبؔ کی ہوس بے پناہ تھی۔ یہاں بھی وہی جذبہ کارفرما نظر آتا ہے کہ وہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لیے اور اس دَور کے معاشرتی معیار کے مطابق اپنی بلندی ثابت کرنے کے لیے کسی نہ کسی دربار سے منسلک رہنا چاہتے تھے۔ یہ اعزاز ہر کسی کو کہاں ملتا ہے کہ انگریز حکام انھیں کرسی دیں۔ اور دربارِ مغلیہ میں انھیں ایک بلند مقام حاصل ہو۔ شاہی محل میں ان کی پہنچ ہو۔ شاہزادے ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کریں۔ رامپور کے نواب ان سے اپنے کلام کی اصلاح کرائیں۔ اور جب ان پر الزام لگایا گیا کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے دوران ان کا تعلق سرکارِ انگریزی کے دشمنوں سے رہ چکا ہے۔ یہاں تک کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے لیے سکّہ کہہ کر دیا ہے[۱] اور اس الزام کے پیشِ نظر اُن کا دربار بند ہو گیا۔ تو غالبؔ دستِ تاسف ملتے نظر آتے ہیں اور اپنی برتریت ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتے۔ یہاں تک کہ انھیں دوبارہ دربار میں کرسی مل جاتی ہے۔ تب کہیں جا کر وہ مطمئن ہوتے ہیں۔ بلاشبہ غالبؔ اپنی قدر و منزلت سے آگاہ تھے۔ وہ مغل بادشاہ اور انگریز حکام کو کیا خاطر میں لاتے ہوں گے۔ لیکن یہ بھی ان کی انانیت کی تسکین کا ایک ذریعہ تھا۔

اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ غالبؔ اس معنی میں محبِّ وطن نہ تھے۔ جس معنی میں سیاسی شعور کے ارتقا کی بنا پر آج ہم کسی کو محبِ وطن کہہ کر پکارتے ہیں۔ دلّی میں ہنگامہ برپا تھا لیکن غالبؔ کو صرف یہ غم تھا کہ انھیں پینے کو شراب میسر نہیں آتی۔ اور چلنے پھرنے پر پابندی ہے بالفاظِ دیگر غالبؔ اپنی ذات میں غلطاں و پیچاں رہتے۔ دوسروں پر جو کچھ بیت رہی تھی۔

---

[۱] یہ شعر غالبؔ سے منسوب ہے ؎ بزر زد سکّہ کشور ستانی
سراج الدین بہادر شاہِ ثانی

اس کی انھیں کوئی خاص پروانہ تھی۔ یوں تو شاعر حد درجہ حساس ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ اسلامی حکومت کے خاتمے اور ہندوستان کی عالمگیر تباہی سے غالب متاثر نہ ہوئے ہوں لیکن غالب ایک رندِ حال مست تھے۔ وہ اپنی ذات کو مرکزِ کائنات سمجھتے تھے۔ نفسیات کی رُو سے غالب کی سی شخصیت رکھنے والا اپنے کو انسانیت کا نمائندہ اور کائنات کا مرکز تصوّر کرتا ہے۔ اسی لیے ان کے خطوط میں ہنگامہ ۱۸۵۷ء کا ردِّ عمل بڑی حد تک ذاتی نظر آتا ہے۔ جو کچھ خود ان پر بیتی وہ اسی کا ماتم کرتے ہیں۔ ذرا آگے بڑھے تو قریبی عزیزوں کے متعلق سوچنے لگتے ہیں۔ شاذ و نادر احباب کا خیال آجاتا ہے۔

اول تو غالب کی نفسیات اس قسم کی تھی اور پھر وہ زمانہ بھی ایسا تھا کہ فرد اور معاشرے میں کوئی گہرا ربط نہ تھا۔ اس لحاظ سے ہمارے زمانے میں اور غالب کے زمانے میں بڑا فرق ہے۔ پچھلی ایک صدی میں سلسلۂ رسل و رسائل کی ترقی کی بدولت فاصلوں پر عبور، جمہوریت کی تعلیم اور سیاسی حقوق کی جدوجہد، قومیت کا احساس اور اسی طرح کے دوسرے اہل فرد اور معاشرے کے ربط کو بڑھانے میں ممد ثابت ہوئے ہیں۔ وہ دَور ایسا نہ تھا۔ جاگیردارانہ نظام تھا۔ زوال آمادہ معاشرہ رسل و رسائل کا سلسلہ قدیم طرز کا تھا۔ خود غالب ہندوستان میں اپنے کو ایک حد تک اجنبی خیال کرتے تھے۔ ان کے خاندان کو ہندوستان میں آئے کوئی طویل عرصہ نہ گزرا تھا۔ اور اس ملک کی روایات ان کی طبیعت میں پوری طرح رچی بسی نہیں تھیں پھر کیا تعجب کہ وہ حال مست تھے۔ مدافعت کے لیے انھوں نے اپنے چاروں طرف تصورات کا ایک تانا بانا بن رکھا تھا یعنی اپنی عظمت پر ناز، دوسروں پر فوقیت کا احساس، وراثت پر فخر و مباہات۔ شاعری میں اپنے کو دوسروں کے لیے سند کا درجہ دینا۔ یہ سب کچھ ایک ایسے ہی شخص کے لیے ممکن ہے۔ جو اپنے کو دوسروں سے الگ دیکھتا ہو۔ اور خود اپنی ذات میں گم ہو۔ غرضکہ غالب کی کائنات ان کی اپنی ہستی تھی۔

آہنگِ تضاد

ایک طرف تو غالب کی وہ شگفتہ نگاری ہے۔ جس سے ان کا دیوان بھرا ہوا ہے۔ اور دوسری جانب وہ پریشان حالی جس کا ثبوت ان کے مکاتیب مہیّا کرتے ہیں۔ قاری اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ غالب بیک وقت دو کیفیتوں سے سرشار رہتے تھے۔ رنگینی اور شگفتگی ان کے مزاج کا ایک حصّہ بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن غم پسندی انھیں قسمت سے ملی تھی۔ ممکن ہے کہ وہ دیدہ و دانستہ غموں سے لذّت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوں۔ رومانی شخصیت

کا ایک میلان یہ بھی ہے۔ اور پھر غالبؔ تو بڑے لذت پسند تھے۔ تلخ و ترش و شیریں ہر مزے کا الگ چسکا رکھتے تھے اور "وداع و وصل جداگانہ لذّتے دارد" کے قائل تھے۔ پھر وہ اپنی طبیعت پر اتنا قابو رکھتے تھے کہ تکلیف کو ہنس ہنس کر سہہ لیں اور دیکھنے والا ان کے ماتھے پر بل بھی نہ دیکھے۔ خط و کتابت ایک بے تکلّف ذریعۂ اظہارِ احساسات ہے۔ اسی لیے وہ اپنے نجی خطوط میں اپنی پریشانیوں کا رونا روتے ہیں۔ مگر جب شعر کہنے بیٹھتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ان سے زیادہ رنگین طبع اور شگفتہ نگار کوئی ہے ہی نہیں۔ اس کی ایک بہت اچھی مثال ان کے جیل جانے پر اپنے تجربات کے اظہار میں سامنے آتی ہے۔ اور دوسری طرف اصل واقعہ یوں بیان کرتے ہیں ؎

جس دن سے کہ ہم غم زدہ زنجیر بہ پا ہیں　　کپڑوں میں جوئیں بخیے کے ٹانکوں سے سوا ہیں

یعنی ایک طرف حقیقتِ حال کا اعتراف اور دوسری جانب اپنی عظمت کا احساس۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے باب میں غالبؔ کے خطوط کیا ہیں، رنج و محن کا ایک دفتر ہے۔ لیکن غالبؔ کے فارسی اُردو کلام میں ایک آدھ قطعے اور دو چار اشعار کو چھوڑ کر' واشگاف لفظوں میں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کا ذکر یا تو ملتا نہیں۔ یا ملتا ہے تو اس شان سے گویا انگریزوں کی فتح خود مرزا غالبؔ کی فتح ہے۔ . . . . خطوط میں بار بار باغیوں کے ساتھ اپنی بے تعلقی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ یہ وہی غالبؔ ہیں جو ایک مدت تک قلعے سے منسلک ہونے کے خواہش مند رہے اور ۱۸۵۰ء کے بعد جب قلعے سے وابستہ ہو گئے۔ تو پھولے نہ سماتے تھے۔ مگر ۱۸۵۷ء کے بعد کبھی بھولے ہی سے بادشاہ کا ذکر ان کے قلم سے نکلتا ہے۔ اس کے باوجود شخصی طور پر جو افتاد غالبؔ پر ان دنوں پڑی مکاتیبِ غالبؔ میں اس کی پوری شہادت موجود ہے۔ بین السطور جھانکے بغیر ایک سرسری جائزہ لیا جائے تو بیشتر یہی احساس ہوتا ہے کہ ملک کی تباہی کا ان کو اتنا رنج نہیں جتنا ذاتی پریشانیوں کا ہے ؎

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے　　کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

بسکہ فعّالِ ما یرید ہے آج　　ہر سلحشور[۱] انگلستان کا

۱؎ سلحشور اکڑ دکھانے والا۔ ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے دوران میں گورے سپاہی جو شہر دہلی پر قابض تھے۔ اپنی اکڑ فوں دکھاتے ہوں گے اور اپنے کو فرعونِ بے سامان سمجھ کر جو جی میں آتا ہوگا کر گزرتے ہوں گے۔

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جاسکے یاں کا

ہاں دلّی کے لٹنے کا ماتم اور عزیزوں دوستوں کی تباہی کا غم بار بار کرتے ہیں اور درد دل کے ساتھ کرتے ہیں۔ بظاہر اس طرزِ عمل میں بھی وہی تضاد نظر آئے گا جو غالب کی غم پرستی اور لذّت پسندی میں ہے لیکن شخصیت کے پیمانے سے جانچا جائے تو یہ سارے تضاد مٹ جاتے ہیں۔ غالب کی شخصیت کو پیمانہ بنا کر دیکھیں تو تضاد تضاد نہیں رہتا۔ وہ ہر معاملے کو اپنے احساس کے آئینے میں دیکھتے ہیں اور ہر چیز پر رنگین شیشے کے ذریعے نظر ڈالتے ہیں۔ یہ رنگین شیشہ ان کے احساسات کا ہے۔ بہت بڑی اور پہلودار شخصیت انانیت کی مظہر ہوتی ہے۔ غالب کے ساتھ بھی یہی صورت تھی۔ اوّل تو ان کی شخصیت پہلودار اور عظیم تھی دوسری طرف انھیں اپنی شخصیت کی پہلوداری اور عظمت کا گہرا احساس تھا۔ نزاکتِ طبع کا یہ عالم تھا کہ مرزا تفتہؔ اپنے دوسرے دیوان کے لیے تقریظ طلب کرتے ہیں۔ تو جھنجھلا اٹھتے ہیں کہ تمھارا کیا ہے۔ تم تو ہر دوسرے تیسرے برس ایک دیوان تیار کرلوگے، میں کہاں تک تقریظیں لکھتا پھروں گا۔ نواب علاؤالدین خان علائی کو لکھتے ہیں :-

"مکرّر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں۔ کونسی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج۔ قصیدہ بھیج۔ معنی اس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے۔ اب کے تو مکرر بھیجے گا۔ بھائی قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم، پاژند کی قسم، استاد کی قسم، گرد کے گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس قصیدہ نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔"

مرزا ہرگوپال تفتہؔ اور نواب علاؤالدین علائی کو غالب مثل اپنے عزیزوں کے عزیز رکھتے تھے۔ لیکن طبیعت کی جھلاہٹ انھیں اس قسم کی زبان استعمال کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ جس کی مثالیں اوپر دی گئی ہیں۔ تفتہؔ نے تو کم از کم کچھ لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ غریب علائی کا قفط

اتنا قصور تھا کہ انھوں نے قصیدہ و رباعیات نقل کرنے کی زحمت دینی چاہی تھی۔ دراصل غالب اپنے دور سے اتنے بلند تھے کہ وہ دوسروں کے احساسات، زمانے کے حالات، قومی و ملّی معاملات، سب سے زیادہ اپنی پروا کرتے تھے۔ اور اپنی ذات میں یوں گم تھے۔ گویا ان کی ذات ان کے لیے ایک عالم ہے۔ کلامِ میر کے مطالعہ سے بھی ایک ایسی ہی شخصیت اُبھرتی ہے میر بھی غالب کی طرح حال مست تھے اور اپنے عالم میں خود ہی گُم رہتے تھے۔ میر کو بھی اپنی عظمت کا پورا احساس تھا۔

ہم نے غالب کی شخصیت پر بحث کرتے وقت ان کی جن خصوصیات کو نظر میں رکھا ہے وہ قابلِ لحاظ ہیں :۔

(۱) لذتیت۔ جس میں ان کی حسن پرستی اور نشاط پسندی شامل ہیں۔ عشق کی سپردگی سے غالب کا کوئی خاص تعلق نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) انانیت۔ یعنی اپنی ذات کو معیار اور پیمانہ قرار دے کر کائنات کی تفسیر کرنا۔ یہی انانیت یا خود پرستی مریضانہ کیفیت اختیار کرلے تو "نرگسیت" اور خود ترحمی میں تبدیل ہوجاتی ہے

(۳) طنّازانہ بصیرت۔ زندگی، کائنات، اور خدا کو ایک طنّاز کی نگاہ سے دیکھنا اور اپنی ذات کو بھی نہ بخشنا بلکہ خود کو اپنے طنز کا نشانہ بنا کر تسکین حاصل کرنا۔ تدبیر و تقدیر پر ہنسنا۔

(۴) شائستگیٔ غم یعنی غم کی حقیقت سے آشنا ہو کر نشاطیہ کیفیت میں ڈوب جانا۔ نشاطِ غم اور غمِ نشاط کا رنگ غالب کی شاعری کا جوہر ہے۔

(۵) فعالیت۔ یعنی ایک جرأتِ رندانہ جو ان کی بھرپور شخصیت سے جھلکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسے اُس انفعالیت کے مقابلے پر رکھا جاسکتا ہے۔ جسے عام طور پر میر سے منسوب کیا جاتا ہے (قطع نظر اس سے کہ یہ نظریہ کس حد تک درست ہے)

(۶) احساس کی گرمی اور رنگینی۔ جو ان کی حسی تشبیہات میں نظر آتی ہیں۔ خون میں حدت ہے اور ہر طرف سرخ رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔ ان سرخیوں میں بھی فوقیت آتشیں رنگ کو ہے یوں ہونے کو شراب کی سرخی بھی ہے۔ اور گلاب کی سرخی بھی اور خون کی سرخی بھی۔ آگ غالب کا تخیلی محور معلوم ہوتی ہے۔

(۷) عقلیت - یعنی جذبے کی شدت میں بھی عقل کی گرفت غالبؔ کے ذہن پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہتی ہے۔ سستی جذباتیت کی رو میں بہنا غالبؔ کا کام نہیں۔ فلسفیانہ خیالات سے گہرا لگاؤ بھی اس امر کی شہادت ہے۔ کاروبارِ زندگی ہو یا کاروبارِ عشق، غالبؔ سمجھ بوجھ کا ثبوت دیتے ہیں۔

یہاں غالبؔ کی خصوصیات کی فہرست گنوانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ یہ سات خصوصیتیں ایک حد تک آپس میں مربوط ہیں۔ مگر یہ سات عنوانات قطعی نہیں۔ البتہ غالبؔ کی شخصیت کو سمجھنے میں مدد ضرور دے سکتے ہیں۔ مربوط ہونے کے ساتھ ساتھ ان خصوصیات کے عناصر ایک دوسرے سے مختلف بلکہ متضاد بھی معلوم ہوتے ہیں۔ دراصل غالبؔ کی شخصیت اتنی پہلو دار ہے کہ اس میں تضاد کا احساس ہونا امرِ فطری ہے۔ شخصیت کیا ہے۔ ایک ترشا ہوا نگینہ ہے جس کے بے شمار پہلو ہیں۔ رومانی نقطۂ نظر سے شخصیت کو جانچنے کا ایک پیمانہ یہ ہے کہ تضاد میں آہنگ ڈھونڈا جائے۔ کالرج نے رومانیت کو آہنگِ تضاد کہہ کر پکارا ہے۔ یہی اصول اگر رومانی شخصیت پر منطبق کیا جائے۔ تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ غالبؔ کی شخصیت متضاد خصوصیات پر مشتمل ہے۔ لیکن اس تضاد میں ایک آہنگ ہے۔ شخصیت کا سب سے بڑا تصور ذاتِ باری سے منسوب ہے۔ خدا عادل بھی ہے اور رحیم بھی ہے، جابر بھی ہے اور قاہر بھی ہے۔ غرضکہ گنتے چلے جائیے۔ یہ کہنا مشکل ہوگا کہ خدا کیا نہیں ہے۔ اور یہ دعویٰ کرنا ممکن رہے گا کہ خدا یہ بھی ہے اور وہ بھی ہے۔ جبھی تو ہم ملا جلا کر یہ کہتے ہیں کہ خدا سب کچھ ہے۔ یعنی وہ جو تصور کرتے ہیں۔ اور وہ بھی جو ہمارے تصورات سے بالا ہے۔ اب ہم انسانی شخصیت پر نظر ڈالتے ہیں۔ ذاتِ باری کا جیتا جاگتا نمونہ اگر ہے تو آدمی جو شاہکارِ فطرت ہے۔ اور اسے اشرف المخلوقات کہا گیا ہے۔ ذاتِ باری تو خیر ذاتِ مطلق ہے۔ اور اس لحاظ سے سب کچھ ہے لیکن انسانی عظمت کو بھی اسی طرح پرکھا جا سکتا ہے کہ اس میں کتنی خصوصیات مجتمع ہیں۔ جتنی زیادہ خصوصیات ہوں گی۔ اتنی ہی شخصیت ذاتِ مطلق کی آئینہ دار کہلائی جا سکے گی۔ ذاتِ باری آہنگِ تضاد ہے۔ انسانی شخصیت کے بلند ترین نمونے بھی ذاتِ باری ہی کے آئینے

ہیں۔ اگر ہم کوئی ایسا پیمانہ وضع کرسکیں جس کے ذریعے یہ سمجھ میں آسکے کہ سارے تضاد ملائے بھی جاسکتے ہیں اور ایک وحدت قائم کی جاسکتی ہے تو گویا ظاہری تضاد درحقیقت تضاد نہ رہیں گے اس اصول کو انسانی شخصیت پر بھی منطبق کرکے دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر ہم یہ تسلیم کرلیں کہ غالبؔ کی شخصیت ایک ہمہ جہت شخصیت تھی۔ (اور یہ تسلیم کرلینے میں بظاہر کوئی قباحت نظر نہیں آتی) تو غالبؔ کی شخصیت میں آہنگِ تضاد دریافت کیا جاسکتا ہے۔ پھر ہم یہ نہ کہہ سکیں گے کہ غالبؔ کی شخصیت متضاد خصوصیات کی حامل تھی۔ بلکہ یہ سارے تضاد مل جل کر ایک وحدت کی شکل اختیار کرلیں گے۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ غالبؔ کی شخصیت کے عناصر اس قدر مختلف اجزا سے مل کر مرتّب ہوئے ہیں کہ اُن میں آہنگ کی تلاش غیر ضروری ہے۔ میں یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تیل اور بتّی اور مٹّی کا دیولا کتنی مختلف الاصل چیزیں ہیں! ان میں قطعاً کوئی جزوِ مشترک نہیں۔ لیکن شعلہ دکھانے کی دیر ہے۔ یہی مختلف الاصل چیزیں ایک وحدت اختیار کرلیتی ہیں۔ جینئس کا شعلہ شخصیت کے لیے آہنگ اور وحدت کا پیغام ہوتا ہے۔ غالبؔ کے فکر وفن پر غور کرتے وقت یہ مسئلہ پھر سامنے آئے گا تو ہم دیکھیں گے کہ فکر وفن کے بکھرے ہوئے متضاد و مختلف اجزا میں بھی اسی طرح آہنگ اور وحدت موجود ہے۔

(۳)

غالبؔ، فکر وفن کے آئینے میں

غالبؔ کی شاعری کے تین دَور

غالبؔ کے اردو کلام کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ پہلا حصّہ کلامِ غالبؔ کا وہ ہے۔ جس میں خیال پیچیدہ ہے۔ ترکیبیں ادق ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کسی ایرانی نژاد شاعر کا کلام ہے۔ افعال وضمائر اردو ہیں اور باقی پورا شعر فارسی کا ہے۔ توالی اضافات سے قطع نظر خیال کی پیچیدگی کا یہ عالم ہے کہ مطلب قاری پر کھلتا ہی نہیں۔ نزاکتِ تخیل کا یہ حال ہے کہ مضمون سے مضمون پیدا کرتے چلے جاتے ہیں

پھر بھی پتہ نہیں چلتا کہ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ بعض اشعار پر سہل ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ قاری اگر منصف مزاج ہو تو سوچ میں پڑ جاتا ہے کہ اگر یہ اشعار غالبؔ جیسے بلند مرتبہ شاعر کے نہ ہوتے تو کوئی ان کی طرف توجہ بھی نہ دیتا۔ اس کے باوجود اس قسم کے اشعار میں خاصی تعداد ایسے اشعار کی ہے۔ جو کسی نہ کسی خوبی کی وجہ سے قابلِ تعریف قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ تشبیہیں اور استعارے توجہ طلب بلکہ کشش انگیز ہیں۔ چنانچہ خیال ہوتا ہے کہ زبان سے قطع نظر جہاں تک تخییل کا تعلق ہے' یہ اشعار نہایت ہی بلند ہیں۔ ایسے خیالات کو غالباً آسان زبان میں ادا ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ غالبؔ کی طبیعت بلا کی مشکل پسند ہے۔ وہ آسانی کے ساتھ ہلکے پھلکے خیالات کا اظہار اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتے ہیں۔

جب غالبؔ کی شاعری ترقی کرتی ہے تو انھیں اظہارِ مطالب کے اسلوب مل جاتے ہیں۔ اور اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کا سلیقہ ہاتھ آجاتا ہے۔ یہ غالبؔ کی شاعری کا دوسرا دور ہے۔ نومشقی کا دَور ختم ہو چکا ہے۔ اعلیٰ خیالات کو ایک زیرِ تکمیل زبان میں ادا کرنا بڑا مشکل کام ہے لیکن غالبؔ زورِ بیان کے بل بوتے پر اس مشکل سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ غالبؔ کے خیالات بلند، عمیق اور نازک ہوتے ہیں۔ ایسے خیالات کے لیے الفاظ کے سانچے تلاش کرنا غالبؔ ہی کا کام تھا۔ پامال عامیانہ رسمی مضامین کو چٹخارے دار زبان میں ادا کرنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ غالبؔ سے پہلے اور غالبؔ کے بعد یہ عام طور پر ہوتا رہا ہے کہ مروّجہ خیالات کو چٹخارے دار زبان میں پیش کر دیا گیا۔ لیکن غالبؔ نے ایسا نہیں کیا۔ جہاں انھیں الفاظ کے بنے بنائے سانچے ہاتھ نہیں آئے۔ وہاں انھوں نے اپنی قوتِ ایجاد سے کام لیا اور نئی نئی ترکیبیں تراش کر اپنا مطلب ادا کیا۔ اسی لیے اس دور کی شاعری میں بھی مشکل پسندی کا رجحان قائم رہتا ہے۔ توالیِ اضافات کا یہ عالم ہے کہ گماں ہوتا ہے کہ شاعر کو فارسی زبان پر پورا عبور حاصل ہے اور جہاں ضرورت پڑتی ہے۔ وہ فارسی زبان کا سہارا لے کر اپنی بات کہہ دیتا ہے۔ اس دور کی شاعری غالبؔ کے طرزِ شعر کی نمائندہ ہے۔ غالبؔ جب اپنے حسنِ بیان پر فخر کرتے ہیں تو ان کے ذہن میں اسی دورِ شاعری

کے نمونے ہوتے ہیں۔

غالب کی شاعری کا تیسرا دور وہ ہے۔ جب ان کا کلام سادگی میں میر یا درد یا مصحفی سے ٹکر لینے لگتا ہے۔ یہ غالب کی شاعری کا آخری دور ہے۔ زبان کی سلاست، بندش کی چستی اور اظہارِ خیال پر قدرت اس دور کی شاعری کی خصوصیات ہیں۔ غالب نے جو غزلیں اس زمانے میں کہیں۔ وہ مقبول خواص و عوام ہیں۔ اور ان پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس کے باوجود یہ احساس بھی قاری کے دل میں ضرور پیدا ہوتا ہے کہ خیالات کی بلندی کے اعتبار سے اس دَور کی غزلیں پچھلے دَور کی غزلوں کے مقابلے میں کم مرتبہ ہیں یعنی ان میں وہ خصوصیات پوری طرح موجود نہیں۔ جو غالب کو غالب بناتی ہیں اور دوسرے شعراُ سے ممیّز کرتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر تھک چکا ہے اور زبان پر قادر ہونے کے باوجود تازہ خیالات تک اُس کی رسائی اب نہیں رہی ہے۔ لہجہ بھی غم آلود ہے۔ اس کے باوجود غالب کی ان غزلیات میں مقبولِ عوام ہونے کی صلاحیت ملتی ہے۔ غالب عوام کے دلوں تک رسائی حاصل کرتے ہیں تو انھی غزلوں کے ذریعے۔ یہ ان کی عمر کا وہ دور ہے جب اُردو ان کے لیے اوڑھنا بچھونا تھی۔ فارسی میں شعر کہنا تقریباً بند کر چکے تھے[1]۔ خط و کتابت کا ذریعہ بھی اُردو ہی تھی۔ اُردو کے مشہور شعرا ذوقؔ و مومنؔ وغیرہم یا تو مر چکے تھے یا اپنی عمر کے آخری دَور میں تھے۔ اب غالب کا شمار مغتنماتِ روزگار میں ہوتا تھا۔ اور انھیں اس زمانے کے بہترین اردو شعرا میں شمار کیا جاتا تھا۔ ان خطوط پر کلامِ غالب کو تین حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ قطعیّت کے ساتھ پھر بھی نہیں کہا جا سکتا کہ کونسی غزل پہلے دَور کی ہے یا دوسرے دور کی۔ دوسرے دور کی ہے یا تیسرے دور کی۔ دراصل ادب میں قطعیت کی جگہ نہیں ہے۔ بعض اشعار پر بربنائے مشکل پسندی گماں ہوتا ہے کہ دورِ اوّل کے ہوں گے۔ تاہم اندازِ بیان میں بعض ایسی خصوصیات بھی نظر آتی ہیں۔ کہ ان پر دوسرے دورِ شاعری

---

[1] ۱۸۵۰ء کے بعد فارسی سے ہٹ کر توجہ اُردو پر مرکوز ہو گئی تھی۔ فارسی میں قصاید ضرور کہے گا مگر کم۔ غزلیں غالباً بالکل نہیں کہیں نہ خط لکھے۔ غزلوں اور مکاتیب کی زبان اب اُردو تھی۔

کا گماں کیا جا سکتا ہے۔ یہی حال بعض ایسی غزلیات کا ہے جن کا انداز بیان سلجھا ہوا ہے۔ لیکن خیالات بلند عمیق اور نازک ہیں۔ یہ کہنا مشکل نظر آتا ہے کہ ان کا تعلق غالبؔ کی شاعری کے دوسرے دور سے ہے یا تیسرے دور سے۔

غالبؔ کا نظریۂ فن

غالبؔ کے خطوط کا مطالعہ کلام کی روشنی میں کیا جائے۔ تو یہ نظریہ ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اتفاق سے یہ دعویٰ کرنا مشکل ہے کہ غالبؔ کے تمام و کمال اردو مکتوبات شائع ہو چکے ہیں اور ان سے استفادہ کرنا ممکن ہے۔ "ادبی خطوطِ غالب" کے نام[1] سے جو مجموعہ ملتا ہے۔ وہ بھی نامکمل ہے۔ مالک رام[2] نے خطوطِ غالبؔ کی صرف پہلی جلد ابھی تک مرتب کی ہے اور دوسری جلد مرتب کرنا باقی ہے۔ یہ سامنے آجائے تو بڑی حد تک دعویٰ کیا جا سکے گا کہ غالبؔ کے جتنے خطوط مہیا ہو سکے ہیں۔ تمام و کمال چھاپ دیئے گئے ہیں۔ یہ خیال دل خوش کن ہے کہ دوسری جلد زیرِ ترتیب ہے۔ غالبؔ کی بعض اصلاحیں بھی سامنے آچکی ہیں غالبؔ کا طریقہ تھا کہ اصلاح دینے کے ساتھ ساتھ وجہِ اصلاح بھی بیان کر دیتے تھے اس طرح یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ صاحبِ اصلاح کا نظریۂ فن کیا ہے۔ مختصر یہ کہ غالبؔ کے نظریۂ فن پر اظہارِ خیال کا کام مستقبل کے لکھنے والوں کے لیے ہے۔ ابھی تک، تو غالبؔ کا اردو کلام پورے کا پورا شائع نہیں ہوا ہے۔ اس سلسلے میں کلامِ غالبؔ کا موجودہ ایڈیشن ایک اہم ضرورت کو پورا کرے گا۔

خطوط اور کلام کے نامکمل ہونے کی صورت میں غالبؔ کے نظریۂ فن کے متعلق چند تشنہ سے اشارے تو کیے جا سکتے ہیں کھل کر نہیں لکھا جا سکتا۔ خطوطِ غالب میں اکثر نظریات ایسے ہیں۔ جن کا تعلق فارسی شعر گوئی سے ہے۔ اردو شاعری سے جن مکاتیب کا تعلق ہے۔ وہ تعداد کے لحاظ سے تھوڑے ہیں۔ بعض باتیں اردو اور فارسی دونوں زبانوں کی شاعری سے یکساں تعلق رکھتی ہیں۔ ایک تو خالص فنی معاملات میں نفاست، خوش ذوقی اور فنی لوازم

---

[1] و [2] ادبی خطوطِ غالب (عسکری) اور خطوطِ غالب (مالک رام) میرے سامنے نہ ہوتے تو یہ مقدمہ لکھا ہی نہ جاتا، یا لکھا جاتا۔۔۔۔ تو نہ معلوم اس کی کیا صورت ہوتی!

کے قائل تھے۔ ایطا سے اُنھیں سخت کوفت ہوتی تھی اور جب کبھی کسی شعر میں (الف) کو گرتا ہوا دیکھتے تھے اُس وقت بھی ان کو بڑا رنج ہوتا تھا۔ اس کے برخلاف (ی) کا گرنا کچھ ایسا غیر مستحسن خیال نہیں کرتے تھے۔ یہی حال (واؤ) کا ہے۔ اس نظریے کے تحت معلوم ہوتا ہے کہ خود غالب کو الف کا گرنا بہت کھَلتا تھا۔ کبھی شاذ ہی ایسا ہوا ہو کہ ہر کوشش کے باوجود، بحر اس قسم کی ہو کہ الف کو گرنے سے بچایا نہ جا سکے[1] یا غیر حقیقی اور غلط قوافی باندھ گئے ہوں۔ اسی طرح غالب کو اپنے دَور کی رعایتِ لفظی اور قافیہ پیمائی والی شاعری ناپسند تھی۔ کسی ستم ظریف نے غالب کو یہ شعر لکھ کر بھیجا اور اس کی تعریف کی ؎

اسد اس جفا پہ بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش رحمت خدا کی

یہ شعر میرامانی اسد کا ہے، جو اُسی دور کے ایک شاعر تھے، نہ کہ اسداللہ خاں غالب کا۔ اس قدر دانی پر غالب جل بھُن کر کباب ہو گئے۔ بظاہر اس شعر میں کوئی ایسا سقم بھی نہیں۔ وہ تمام رعایات موجود ہیں، جو غالب کے زمانے کے دوسرے درجے کے شعرا استعمال کرنا اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔ اسد صاحب اپنے نام کی رعایت سے "شیر" کا لفظ بھی لے آئے ہیں اور پھر مرے شیر شاباش رحمت خدا کی تو ایسا ڈھلا ڈھلایا مصرع ہے کہ داغ و امیر کے دبستانِ شاعری سے تعلق رکھنے والے اس کو سنیں تو سر دُھنیں۔ لیکن غالب کا ردِ عمل اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ یہ شعر جن اسد کا ہے ان پہ خدا کی رحمت ہو۔ لیکن اگر میرا ہو تو مجھ پر ہزار بار لعنت۔ عبدالرزاق شاکر کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ دعویٰ حسن پرستی علی العموم رہے تو اچھا[2]۔ یہاں یہ نکتہ چھپا ہوا ہے کہ کسی ایک محبوب کی تعریف کرنے میں وہ مزہ نہیں جو کلیۂ حسن کی تعریف سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کا شعر قابلِ لحاظ ہے

جستجو گُل کی لیے پھرتی ہے اجزا میں مجھے
حسن بے پایاں ہے دردِ لادوا رکھتا ہوں میں

حسن پرستی کے باب میں اقبال اور غالب میں بڑا اشتراکِ خیال تھا۔ غالب ایسے

---

[1] یہاں ایک امکان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ میں نے مروّج دیوانِ غالب (اُردو) میں ایسی مثال تلاش کے باوجود نہیں پائی جہاں الف گرتا ہو، نہ ایطا کا عیب کہیں دریافت کر سکا[2] دیکھیے توضیحات ہیں "غالب

شعر کو دل سے پسند کرتے تھے۔ جو تیر و نشتر کی طرح جگر میں پیوست ہو جائے۔ مومن کا یہ شعر سنتے ہیں تو اپنا پورا دیوان اس کے بدلے میں دے دینا چاہتے ہیں ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اس شعر کے علاوہ اس ضمن میں بعض دوسرے اشعار بھی غالب کے ایک خط میں ملتے ہیں ؎

بدنام ہو گئے جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو

میر کا ایک ایسا شعر ہے۔ جسے غالب تیر و نشتر کہہ کر پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ناسخ کے ہاں کم اور آتش کے ہاں زیادہ ایسے تیرو نشتر ملتے ہیں۔ یہاں یہ نکتہ پیدا ہوا کہ شعر کے لیے مؤثر ہونا ضروری ہے۔ نشتریت کی کیفیت خود غالب کے تیسرے دور کے کلام میں جا بجا ملتی ہے۔ پسندِ شعر کا مسئلہ سراسر ایک ذوقی مسئلہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ غالب نے اس موضوع پر کھُل کر کچھ نہیں کہا۔ صرف اشارے کیے ہیں۔ اگر وہ پھیلا کر بات کرتے تو ہمارے لیے زیادہ مفید ہوتی۔ البتہ اُردو شاعری میں میر و میرزا کے اسی طرح قائل تھے جیسے فارسی شاعری میں خسرو، نظیری، ظہوری، عرفی، بیدل اور حزیں کے۔ میر کو سودا پر ترجیح دیتے تھے۔

اس موقع پر بے محل نہ ہوگا۔ اگر ہم غالب کی اصلاحات[1] کے چند نمونے پیش کریں اور سوچیں کہ ان اصلاحات سے ہمیں غالب کے ذہن تک پہنچنے کا موقع کیونکر حاصل ہو سکتا ہے۔

حالی ایک مقطع تھا:

اصل	ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی	مگر اب بڑھاپے میں ہونا پڑے گا
اصلاح	" " " "	" مری جان " " "

غالب کی اصلاح نے اس شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ "مری جان" میں جو محبت اور

---

[1] مشاہدات سخن اور صفدر مرزا پوری ـ مالک رام کی کتاب "تلامذۂ غالب" اپنی نوعیت کی ایک ہی کتاب ہے۔ اس میں غالب کے ۱۴۶ شاگردوں کے حالات مع نمونۂ کلام جمع کر دیئے گئے ہیں۔ کتاب باتصویر ہے کاش کہ غالب کی اصلاحات بھی اس کتاب میں ہوتیں۔

جو طنز ہے۔ اہل زبان ہی اُسے محسوس کر سکیں گے۔ "اب" کا لفظ بڑھاپے کو پوری طرح اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ بلاغت اسی کو کہتے ہیں۔ یعنی جوانی میں تم سیدھے نہیں ہوئے مگر اب تمھیں ہونا پڑے گا۔ یہ صنعتِ ایجاز کا نمونہ ہے۔ بغیر کہے بات پوری ہوگئی۔ اس کے برخلاف حالی نے بات کو زیادہ کھول کر بیان کیا تھا کہ اب بڑھاپے میں تمھیں سیدھا ہونا ہی پڑے گا۔ ایسی صورت میں یا تو "اب" بے کار ہو جاتا ہے یا "بڑھاپا"۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ خود غالب کے کلام میں کس غضب کی بلاغت ہے۔ حالی کا ایک اور شعر ہے ؎

اصل بارہا دیکھ چکے تیرا فریب اے ظالم ہم سے اب جان کا دھوکا نہیں کھایا جاتا

اصلاح " " " " " دنیا " " " " " "

ایک لفظ کے بدل دینے سے شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ پہلے اس شعر کا تعلق ظالم محبوب سے تھا۔ اب اس کا تعلق حیات و کائنات سے ہو گیا ہے۔ یہاں بھی وہی بات ہے جو عبدالرزاق شاکر کے شعر کی اصلاح میں ہمارے سامنے آئی تھی۔ غزل کی شاعری اپنے اندر ایک عمومیت رکھتی ہے۔ شعر کا دائرۂ خیال اگر صرف محبوب تک ہو۔ تو وہ شعر صرف ایک حد تک مؤثر ہو سکتا ہے۔ لیکن شعر کا دائرۂ خیال اگر عمومی طور پر پوری زندگی کے ساتھ ہو تو شعر کو ایک کلیہ کی حیثیت حاصل ہو جائے گی۔ جس کا اطلاق بہت سے مواقع پر ہو سکتا ہے۔

بعض موقع پر شعر کا درجہ اصلاح سے بلند ہو جاتا ہے۔ ایسی اصلاحات صاحب اصلاح کو استادی کے درجہ پر فائز کرتی ہیں۔ مثلاً حالی کا یہ شعر ؎

اصل عمر شاید نہ کرے آج وفا سامنا ہے شبِ تنہائی کا

اصلاح " " " " " کاٹنا ہے " "

"سامنے" کا تعلق صرف شبِ تنہائی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن "کاٹنے" کا تعلق عمر سے بھی ہے اور شبِ تنہائی سے بھی۔ یہاں اگرچہ خیال وہی رہا۔ جو تھا۔ لیکن خیال کی ادائیگی میں بڑا فرق پڑ گیا اور شعر کا درجہ پہلے کی نسبت بلند ہو گیا۔

نواب یوسف علی خاں ناظم والیٔ رام پور کے دو اشعار پر غالب کی اصلاحیں ملاحظہ ہوں[۱]۔

---

[۱] ناظم کے اشعار غالب کی اصلاح سے نکھر ضرور گئے مگر یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ ناظم خود شعر کہتے تھے۔ ذوق اور ظفر کا لین دین ثابت کرنے کی کوشش کی طرح ایک مسئلہ غالب و ناظم کے لین دین کا اٹھایا جا رہا ہے۔ مگر یہ بھی چلتا معلوم نہیں ہوتا۔

ناظم (۱) آج وہ لے گیا دل چھین کے میرا مجھ سے جس کو مٹی کے کھلونے پہ مچلتے دیکھا
اصلاح دل کے لینے میں یہ قدرت اُسے اللہ نے دی " " " " " " "
ناظم (۲) گر نہیں تیری کرامت تو یہ کیا ہے ساقی ہم نے ساغر کو تری بزم میں چلتے دیکھا
اصلاح ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں اور پھر سب نے اُسے بزم میں چلتے دیکھا

یہ دونوں اصلاحیں اپنی اپنی جگہ استادانہ ہیں۔ پہلے شعر میں دلبری کی صفت قدرتِ خداوندی کا ایک نمونہ بن جاتی ہے۔ ورنہ اصل شعر اپنی جگہ خود بھی درست تھا۔ رسمی طور پر غزل کا ایک مضمون یہ ہے کہ محبوب ایک طفل پری زاد ہوتا ہے۔ جس کو دیکھ کر دل ہاتھوں سے جاتا رہتا ہے۔ غالب کی اصلاح میں اس شعر کی سطح کو پہلے کی نسبت بہت بلند کر دیا۔ دوسرے شعر میں گردشِ جام کو ایک کرامت ثابت کر دیا گیا ہے۔ بغیر اصلاح کے بھی شعر اپنی جگہ مکمل اور خوبصورت تھا۔ لیکن یہ کہہ کر کہ جام کے پاؤں نہیں۔ پھر بھی چلتا ہے۔ کرامت کی وضاحت کر دی گئی۔ اور شعر پہلے سے بہتر ہو گیا۔

منشی حبیب الدین سوزاں سہارن پوری

اصل حج سے بہتر طواف ہے دل کا طوفِ کعبہ کیا کرے کوئی
اصلاح حجِ اکبر زیارتِ دل ہے " " " "

"دل بدست آور کہ حج اکبر است" کی طرح اصلاح کے بعد یہ شعر بھی ضرب المثل بننے کے لائق ہے۔ لیکن اصل شعر کا پہلا مصرع ڈھیلا ڈھالا تھا۔ اصلاح کے بعد بندش میں ایسی چستی پیدا ہو گئی ہے کہ اس شعر پر غالب کا شعر ہونے کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح قمر الدین راقم دہلوی

اصل تکلیف کیوں سُنے کسی خستہ جگر کی وہ افسانہ جو سنے ستمِ روزگار کا
اصلاح " " وہ کسی دردمند کی " " " " "

اصل شعر میں "خستہ جگر کی وہ" ایک عجیب بے ڈول سا ٹکڑا ہے۔ جسے بدل کر غالب "وہ کسی دردمند کی" بنا دیتے ہیں۔ اب یہ شعر اس لائق ہو گیا کہ بندش کی چستی کی مثال دینی منظور ہو تو یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

ان اصلاحات سے معلوم ہو گا کہ صناعی میں بھی غالب کا درجہ کتنا بلند تھا۔ اصلاحِ شعر

کا فن شاعری کے صنّاعانہ پہلو سے تعلق رکھتا ہے[۱]۔ غالب ایک بہت بڑے صنّاع تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک بڑا شاعر بڑا صنّاع بھی ہو۔ لیکن غالب کی ذات میں یہ دونوں خوبیاں مجتمع ہو گئی تھیں۔ اُردو سے قطع نظر فارسی میں بھی غالب کی استادی مسلّم ہے۔ مرزا تفتہ کے نام غالب کے جو خطوط ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض میں غالب نے تفتہ کے اشعار پر اصلاح کی ہے اور اصلاح کے ساتھ ساتھ وجہ اصلاح بیان کی ہے۔ فارسی میں غالب اپنے کہے ہوئے کو سند کا درجہ دیتے ہیں۔ وہ بار بار اپنے شاگردوں کو جتاتے ہیں کہ دیکھو میرا طریقہ یہ رہا ہے۔ میں نے یہ محاورہ یوں نظم کیا ہے۔ کہیں اپنا نام نظیری کے ساتھ اور کہیں فیضی کے ساتھ لیتے ہیں۔ بعض اوقات بڑے رنج کے ساتھ کہتے ہیں کہ کیا تم نے مجھے قتیل سمجھ رکھا ہے۔ یہ ایسے موقع پر کہتے ہیں۔ جب تفتہ یا کوئی دوسرا شاگرد غالب کو کوئی ایسا لفظ یا محاورہ شعر میں باندھتا ہے۔ جو ہندوستانی فارسی کا ایک نمونہ تو کہلا سکتا ہے لیکن اہلِ ایران اس طرح لکھتے اور بولتے نہیں ہیں۔ کسی خط میں اپنے کسی شعر کی تشریح کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ میرے اس شعر میں یہ خوبی ہے۔ نبی بخش حقیر کو غالب ایک بلند پایہ سخن فہم سمجھتے ہیں۔ پھر جب نبی بخش حقیر اُن سے ان کے کسی شعر کے بارے میں استفسار کرتے ہیں۔ تو غالب کو واقعی رنج پہنچتا ہے۔ کہ افسوس حقیر جیسا شخص بھی میرے مطلب کو نہ پا سکا۔ غالب کے اس قسم کے خطوط کو مثنوی بادِ مخالف کے ساتھ رکھ کر پڑھا جائے تو سمجھ میں آتا ہے کہ غالب کا ذوقِ شعری کس پایے کا تھا۔ مثنوی بادِ مخالف میں ایک جگہ کہتے ہیں:

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را   چہ شناسد قتیل و واقف را

مرزا کا کلامِ قتیل کے خلاف ردِّ عمل اس بنا پر تھا کہ مرزا کے نزدیک قتیل ایرانی محاورے اور ایرانی لب و لہجہ سے آشنا نہ تھے۔ قتیل کی فارسی ہندوستانی فارسی تھی۔ ادھر کلکتے میں خصوصیت کے ساتھ اور ویسے پورے ہندوستان میں قتیل کے ماننے والے موجود تھے۔ جب مرزا اپنے مقدمے کے سلسلے میں کلکتے پہنچے تو حامیانِ قتیل نے مرزا پر غلط گوئی کا الزام لگایا دوسری طرف مرزا کا یہ حال تھا کہ اپنی فارسی کو سند کا درجہ دیتے تھے۔ اور اپنے محاورے

---

[۱] صنّاع محض نہ تھے لہٰذا "شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا"، جو لکھنوی شعراء کا فارمولا ہے۔ غالب کے کلام پر صادق نہیں آتا۔ صنّاعی دراصل معنویت کے لیے امدادی حیثیت رکھتی ہے۔

اور لب و لہجہ کو اہلِ زبان کی طرح درست اور شائستہ خیال کرتے تھے۔ ان حالات میں نتیجہ وہی ہوا جس کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اور مرزا غالب حامیانِ قتیل کے ساتھ ایک طویل معارضے میں مبتلا ہو گئے۔ یہ ادبی بحث برسوں چلتی رہی۔ بعض ناگوار صورتیں بھی پیدا ہوئیں۔ جن میں غالب کو زک اٹھانی پڑی۔ ہمیں اس وقت اس جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ ہم کو اسی قسم کے ایک دوسرے معارضے سے کوئی مطلب ہے جو برہانِ قاطع اور قاطع برہان کی صورت میں رونما ہوا۔ یہ دونوں معارضے آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ مرزا غالب کو اپنی لغت دانی پر بھی ناز تھا۔ لیکن اُس دور میں ایک ایسی ہوا چلی کہ مرزا غالب کی لغت دانی پر پے بہ پے اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ اور مرزا جواب اور جواب الجواب میں الجھ کر رہ گئے۔ ان دونوں معارضوں سے ہم ایک نتیجے پر ضرور پہنچ سکتے ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ فارسی شاعری، زباں دانی، محاورہ بندی وغیرہم کے ساتھ مرزا غالب کو بے پناہ لگاؤ تھا۔ ان کے جاننے اور ماننے والے ان کو سند کا درجہ دیتے تھے۔ اگرچہ اُس دور میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی۔ جو اُن کی شاعری کو تو مانتے تھے لیکن زبان دانی کے قائل نہ تھے۔ اس کے برخلاف اُردو میں غالب کو جیتے جی سند کا درجہ نصیب نہ ہوا۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ یگانۂ روزگار ہونے کے باوجود غالب نے اپنی اردو دانی پر کبھی ناز نہیں کیا۔ ان کے سارے دعوے فارسی دانی سے متعلق ہیں۔ کہیں ایسا تو نہ تھا کہ غالب اپنے اردو کلام پر دل میں ناز کرتے ہوں لیکن جانتے ہوں کہ مستقبل کا نقاد ہی اُن کے رتبے کو پہچان سکے گا، چنانچہ یہ محض "انکسارِ شاعرانہ" ہو، خصوصاً اس لیے کہ اس باب میں کم از کم ذوقؔ و مومنؔ کے زمانۂ حیات میں غالبؔ کا "طرفدار" ملنا مشکل تھا۔

غالب کو فارسی کے ساتھ ایک فطری لگاؤ تھا جس کا اظہار انھوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ تفتہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں :-

"فارسی میں مبداءِ فیاض سے مجھے وہ دستگاہ ملی ہے کہ اس زبان کے قواعد و ضوابط میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر۔"

ملا عبد الصمد سے اپنے رشتۂ شاگردی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں :

"بدو فطرت سے میری طبیعت کو فارسی سے ایک لگاؤ تھا۔ چاہتا تھا کہ فرہنگوں سے بڑھ کر کوئی ماخذ مجھ کو ملے۔ بارے مراد بر آئی۔ اور اکابر فارسی میں سے ایک بزرگ یہاں وارد ہوا اور اکبرآباد میں فقیر کے مکان پر دو برس رہا۔ اور میں نے اس سے حقائق و دقائق زبانِ پارسی کے معلوم کیے۔" (خط بنام نواب کلب علی خاں)

یہ بات ۱۲۲۶ھ کی ہے کہ ہرمزد نامی ایک ایرانی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اکبرآباد آیا اور غالب کے ہاں مقیم ہوا۔ اس وقت غالب کی عمر چودہ برس کے لگ بھگ ہوگی۔ سولہ سال کی عمر تک غالب نے وہ سب کچھ پڑھ لیا ہوگا۔ جو اس زمانے میں شریف زادوں اور امیر زادوں کا دستور تھا۔ ملا عبد الصمد کی صحبت میسّر نہ آتی تو بھی فارسی مرزا غالب کے لیے مادری زبان کی سی حیثیت رکھتی تھی۔ گھر کی چاردیواری میں اُردو کے ساتھ ساتھ فارسی ان کے کان میں پڑتی رہی ہوگی۔ غالب ایک ترکِ سمرقندی تھے اور ان کی اصل ایرانی تھی۔ فارسی ان کے لیے مادری زبان کی نہ سہی پدری زبان کی حیثیت ضرور رکھتی تھی۔ ملا عبد الصمد کی صحبت سے طبیعت کا رنگ اور نکھرا ہوگا۔ اور اچھے اور بُرے کی تمیز بدرجۂ اتم پیدا ہو گئی ہوگی۔ لیکن اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ دو برس کے قلیل عرصے میں ظاہر ہے کہ ملا عبد الصمد ایرانی نے جملہ علوم و فنون گھول کر تو غالب کو پلا نہیں دیے ہوں گے۔ اس طرف اشارہ یوں کرتے ہیں :۔

"مجھ کو مبدا رفیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔ عبد الصمد محض ایک فرضی نام ہے چونکہ مجھ کو لوگ "بے استادا" کہتے تھے۔ ان کا منہ بند کرنے کو ایک فرضی استاد گھڑ لیا ہے۔"[۱]

اس سے مراد یہ نہیں کہ ملا عبد الصمد ایرانی کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔ بلکہ مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ سند دینے کی ضرورت ہو تو مرزا غالب ملا عبد الصمد ایرانی کا حوالہ دینا پسند کرتے ہیں۔

---

[۱] ان دنوں "بے استادا" ہونا ایک گالی تھی۔ میر نے بقولِ آزاد غالب کے متعلق اس خدشے کا اظہار کیا تھا۔

فارسی محاورے کے لیے کسی ایرانی سے رشتۂ شاگردی جوڑنا زباندانی کے ثبوت میں پیش کر دیتے ہیں۔ لیکن یہ بھی جانتے ہیں کہ قدرت نے خود ان کو وہ جوہرِ قابل عطا کیا تھا۔ جسے کسی استاد کی حاجت نہ تھی۔ شعراء تلامیذ الرحمٰن کہلاتے ہیں۔ زبان و محاورہ کے بارے میں کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔ اصل چیز وہ جوہر ہے جو قدرت کی طرف سے عطا ہوا۔ غالب کا دور ایک ایسا دور تھا جس میں فارسی زبان کی تحصیل عام بات تھی۔ جو حال اب انگریزی کا ہے۔ وہی ان دنوں فارسی کا تھا۔ لیکن غالب اپنے دور میں اپنے معاصرین سے یقیناً اس معاملے میں ممتاز تھے کہ اول تو ان کی گھر کی زبان ہی فارسی تھی۔ دوسرے استاد بھی میسّر آیا۔ تو ایک ایرانی عالم جید، تیسرے قدرتی طور پر ان کا ذوق پاکیزہ اور بلند تھا۔ اس ذوق کی تربیت میں ایک حد تک مُلّا عبد الصمد کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ نہ بھی ہوتا۔ تو کوئی ایسی بڑی کمی واقع نہ ہو جاتی ان دنوں تحصیلِ علم کا ایک ذریعہ سمعی تھا جو کچھ استاد سے سنا۔ اسے لوحِ دل پر نقش کر لیا۔ شاعری وہ زمانہ استادی شاگردی کا تھا۔ استاد سے جو سنا شاگرد نے وہی پلّے باندھ لیا اور تمام عمر اسی کا پابند رہا۔ اسطرح ان دنوں سینہ بہ سینہ علوم منتقل ہوتے تھے۔ لیکن علوم کا منتقل ہونا ایک بات ہے اور جوہرِ قابل کا موجود ہونا دوسری بات۔ ہمارے زمانے میں صورتِ حال بڑی حد تک بدل گئی ہے۔ اب علم کتابوں کے ذریعے پھیلتا ہے۔ ایک اعتراض غالب پر ہمارے دور میں یہ کیا گیا ہے کہ ملا عبد الصمد ایک افسانوی کردار تھے۔ جنھیں غالب نے تراش لیا ہے۔ ثبوت کے لیے غالب کا مندرجہ بالا قول نقل کیا جاتا ہے۔ دراصل غالب کی مراد یہ نہ تھی کہ ملا عبد الصمد ایرانی محض ایک مفروضہ شخصیت کا نام ہے۔ بلکہ یہ تھی کہ غالب نے جو کچھ ان سے سیکھا۔ وہ اتنا نہیں ہے کہ اس پر فخر کیا جا سکے۔ اگر یہ ثابت بھی ہو جائے کہ اس نام کا کوئی شخص موجود ہی نہ تھا۔ تو بھی غالب کے کمالات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی[۱]

غالب کا ذوق کتنا پاکیزہ اور کس قدر بلند تھا۔ اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ فارسی شعراء میں ظہوریؔ، صائبؔ، عرفیؔ اور نظیریؔ کو اپنا ہم زبان ٹھہراتے ہیں۔ عرفیؔ اور نظیریؔ کے ساتھ انھیں گہری مناسبت تھی۔ جس کا اظہار خطوط اور اشعار دونوں میں ملتا ہے۔

---

[۱] اس کے باوجود بچپن سے اُردو میں شعر کہتے تھے، اگرچہ وہ بڑی فارسی زدہ اُردو تھی۔

کیفیتِ عرفی طلب از طینتِ غالبؔ — جامِ دگراں بادۂ شیراز ندارد

زفیضِ نطقِ خود ایشم بانظیریؔ ہمزبان غالبؔ — چراغے راکہ دودے ہست در سرزود در گیرد

غالبؔ کی فارسی شاعری میں بعض کم نظر نکتہ چینوں کو کوئی چیز کھٹکتی ہے تو وہ سوز و گداز کی کمی ہے۔ شاید یہی بات ان کی اردو شاعری کے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ اُردو میں میرؔ نے جس رنگِ سخن کو رائج کیا۔ اس کی بنیاد غم پسندی، افتادگی، عاجزی بلکہ ایک حد تک انفعالیت پر ہے[1]۔ فارسی میں یہی رنگ سعدیؔ کی غزلوں میں ملتا ہے۔ غالبؔ کی شخصیت کے سلسلے میں وضاحت کے ساتھ بتایا جاچکا ہے کہ حزن و افتادگی کا اظہار غالبؔ کی طبیعت سے کوسوں دور رہا۔ غالبؔ کے ہاں انانیت و فعالیت کا عنصر غالب ہے۔ عشق کے مقابلے میں حسن پرستی اور تماش بینی، لذت اندوزی کے تجربات غالباً خالص تجرباتِ عشق سے اتنے زیادہ تھے کہ غالبؔ کی شخصیت پر ایک مستقل نقش چھوڑ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ سعدیؔ یا میرؔ کا سوز و گداز غالبؔ کے کلام میں نہیں پایا جاتا۔ البتہ شیرینی، شوخی، بلند و عمیق و نازک خیالات، فلسفہ و تصوّف، نشاط و سرمستی کی کیفیات سب کچھ جان لینے کی خواہش۔ زمان و مکان کے مسائل پر غور و فکر کی عادت غرضکہ ایک سوز گداز کے علاوہ شاعری کے لیے جو کچھ ضروری ہے نقادوں کو وہ سب غالبؔ کے ہاں ملتا ہے۔ نفاستِ طبع کا یہ عالم ہے کہ نظم و نثر میں بہترین سے کم پر قناعت کرنا غالبؔ کا کام نہیں بلاشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی اور ہندوستانی کلچر کے میل سے جو شاعری پیدا ہوئی اس کا بہترین نمونہ غالب ہی کے فارسی اور اُردو کلام میں پایا جاتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غالبؔ کا غم ایک عظیم غم ہے۔ اور جو اشعار پہلی نظر میں شوخی و ظرافت کے آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں غور سے پڑھیے تو غم سے معمور نظر آتے ہیں۔

فارسی میں تو غالبؔ کے سامنے بڑے بڑے اساتذہ کا کلام تھا۔ لہٰذا اجتہاد کی گنجائش بہت کم تھی۔ لیکن اردو میں یہ گنجائش پوری طرح موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چند کہ غالبؔ خود اپنے فارسی کلام پر ناز کرتے ہیں۔ فارسی میں انھوں نے وہ مقام حاصل نہیں کیا جو اُردو میں اُن کے ہاتھ آیا۔ فارسی میں ان کا مقابلہ فردوسیؔ، نظامیؔ خاقانیؔ، انوریؔ، سعدیؔ، حافظؔ

---

[1] سے کہا جاتا ہے۔ میرؔ کی مقاومتِ غم پر بہت کم زور دیا گیا ہے۔ اگر میرؔ کی شاعری کا جوہر یہی مقاومتِ غم ہے۔

عرفی، نظیری اور فارسی گویانِ ہند میں خسرو، فیضی اور بیدل سے ہو جاتا ہے۔ یہ فہرست خاصی مرعوب کن ہے۔ اردو میں لے دے کے چند نام ایسے ہیں جنھیں معیاری قرار دیا جاسکتا ہے۔ سرِ فہرست میر[1] ہیں سو اُن کی طبیعت کا رنگ غالب سے الگ ہے۔ پھر سودا[2] ہیں۔ جن کے قصیدے شیخ ابراہیم ذوق کو غالب کی نسبت زیادہ متاثر کر سکے۔ درد کا کلام مقدار کے اعتبار سے قلیل ہے اور اس کا رنگ بھی غالب سے مختلف ہے۔ ان کے علاوہ زیادہ سے زیادہ مصحفی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ جو غالب کے پیشرو ضرور تھے۔ لیکن غالب ان سے متاثر نہ ہو سکے۔ اس لیے کہ یہ اعتبار رنگ شاعری مصحفی، میر سے قریب تر ہیں۔ غالب کی سی اُپج اور رعنائی خیال مصحفی کے کلام میں کہاں؟ یہی وجہ ہے کہ اُردو شاعری میں غالب کا کوئی حریف نہیں درانحالیکہ فارسی شاعری میں حریفوں کی کوئی کمی نہیں۔ اس بنا پر مرزا غالب کی فارسی شاعری کا انداز کلاسیکل ہے۔ لیکن اُردو شاعری میں انھوں نے جس طرح چاہا۔ اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ یہاں انھیں پوری آزادی حاصل تھی۔ سوز و گداز کے متعلق بھی یہ غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے کہ غالب کے کلام میں یکسر مفقود ہے۔ یہ کہنا زیادہ درست ہو گا کہ ایسے اشعار کا تناسب دوسرے اشعار کے مقابلے میں کم ہے۔ یہ نہیں ہے کہ غالب سوز و گداز سے تمام عمر ناآشنا رہے ہوں۔ یہ بھی ثابت نہیں کہ غالب کو عشق کا تجربہ سرے سے ہوا ہی نہ ہو۔ اور کسی سے نہ سہی مرزا کو اپنی ذات سے بڑا عشق تھا اور وہ خود ترحمی میں بُری طرح مبتلا تھے۔ اگر کسی عظیم فن کار کو یہ یقین ہو کہ اس کے ساتھ کسی کو ہمدردی نہیں تو وہ خود اپنی ذات پر رحم کھانے لگتا ہے۔ یہ ایک ذہنی علالت ہے۔ جس فن کار کی نفسیات ایسی ہوں وہ اپنے سے محبت کرنے اور اپنی ذات پہ رحم کھانے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غالب نے ساری عمر عیش ہی نہیں کیا تھا۔ ان پہ ایسی پڑی کہ کسی پہ کیا پڑی ہو گی۔ انھوں نے دلّی کو لٹتا ہوا دیکھا انھوں نے شہزادوں، حکمرانوں، رئیسوں، شریفوں اور عزیز رشتہ داروں کو تباہ ہوتے، پھانسیاں پاتے، گھر بار ضبط ہوتے۔ عزت و آبرو سے ہاتھ دھوتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ چنانچہ انھوں نے جیتے جی اپنا مرثیہ کہا:۔

---

[1] میر کی قنوطیت غالب کو کہیں کہیں متاثر کرتی ضرور ہے مگر دونوں کی طبیعت اور ردِ عمل مختلف ہیں۔
[2] سودا کی معروضیت غالب کی طبیعت سے مناسبت نہیں رکھتی۔ غالب اپنی ذات میں مست تھے۔

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

کہنے کو تو یہ دہلیٔ مرحوم کا مرثیہ ہے۔ اور آخر میں غالب نے کہا ہے کہ سب کچھ مٹ گیا ایک میں باقی ہوں۔ لیکن یہ اپنی ذات کا مرثیہ بھی ہے۔ یعنی ایک میں رہ گیا ہوں۔ سو میں بھی مردے سے بدتر ہوں۔ غالب کی خود ترحمی کا بہترین نمونہ ان کا یہی قطعہ ہے۔ لیکن اس ایک قطعے پر ہی کیا موقوف ہے۔ ایسے اشعار کی ان کے اردو اور فارسی کلام میں کمی نہیں جس میں ان کا لہجہ سوز و گداز میں ڈوبا ہوا ہے۔ البتہ ایسے اشعار کے موضوع بھی وہ خود ہیں نہ کہ کوئی محبوب حقیقی و مجازی ایک جگہ کہتے ہیں ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

دنیا کے جھگڑوں سے تنگ آ کر کبھی تمنّا کرتے ہیں کہ جیتے جی دنیا سے ہاتھ اُٹھا لیں۔

کبھی طنزاً کہتے ہیں ؎

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو
ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو

زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

اب ہمیں معلوم ہوا کہ اصل بات معروض و موضوع کی ہے۔ سوز و گداز کی کمی نہیں لیکن یہ سوز و گداز غالب کے لہجے میں اس وقت آتا ہے۔ جب وہ خود اپنا موضوعِ سخن ہوتے ہیں۔ تاہم کلامِ غالب کے مطالعہ سے اب اشعار تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں خود ترحمی کی بجائے سعدی اور میر کی طرح غالب معاملاتِ عشق و محبت کے بیان میں یہ لہجہ اختیار کرتے ہیں ؎

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے
کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

اگرچہ اس غزل میں بھی غالب کی انفرادیت قائم ہے۔ بظاہر یہ غزل ایک نوحہ ہے جو محبوب کے مرجانے پر کہا گیا ہے۔ لیکن اصل میں اس غزل کے محبوب غالب خود ہیں۔ اور ظاہری محبوب غالب کی حالت پر رحم کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ محبت کے صدموں سے چور ہو کر غالب کا محبوب اپنی جان جاں آفریں کو سپرد کر دیتا ہے اور غالب تڑپتے رہ جاتے[1]۔

---

[1] تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

ہیں۔ کبھی غموں کی شدت انتہا کو پہنچ جاتی ہے ؎

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد[1]

یہاں ہمارا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ غالبؔ کا کلام سوز و گداز سے یکسر معرّا نہیں ہے۔ یہ اور بات ہے کہ حیات و کائنات کے ہزاروں مسائل شاعر کی توجہ کے طالب ہوتے ہیں۔ منجملہ دوسرے معاملات کے ایک معاملہ عشق و محبّت کا بھی ہے۔ اور عشق و محبت کے جہاں ہزاروں رنگ ہیں ان میں ایک رنگ درد و غم کا بھی ہے۔ سعدیؔ و میرؔ کو قدرت کی طرف سے ایسی طبیعت عطا ہوئی تھی جسے یک رنگ کہنا چاہیے۔ اس کے برخلاف غالبؔ کی طبیعت ایک رنگا رنگ یا ہمہ رنگ طبیعت ہے۔ چنانچہ سعدیؔ و میرؔ کا کلام ایک خاص رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور یہ رنگ عجز و افتادگی اور سوز و گداز کا رنگ ہے۔ اس کے برعکس غالبؔ کے ہاں ایک طنطنہ پایا جاتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں لہجے میں وہ سوز و گداز ہے کہ رنگِ کلام میرؔ و سعدیؔ سے جا ملتا ہے۔

شاعر اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی شاعر کے لیے یہ ممکن نہیں کہ گرد و پیش کے حالات سے کسی نہ کسی حد تک متاثر نہ ہو۔ فرق اگر ہے تو کم و بیش کا ہے۔ مولوی محمد حسین آزادؔ نے آبِ حیات میں ذوقؔ کا یہ شعر نقل کیا ہے اور ابرو اور بھوپال میں (بھوں کی بنا پر) جو رعایت ہے، اُسے بالکل نظر انداز کر گئے معلوم ہوتے ہیں ؎

بات ابرو کی ترے اے یار چل کر رہ گئی
کہتے ہیں بھوپال میں تلوار چل کر رہ گئی

اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ذوقؔ ایک مردِ خدا آگاہ تھے۔ ایک سانحہ جو دہلی سے سیکڑوں میل دور پیش آیا۔ ذوقؔ پر منکشف ہو گیا اور شعر کی صورت میں ڈھل گیا۔ جدید

---

[1] پوری غزل اپنی ذات کا مرثیہ ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھ سا عاشق نہ رہے گا تو حسن و عشق پر کیا کچھ بیتے گی۔

نقطۂ نظر سے اس شعر کو مکاشفے کا نمونہ قرار دینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ سانحہ بھوپال سے متاثر ہو کر ذوقؔ نے یہ شعر کہہ ڈالا۔ غزل ہر چند کہ ایک عمومی صنفِ سخن ہے۔ تاہم غزلوں میں جا بجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں کسی خاص واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ اور ایسے اشعار کی تو کوئی کمی ہی نہیں جن میں رمز و کنایہ کے انداز میں حالاتِ زمانہ پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ میرؔ نے باوصف دروں بینی اپنے دور کے حالات سے متاثر ہو کر کہا

؎ شہاں کہ کحل جواہر تھی خاکِ پا جن کی
اُنھیں کی آنکھوں میں پھرتی سلائیاں دیکھیں

کلیاتِ میرؔ میں ایسی بہت مثالیں موجود ہیں، اور سوداؔ نے شہر آشوب قصیدہ ہجو اور غزل میں حالاتِ زمانہ کا نقش اُبھارا ہے۔ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد جو نامور شعرا اُبھرے، اُن کے کلام میں اس دور کے مصائب کا حال کہیں کھلم کھلا اور کہیں رمز و کنایہ کے انداز میں پایا جاتا ہے۔ داغؔ، ظہیرؔ، انورؔ، تنیرؔ شکوہ آبادی اور اس طرح بہت سے دوسرے اساتذہ کا نام اس سلسلے میں گنوایا جا سکتا ہے۔ پھر یہ سمجھنا کہ غالبؔ کی غزلوں میں گرد و پیش کے حالات پر کوئی تبصرہ موجود نہیں ہے۔ قرینِ عقل نہیں معلوم ہوتا۔ خطوط میں تو جا بجا انھوں نے دلّی کی ویرانی کا رونا رویا ہے غزلوں میں البتہ کھُل کر ان حالات کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ جس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ غالبؔ ایک بڑے فن کار تھے اور غزل جیسی عمومی صنفِ سخن میں مخصوص حالات کا بیان انھیں پسند نہ تھا۔ غالبؔ جیسے حسّاس شاعر سے یہ توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے زمانے کے حالات سے بالکل بے تعلق رہ سکے ہوں گے۔ اس نظریے کی روشنی میں دیوانِ غالبؔ کے بعض اشعار ایک نئی معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ روائتی انداز کے باوجود محسوس ہوتا ہے کہ شاعر نے اپنے زمانے اور اپنے ماحول پر تبصرہ کیا ہے ؎

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں، کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا

اب یہ تو ہم کو معلوم ہی ہے کہ غمِ عشق سے غالبؔ کو کچھ ایسا سروکار بھی نہ تھا۔

معاملاتِ عشق کا تجربہ جو جرأت اور مومن اور داغ کو تھا، گمان ہے کہ غالب کو اُتنا نہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ غزل کی شاعری میں ع بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔ سچ پوچھیے تو مرزا غالب غمِ روزگار کے مارے ہوئے تھے اور ان کی ساری عمر غمِ روزگار کا ماتم کرنے میں گزر گئی۔ لہٰذا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ غالب نے اس شعر میں جو کچھ کہا ہے۔ اس سے ان کی مراد برعکس ہے۔ یعنی غمِ روزگار سے اگر ہم کو فراغت مل بھی گئی ہوتی۔ تو اس کے بدلے شاعر غمِ عشق ہمارا مقسوم ہوتا۔ ایک جگہ کہتے ہیں ؎

تاب لاتے ہی بنے گی غالبؔ — واقعہ سخت ہے اور جانِ عزیز

یہاں کون سے واقعے کی طرف اشارہ ہے، یہ شعر سے ظاہر نہیں۔ نہ غزل کا فن واقعات کے صریح بیان کی اجازت دیتا ہے۔ ورنہ شاعر نے خود بتا دیا ہوتا کہ کس واقعے کی طرف اشارہ ہے۔ ہو سکتا کہ غدر کے بعد جو حالات رونما ہوئے۔ مفتی صدرالدین آزردہ پر جو بیتی نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کو جو صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ خود مرزا غالب کے بھائی یوسف مرزا کی موت جن حالات میں واقع ہوئی۔ ان میں سے کسی کی طرف اس شعر میں اشارہ ہو سکتا ہے ؎

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار — لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

یعنی غمِ روزگار ایک امرِ مسلّم ہے۔ لیکن غالب اپنے محبوب کو طفل تسلیاں دے رہے ہیں اور سمجھا رہے ہیں کہ مجھ پر خواہ کوئی افتاد کیوں نہ پڑے۔ تیری محبت سے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا۔ اس ضمن میں غالب کے بعض اشعار ذہن میں آتے ہیں ؎

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی — وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

کوئی امید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج — مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں — ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا؟

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل — انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

فلک کوب حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی — مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اُٹھانے کی

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں — تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

ظلمت کدہ میں میرے شبِ غم کا جوش ہے — اک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

ہوئے مر کے ہم جو رسوا، ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا — نہ کبھی جنازہ اُٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا[1]

دلّی سے غالب کو جو محبت تھی۔ اس کا حال ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ جو دلّی کے اجڑ جانے پر لکھے گئے۔ اب ذرا اس شعر پر غور کیجیے ؎

محبت تھی چمن سے لیکن اب یہ بے دماغی ہے — کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

جب چمن شاداب تھا تو ہر پھول دامنِ نظارہ کو کھینچتا تھا۔ لیکن جب چمن اُجڑ گیا تو پھولوں کی خوشبو شاعر کے دل پر چھریاں چلاتی ہے۔

بے اختیار شاعر کو عشق اور جوانی کا زمانہ یاد آجاتا ہے۔ وہ دور گزر گیا۔ غمِ عشق کی جگہ غمِ روزگار نے لے لی ؎ (غالب کے اس شعر میں میر کی سی نشتریت ہے)

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

آخر کار زندگی سے بے زار ہو جاتے ہیں اور پکار اُٹھتے ہیں ؎

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام — ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

یہ درست ہے کہ غالب کا دور ایک ایسا دور تھا، جب سیاسی اور سماجی شعور برِصغیر پاک و ہند میں بیدار نہیں ہوا تھا۔ اور اس میں بھی شک نہیں کہ غالب طبیعت کے اعتبار سے مصلحت کوش تھے۔ اور فطرت کی راہ سے حال مست اور اپنی انا میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیکن شاعر تھے۔ اور حد درجے کے حسّاس۔ علامتوں کے ذریعہ انھوں نے وہ سارا دکھ درد ہم تک پہنچا دیا ہے۔ جو اُس زمانے کے حالات کی بدولت ان کو ملا تھا۔ غالب کا ذہن ایک درّاک ذہن تھا۔ جو ایک آئینے کی طرح تھا۔ اور اس آئینے میں ہم حالاتِ زمانہ

---

[1] رہروِ تشنۂ دررفتہ بہ آبم غالب — توشہ بر لبِ جو ماندہ نشان است مرا

کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔ داؔغ کی مثال بھی یہاں ناموزوں نہ ہوگی۔ داؔغ کی شاعری میں اس ماحول کا عکس جلوہ فگن ہے جس میں داغ نے پرورش پائی۔ پھر نواب شمس الدین خاں سے داؔغ کی نسبت بھی اس امر کی غمازی کرتی ہے کہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں اور اس کے آس پاس جو کچھ ہوا، داؔغ اس سے بے خبر نہیں رہ سکے ہوں گے۔ نوجوانی میں داؔغ کا تعلق قلعۂ معلّیٰ سے قائم ہوا تھا جو ہنگامہ ۱۸۵۷ء تک رہا۔ چنانچہ قاتل اور جلّاد اور ظلم و ستم کے روائتی مضامین میں چھپا کر انھوں نے اپنے زمانے کے حالات غزل کی زبان میں ادا کیے[۱]۔ ظہیرؔ، انورؔ، منیرؔ اور دوسرے اساتذہ نے کہیں کھل کر کہیں باتوں باتوں میں، کہیں محض اشارے کے ذریعے ان حالات کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ غرضکہ غالبؔ کی سیاسی وفاداریوں کے متعلق خواہ کوئی رائے بھی قائم کیوں نہ کی جائے، ان کے کلام میں اس دور کی جھلک موجود ہے۔ ان کی فنکاری کا کمال یہ ہے کہ اندازِ بیان شاعرانہ رہتا ہے۔ اور کہیں یہ احساس نہیں ہونے پاتا کہ سیاسی مطالب کی بدولت اشعار غزل کی روایت سے الگ ہو گئے ہوں اور ان میں کمی آئی ہو۔

ہمارے ملک میں سیاسی شعور کے ارتقا کی جو صورت پیش آئی۔ وہ فی الواقعہ عجیب و غریب ہے۔ جاگیردارانہ نظام جب ٹوٹا تو غلامی نے آ دبوچا۔ ایسا نہیں ہوا کہ جاگیردارانہ نظام ختم ہونے کے بعد جمہوری نظام ظہور میں آتا۔ یعنی انقلاب تو آیا اور اس کا آنا ناگزیر بھی تھا۔ اس لیے کہ ساری دنیا میں اُنیسویں صدی تک جاگیردارانہ نظام ٹوٹ چکا تھا۔ لیکن ہمارے سر پر انگریز کی حکومت مسلّط ہو گئی۔ ایک طرف تو یہ نئے دور کی آمد کا اعلان تھا کہ زوال آمادہ معاشرہ اپنی موت مر رہا تھا۔ دوسری جانب سامراجیت ہم پر مسلّط ہو گئی۔

اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

غالبؔ جیسا بیدار مغز شاعر یہ محسوس کر سکتا تھا کہ پرانا نظام جا رہا ہے، اور اس کے بدلے نیا نظام آ رہا ہے۔ اور اس ارتقائی عمل کو کسی طرح روکنا ممکن نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے کو نئے نظام کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہ وہی عمل تھا، جو سر سیّد احمد خان اور دوسرے

---

[۱] اس موضوع پر پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب نے خاصی تحقیق کی ہے۔

مصلحین و مفکّرین نے کیا ؎

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے! بس اب کہ لذّتِ خواب سحر گئی

یہ شعر وہی شاعر کہہ سکتا ہے۔ جو خود جاگیر دارانہ نظام کا پروردہ ہو۔ جس کی پرورش شہزادوں اور امیر زادوں کی طرح ہوئی ہو۔ لیکن ع

جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

بدلے ہوئے زمانے کی طرف غالب کے اس شعر میں واضح اشارہ ملتا ہے۔ آنے والا دور یعنی غیر ملکی حکومت کا تسلط شاعر سے یہ کہلواتا ہے۔ ع

اُٹھیے! بس اب کہ لذّتِ خواب سحر گئی

ظاہری طور پر غالب کو حالاتِ زمانہ سے مفاہمت کرنی پڑی اور ملکۂ معظمہ سے لے کر ڈپٹی کمشنر تک غالب کے ممدوح ٹھہرے۔ پھر غالب کو اپنی آبرو کا خیال بھی تھا اور وہ اس پر ناز کرتے تھے کہ نہ پکڑے گئے، نہ مارے گئے، نہ بے عزّت ہوئے نہ ان کی کوئی تحریر انگریزی حکام کے ہاتھ آئی جس سے ثابت ہو سکے کہ "باغیوں" کے ساتھ ان کا کوئی تعلق تھا۔ بلکہ وہ تو یہ ماتم کرتے ہیں کہ ان پر جھوٹے الزام تراشے گئے اور انھیں جاہ و منصب سے محروم کیا گیا۔ سنہ ۱۸۶۰ء کے دربار منعقدہ آگرہ میں کرسی بحال ہو گئی مگر رُتبہ بحال نہ ہوا۔ اور بہ اعتبار نشست اپنے اصلی منصب پر فائز نہ ہو سکے۔ اس کا شکوہ یوں کرتے ہیں ؎

وکٹوریہ کا دہر میں جو مدح خواں ہو
شاہانِ عصر چاہیے لیں عزت اس سے وام
خود ہے تدارک اس کا گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو غالب ہے جس کا نام
سب صورتیں بدل گئیں ناگاہ یک قلم
نمبر رہا نہ نذر نہ خلعت کا انتظام

چنانچہ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ غالب اپنے زمانے کے دُکھ درد سے نا آشنا تھے اور غمِ روزگار کا پرتو کلامِ غالب میں نظر نہیں آتا۔

روایت کے معاملے میں غالب کا ردِّ عمل اپنے ہم عصر شعرا سے مختلف تھا۔ ہمارا تعلق غالب کے اردو کلام سے ہے۔ ورنہ غالب کے فارسی کلام میں بھی کلاسیکیت کے باوجود

روایت سے انحراف کے رجحان کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ یہ رجحان ان کے اردو کلام میں اور بھی زیادہ نظر آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کوئی فُور اشاعر ہوتا تو یہ کہتا کہ گھر کو دیکھ کر دشت یاد آجاتا ہے۔ فرہاد کے ساتھ غالب کو وہ مناسبت معلوم نہیں ہوتی۔ جو دوسرے شعرا کو رہا کی ہے۔ اکثر مقامات پر فرہاد کے تصور کا مذاق اُڑاتے ہیں ؎

از جوئے شیر و عشرتِ خسرو نشاں نماند   غیرت ہنوز طعنہ بہ فرہاد می زند

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ   سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

فرہاد کا جذبۂ عشق ہی خام تھا۔ ورنہ کوئی عاشقِ صادق بھلا پہاڑ سے اپنا سر مارے اور اس کا محبوب اس کے سامنے نہ آجائے۔ پس ثابت ہوا کہ فرہاد عاشق نہ تھا محض نقّاش تھا۔ اور اس کا مقصد پہاڑ کے پتھروں پر شیریں کی صورت بنانے کے سوا کچھ نہ تھا (پتّھر پر سر مارنا یا پتّھر سے ٹکرانا ایک بے مقصد فعل ہے)

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ   سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

یعنی فرہاد ایک رسم پرست عاشق تھا۔ یہاں تک کہ مرنے کے لیے بھی اس کو تیشے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ وہ بھی کیا محبّت جو رسوم و قیود کی پابند ہو۔ یہاں تک کہ مرنے کے لیے بھی کوئی ایسا ذریعہ اختیار کیا جائے جو عشّاق کے نزدیک مسلّمہ ہو۔

عشق و مزدورِی عشرت گہِ خسرو کیا خوب   ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

کیا عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو فرہاد کو شیریں ملکۂ خسرو کی محبّت کا دعویٰ تھا۔ اور دوسری طرف فرہاد اپنے رقیب خسرو کے محل میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ یعنی ایک طرف تو خسرو کا دستِ نگر تھا اور دوسری جانب خسرو کا مدّ مقابل اور حریف اگر فرہاد میں عالی ظرفی ہوتی، تو اپنے کو یوں نہ گراتا اور طرب گاہِ خسرو میں مزدوری اختیار نہ کرتا ؎

کوہ کن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب   بے ستوں آئینۂ خوابِ گرانِ شیریں

یہاں عشق کے تینوں کردار یک جا ہو گئے ہیں۔ عشق کی مثالی ایک مثلّث کی ہے۔

یہ ایک کھیل ہے جس میں تین افراد اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ عاشق معشوق اور رقیب۔ ان تینوں کرداروں میں سب سے بے بضاعت کوہکن ہے۔ اسے اپنے رقیب کے محل میں مزدوری کرتے دکھایا گیا ہے۔ رقیب یعنی خسرو اپنی طرب گاہ میں دادِ عشرت دے رہا ہے۔ اور محبوبہ یعنی شیریں کو خبر تک نہیں کہ عاشق پر کیا گزر رہی ہے۔ شیریں کی گراں خوابی کوہِ بے ستوں کی مانند ہے۔ اور فرہاد سے کہ بے چارہ پہاڑ سے سر ٹکرا ٹکرا کر مرجاتا ہے۔ معاشرتی نقطۂ نظر سے فرہاد کی حیثیت ایک بھوکے مزدور کی سی ہے۔ جس کا کام خسرو کی خدمت بجالانا ہے۔ بہت رعایت کی تو یوں کہہ دیا ؎

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد | سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام | ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا

بہ ضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا | کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا کوہکن تکیہ

ایک جگہ فرہاد اور قیس دونوں کی ہنسی اڑاتے ہیں ؎

قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے | جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

یعنی خود شاعر عشق کی جس منزل میں ہے۔ وہاں ہر قدم پر جان دینی پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے قیس و فرہاد کا عشقِ محض، روایتی عشق تھا اور قد و گیسو تک محدود تھا۔ ممکن ہے کہ مصرعِ ثانی میں ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات کی جانب اشارہ ہو۔

اس کے باوجود ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کو فرہاد کے مقابلے میں قیس کے ساتھ زیادہ مناسبت تھی۔ جس شعر میں قیسِ مجنوں کا ذکر آگیا ہے۔ انھوں نے جذبۂ احترام کا اظہار کیا ہے اور اُسے اپنا ہم چشم بلکہ اپنے سے بڑھ کر خیال کیا ہے ؎

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر | کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

یعنی دنیا کیا ہے وحشتِ مجنوں کا غبار ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں۔ اس دنیا میں حسن و آرائش کی مثال طرۂ لیلیٰ کی سی ہے۔ لیکن جب ہر طرف غبار ہی غبار ہو، تو طرۂ لیلیٰ کا لحاظ کہاں تک کیا جاسکتا ہے۔ بیدردِ زمانہ حسن کو کب خاطر میں لاتا ہے

نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا
گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلیٰ نہ سہی

یعنی قیس کے دم قدم سے جنگل اور ویرانے میں رونق ہے۔ یہ اور بات ہے کہ قیس کی رسائی خیمۂ لیلیٰ تک نہیں ؎

دستگاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا ‌ ‌ یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

یعنی کہنے کے لیے تو مجنوں کا تعلق عالمِ وحشت سے ہے۔ لیکن یہ بہار اور یہ فرشِ گل سب دیدۂ مجنوں ہی کا مرہونِ منت ہے۔ نہ مجنوں خون کے آنسو روتا۔ نہ بہار آتی۔ اور نہ پھول کھلتے ؎

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار ‌ ‌ صحرا مگر بہ تنگیٔ چشمِ حسود تھا

یعنی شاعر کا مدِ مقابل اگر کوئی تھا۔ تو صرف مجنوں تھا۔ ورنہ میدانِ عشق دوسرے عشاق پر چشمِ حاسد کی طرح تنگ تھا۔

غزل کی شاعری میں قیس و فرہاد کی حیثیت مثالی عاشقوں کی سی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مرزا غالبؔ قیس کو اپنا ہم مرتبہ خیال کرتے ہیں۔ لیکن جہاں فرہاد کا نام آیا برہم ہو جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ امتیاز ایک طبقاتی امتیاز ہے۔ فرہاد کو غالبؔ ایک مزدور پیشہ عاشق خیال کرتے ہیں۔ اس کے برعکس قیس کو سردارِ قبیلہ اور صاحبِ شمشیر و شعر تصور کرتے ہیں۔ خود غالبؔ کا تعلق بھی ایک ایسے ہی گھرانے سے تھا، جو شمشیر زنی اور شجاعت کی روایات سے مالامال تھا اور قیس کی طرح غالبؔ بھی میدانِ شعر کے نبرد آزما تھے۔ اس کی ایک نفسیاتی وجہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ غالبؔ کے خون میں سوداویت تھی، اور انھیں وحشت کا تجربہ حاصل تھا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ غالبؔ کا بھائی یوسف مرزا پاگل ہو گیا تھا۔ چنانچہ قیس کا نام غالبؔ احترام سے لیتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ فرہاد کے ساتھ پیشہ وارانہ حسد بھی ممکن ہے۔ غالبؔ اگر فنِ شعر میں فرد تھے۔ تو فرہاد بھی اپنے زمانے کا مشہور صناع تھا۔ اور غالبؔ کو اپنے سوا کسی دوسرے کا فن کار ہونا پسند نہ ہو سکتا تھا۔ بہر صورت فرہاد کی روایت سے غالبؔ نے انحراف کیا۔ غالبؔ کے ناقد و شارح کے لیے مذکورہ بالا نظریے سے قطعی طور پر ہم آہنگ ہونا چنداں ضروری نہیں۔ ہم نے فرہاد کی روایت کے بارے میں غالبؔ کے ردِ عمل کی توجیہہ پیش کی ہے۔ اور اس قسم کی توجیہات ایک حد تک قیاسی بھی

ہو سکتی ہیں۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ فرہاد کے متعلق غالب کا نقطۂ نظر روائتی نہ تھا۔ ہر بڑا شاعر قدیم روائتوں کو نئے معانی عطا کرتا ہے۔ غالب نے بھی یہی کیا ہے۔ انھوں نے قدیم روایت سے انحراف کیا ہے، اور ایک نئی روایت کی داغ بیل ڈالی ہے۔ غالب کی طبیعت میں ایک ندرت تھی۔ اور وہ بات سے بات پیدا کرتے تھے۔ ایک فرہاد کی روایت ہی پر موقوف نہیں۔ انھوں نے جابجا پرانی روائتوں سے روگردانی کی ہے۔ روایت شکنی اور نئی روایات ایجاد کرنے کا ملکہ قدرت کی طرف سے عظیم شاعروں کے حصّے میں آیا ہے۔

غالب کی طبیعت کا جوہر نکتہ آفرینی ہے۔ یعنی بات سے بات پیدا کرنے کا فن دوسرے الفاظ میں اس کو معنی آفرینی یا خیال آفرینی بھی کہہ سکتے ہیں[۵]۔ فارسی میں یہ کمال بیدل کی شاعری میں ملتا ہے۔ اور اُردو میں مومن کے کلام میں۔ مغربی تنقید میں اس خوبی کو Conceit یا Wit کہتے ہیں۔ رمزیہ شاعری کی یہ دونوں اصطلاحیں ایک حد تک ہم معنی ہیں۔ لیکن ان کا استعمال جدا جدا ہے۔ مؤخرالذکر اصطلاح اس وقت استعمال کی جاتی ہے جب مقصد نکتہ چینی یا اعتراض کرنا ہو۔ تحسین و تعریف مقصود ہو تو اوّل الذکر اصطلاح سے کام چلایا جاتا ہے۔ سترھویں صدی کی انگریزی شاعری میں ایک مدرسۂ فکر ایسا پیدا ہوا جس نے بات سے بات نکالنے کو شاعرانہ خوبی کا معیار قرار دیا۔ یہ بات ہمیں انگریز شاعر جان ڈن (Donne) کے کلام میں بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ ذرا آگے چل کر اٹھارویں صدی میں اس قسم کی شاعری پر نکتہ چینی کی گئی۔ اس وقت یہ دونوں اصطلاحیں اُبھریں۔ ڈن کی شاعری میں جس قسم کی نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔ اس کا مذاق یوں اڑایا گیا کہ نکتہ آفرینی کو Conceit کہہ کر پکارا گیا۔ اس لفظ میں تصنع کی بو آتی ہے۔ جب زبردستی بات سے بات نکالی جائے، مختلف النوع تجربات کو مربوط کیا جائے، حد سے زیادہ مبالغہ کیا جائے، بے ضرورت اظہارِ علم و فضل ہو، بے جا رعایت لفظی ہو تو تصنع کی بو آنا ایک قدرتی امر ہے۔ ڈن نے بعض تشبیہات ایسی استعمال کی ہیں جنھیں پُر تصنع کہا جائے تو بے جا بھی نہیں معلوم ہوتا۔ بظاہر ان تشبیہات کا استعمال قاری کو

---

[۵] عبدالرزاق شاکر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں "۱۵ برس کی عمر سے ۲۵ برس کی عمر تک خیالی مضامین لکھا کیا" یعنی اپنی اردو شاعری کے ابتدائی دور میں بیدل سے متاثر تھے (فارسی شاعری کا شوق جوانی میں ہوا)

حیران و مرعوب کرنے کے لیے تھا۔ ایک جگہ اس نے آنسو کو کرۂ ارض سے تشبیہہ دی ہے اب غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وجہ شبہ یہاں آنسو کا مدوّر ہونا ہے۔ آنسو بھی مدّور ہیں اور کرۂ ارض بھی مدوّر ہے۔ یا ان دونوں کو بیضوی کہہ لیجیے۔ اس کے علاوہ آنسو اور کرۂ ارض میں کوئی مشابہت نہیں۔ ایک جگہ ڈن نے پرکار کی تشبیہہ استعمال کی ہے۔ عاشق و معشوق ایک پرکار کی مانند ہیں۔ جس کا ایک سرا قائم ہے اور دوسرا متحرّک۔ عاشق اس پرکار کا وہ سرا ہے جو متحرّک رہتا ہے۔ اور محبوب وہ سرا جو قائم رہتا ہے۔ یعنی عاشق غمِ روزگار کی بدولت مارا مارا پھرتا ہے۔ اس کے لیے یہ ممکن نہیں کہ معشوق کے پاس قیام کر سکے۔ معشوق جو پرکار کا قائم سرا ہے۔ وطن میں آسودہ ہے اور شاعر دشتِ غربت میں آوارہ یہ تشبیہہ بہت خوبصورت ہے۔ اگرچہ اس میں بھی تصنّع کا پہلو موجود ہے۔ لیکن یہ تصنّع محض تکلّفِ بارد نہیں۔ اس تشبیہہ میں گرمی اور حرارت ہے، اور ہمارے جذبات کے ساتھ یہ تشبیہہ ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ یہ آنسو اور کرۂ ارض والی دُور از کار تشبیہہ نہیں۔ غرضکہ سترھویں صدی کی انگریزی شاعری واقعیت سے گریزاں تھی۔ اور دماغی کاوش اور تلاشِ مضامین پر اس کا انحصار تھا۔ اعتراض کرنے والوں نے اس شاعری کو مابعد الطبیعاتی کہہ کر پکارا ہے۔ یہاں مابعد الطبیعاتی سے مراد غیر حقیقی ہے۔ مذاق اُڑانے کے لیے یہ اصطلاح وضع کی گئی تھی۔ بات میں سے بات نکالنے کا طریقہ کچھ سترھویں صدی کی انگریزی شاعری ہی سے مخصوص نہیں۔ بیدل کی شاعری میں بھی یہی کیفیت ملتی ہے۔ حکیم مومن خاں مومنؔ اُردو شاعری میں اسی خصوصیّت کے لیے مشہور ہیں۔ ان کی عظمت کو تسلیم کرنے والے جب ان کی شاعری کی تعریف کرتے ہیں، تو نزاکتِ خیال کو ان کی شاعری کا جوہر قرار دیتے ہیں۔ حسرتؔ موہانی جو مومنؔ کے مدرسۂ فکر کی پیداوار تھے۔ مومنؔ کی اس خصوصیت کی تعریف بار بار کرتے ہیں، اور پھر نسیمؔ دہلوی اور تسلیمؔ لکھنوی میں بھی اس خصوصیت کا سراغ نکالتے ہیں۔

غالبؔ کی طبیعت شروع ہی سے نکتہ آفریں[1] تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اوّل اوّل انھوں نے بیدلؔ کی شاعری کو ایک مثالی نمونہ سمجھا اور کہا ؎

---

[1] سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا[1] اسد اللہ خاں قیامت ہے

گر ملے حضرتِ بیدل کا خطِ لوحِ مزار اسدِ آئینہ پردازِ معانی مانگے

اور عین ممکن ہے کہ مومن کی طرح غالب بھی پیچ در پیچ خیالات میں پھنس کر رہ جاتے اور بات سے بات نکالنا ان کے لیے شاعری کا مقصدِ اولیں بن جاتا۔ مگر نکتہ آفرینی کے ساتھ غالب کو بلند خیالی کا جوہر بھی ملا، اور حقائق و معرفت کے پردے اٹھانے کا شوق بھی ودیعت ہوا۔ خیالات کی بلندی اور ذہن کی رسائی غالب کو بچا کر لے گئی۔ اور ابتدائی کلام کے علاوہ نکتہ آفرینی کا شوق ان کی طبیعت پر غالب نہ آسکا۔ ایسا نہ ہوتا تو ان کا درجۂ شاعری اتنا بلند نہ ہوتا۔ بہر حال غالب کے ابتدائی کلام میں نکتہ آفرینی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ جب خیال ضرورت سے زیادہ نازک اور پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ تو بات آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی چنانچہ کلامِ غالب کا ایک حصہ ایسا ہے۔ جسے معاصرین نے مہمل قرار دیا۔ اور غالب کو طرح طرح سے معذرت کرنی پڑی کبھی کہا۔ ع

گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

کبھی شکوہ کیا۔ ع

دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

کبھی ایک بے پروائی کے انداز میں اظہارِ استغنا کیا ع

گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

کہیں کہیں سچی بات بھی زبان سے نکل ہی گئی ؎

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے

خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

دوسری طرف ہمیں شاعری کا مقصد بھی یاد رکھنا چاہیے۔ شاعری کا مقصد ابلاغ ہے۔ خود غالب نے اس مقصد کو یوں پیش کیا ہے ؎

---

[1] "افکارِ غالب" کے مصنف نے برسبیلِ تذکرہ اس شعر پر روشنی ڈالی ہے اور کہا ہے کہ "قیامت ہے" یعنی طرزِ بیدل سے بچنا چاہیے!

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اگر شاعری کا مقصد یہی ہے، تو نکتہ آفرینی والی شاعری خصوصاً جب نزاکتِ خیال اپنی انتہا کو پہنچ جائے۔ کیا معنی رکھتی ہے؟ اس رنگ میں پسندیدہ اشعار بھی غالب نے نکالے ہیں۔ جہاں نازک خیالی ہے یا خوش آیند قسم کی پیچیدگی ہے۔ بے حد مبالغہ آرائی اور ادعائے علمیت، پیچ در پیچ تشبیہات کا استعمال اور قاری کو بھول بھلیاں میں پھنسانے کو کوشش جہاں پائی جائے وہاں سر پیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ ایسے مقامات مروّجہ دیوان میں کم اور موجودہ نسخہ میں کثرت سے آتے ہیں۔ مثال کے طور پر ؎

کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا — آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے
مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے — خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا
قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا — خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا

یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا
عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

ان اشعار کے معنی نکالنا غیر ممکن نہیں بلکہ مدّاحوں نے تو ایسے اشعار کے معنی بھی نکالے ہیں۔ جنھیں باضمیر ناقد بامعنی نہیں کہہ سکتا۔ سجاد حیدر یلدرم نے انشائے لطیف کے ذیل میں ایک مضمون لکھا۔ جس کا عنوان ہے "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ"۔ غالب اگر آج زندہ ہوتے۔ تو اپنے بعض مدّاحوں سے ہاتھ جوڑ کر یہی کہتے کہ خدارا مجھ پر رحم کرو۔ بعض اوقات تو یہاں تک ہوا ہے کہ شارح نے غالب کا شعر صحیح طور پر پڑھا بھی نہیں۔ لیکن شرح کرنے بیٹھا ہے تو اس فلسفیانہ انداز کے ساتھ کہ ویدِ مقدس سے لے کر دیوانِ غالب تک جتنی خیال آفرینی ہوئی ہے۔ وہ ایک ایک شعر کے مطلب میں صرف کر دی ہے ؏

خانۂ مجنون صحرا گرد، بے دروازہ تھا

اس مصرعے کو غالب کے ایک مدّاح نے جس طرح پڑھا اور پھر جیسے اس کا تجزیہ کیا۔ اس سے شعر کے معنی سراسر منقلب ہو گئے۔ ایک اور نقّاد و شارح نے ؎

ہاں اہلِ طلب کون سُنے طعنۂ نایافت ۔۔۔ دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

کی صوفیانہ تعبیر کرتے ہوئے ۔۔۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ۔۔۔ کچھ ہماری خبر نہیں آتی

کے ڈانڈے بھی تصوّف سے ملا دیئے ہیں اور "ہاں اہلِ طلب" والے شعر سے اس کو مربوط کر دیا ہے۔ یعنی شارح نے اس شعر میں بھی منازلِ تصوّف کا پورا سلسلہ تلاش کر لیا ہے اور اس شعر کو عالمِ وحشت کی بجائے یا حالتِ خود فراموشی کی جگہ معرفت کی منزل سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

فاضل نقّاد و شارح نے کمال ہمدردی کے ساتھ غالب کے اشعار کو حکیمانہ رنگ دے کر غالب کی عظمت میں اضافہ کرنا چاہا ہے۔ مثال کے طور پر ؎

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے ۔۔۔ جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

طرزِ بیدل کا شعر ہے اور ایسا توجہ طلب بھی نہیں۔ بنیاد اس شعر کی رعایتِ لفظی پر ہے ـــــ بے اعتدالیوں سے جو سبکی ہوئی اُس سے شاعر کی قدر و قیمت کم ہو گئی۔ زیادہ اور کم کو ایک دوسرے کے برابر ٹھہرا دیا ہے۔ جیسے دو ہموزن چیزوں کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ کر تول دیا جائے اور بس۔ مگر شارح کلامِ غالب نے دعویٰ کیا ہے کہ اس شعر میں فلسفۂ اخلاق کا دریا کوزے میں بند ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ اس شعر میں اسلامی طب کا جوہر بھی کھینچ کر بھر دیا گیا ہے۔ حوالہ غالب کی زندگی کے سوانح سے دیا گیا ہے۔ یعنی یہ شعر ایک زبردست مرقعِ عبرت ہے۔ ہماری مراد یہاں غالب کے مدّاحوں کی نکتہ چینی نہیں ہے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر غالب سے کچھ فروگذاشت ہو گئی ہے تو اس کو کسی صورت میں جائز قرار نہیں دیا جا سکتا۔ غالب آخر شاعر ہی تو تھے۔ کوئی ولیِ کامل تو نہ تھے۔ اور وہ کونسا شاعر ہے جس کا تمام و کمال سرمایۂ شعر عیوب سے پاک ہے۔ خود غالب نے آگے چل کر طرزِ بیدل کو ترک کر دیا۔ اور وہ باریک بینی اور نکتہ آفرینی کے چکر سے نکل گئے۔ اس قسم کی شاعری غالب کے لیے محض ذہنی ورزش کا درجہ رکھتی ہے۔ جس شاعری پر غالب کی عظمت کا دارومدار ہے، وہ خیال آرائی اور نکتہ آفرینی کی شاعری نہیں، کیفیات و احساسات کی شاعری ہے۔

غالبؔ کی جو خصوصیت ان کو دوسرے شعراء پر فوقیت دیتی ہے۔ وہ ان کی بلند خیالی ہے۔ غور کی نگاہ سے دیکھا جائے۔ تو عام عاشقانہ معاملات کو غالبؔ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ ابتذال اور عامیانہ پن کی جگہ عالی حوصلگی اور بلند خیالی غالبؔ کا پیرایہ بیان بن جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ رشک کا مضمون جو مضامینِ غزل میں ایک عام حیثیت رکھتا ہے جب غالبؔ اس مضمون کو باندھتے ہیں تو رشک خودداری کا ہم معنی بن جاتا ہے ؎

دیکھنا خوبی کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

قیامت ہے کہ ہووے مدّعی کا ہم سفر غالبؔ — وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

یعنی کبھی تو غالبؔ خود اپنی ذات کو اپنا مدِ مقابل بناتے ہیں۔ اور کبھی ذاتِ خداوندی سے اظہارِ رشک کرتے ہیں اور شگفتہ بیانی کے ساتھ رقیب کا نام لیے بغیر اظہارِ رشک کرنا ہو تو یوں کہتے ہیں ؎

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ فرہاد جیسے نامور عاشق کو غالبؔ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کا حریف اگر کوئی تھا۔ تو قیسِ مجنوں۔ غالبؔ اپنی ذات کو اعلیٰ و ارفع اور جملہ خوبیوں کا مجموعہ اور دوسروں سے کہیں برتر تصوّر کرتے تھے۔ یہ نظریہ یعنی اپنے کو مافوق البشر سمجھنے کا رجحان غالبؔ کا مرکزی تصوّر ہے۔ اپنی ذات کے علاوہ بھی جب وہ کائنات پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہر چیز کا جوہر حاصل کرنے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان کی نظر بہترین سے کم پر ٹھہرتی ہی نہیں ؎

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیٔ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام — مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے
رکھتا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز — پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز — دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب — آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لیے

غرضکہ غالبؔ کی بلند خیالی مسلم ہے۔ وہ کائنات پر ایک ناظر کی طرح نظر ڈالتے ہیں۔ اور دنیا ان کے لیے ایک تماشے کی حیثیت رکھتی ہے۔ افلاطونی فلسفے میں اس عالمِ اسباب کو ایک تماشا یا نظارہ قرار دیا گیا ہے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ غالبؔ نے افلاطونی فلسفے کا مطالعہ کیا تھا۔ غالباً نہیں کیا تھا۔ مگر اتنا تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ غالبؔ کے لیے سب سے مرغوب چیز اگر کوئی ہے تو مشاہدہ ہے ؏

ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

والی غزل اس ضمن میں ایک اچھی مثال ہے۔ چنانچہ ان کی تمام تشبیہات بصری ہیں۔ ان کی حسیاتی تشبیہات میں سمعی تشبیہیں گنتی کی ہوں گی، اور بصری تشبیہیں بے شمار۔ یہ بھی ایک نفسیات کا مسئلہ ہے کہ بصری تشبیہات سے کام لینے والا شاعر مردانہ طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ اور سمعی تشبیہات نسوانیت کی غمازی کرتی ہیں۔ چنانچہ غالبؔ کی بلند خیالی بصری تشبیہات کے انتخاب سے ثابت ہوتی ہے [۱]

غالبؔ ایک طنازانہ بصیرت کے مالک تھے، اور ان کا مسلک بڑی حد تک تشکیک تھا۔ ایسے اشعار کی کمی نہیں جن میں انھوں نے اس مسلک کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن — دل کے بہلانے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ — عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

زندگی اپنی جب اس رنگ سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

---

[۱] ثقلِ سماعت میں بھی مبتلا تھے۔ اس لیے سمعی تشبیہات سے انھیں دلچسپی نہ ہو سکتی تھی ؎

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات — سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

شاہدِ ہستیٔ مطلق کی کمر ہے عالم ــــ لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ــــ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل ــــ بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ــــ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالبؔ گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں ــــ حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

تشکیک کا فلسفہ انسانی عقل کی فوقیت کو تسلیم کرنے کے مترادف ہے۔ شک وہی شخص کرتا ہے۔ جو محض کہے سنے مقولوں پر عمل کرنا پسند نہ کرتا ہو اور حقیقتِ حال تک پہنچنے کے لیے دوسروں کی رہنمائی تلاش کرنے کی بجائے خود عقل کی روشنی میں فیصلہ کرنے کا خواہشمند ہو۔ غالبؔ کی یہ خصوصیت ان کو جدید شعور اور عقلی طریقِ استدلال کا نمائندہ قرار دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فکری اعتبار سے غالبؔ اپنے دَور کی نسبت ہمارے زمانے سے قریب تر نظر آتے ہیں۔ اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ تشکیک ہمارے زمانے کا مخصوص اور امتیازی رجحان ہے۔

غالبؔ کے اندازِ بیان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ پوری بات بیان نہیں کرتے بلکہ درمیان سے ایک کڑی چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کی تشریح اسلوب کے سلسلے میں کی جائیگی۔ اس سے ایک عجیب دلنشیں کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ خیال کا منطقی ربط اس قسم کا ہوتا ہے کہ قاری کو ذرا سے غور و فکر کے بعد اصل مفہوم تک پہنچا دیتا ہے۔ اس طرح قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ اس نے شاعر کا کوئی بڑا راز معلوم کر لیا اور اپنے فہم کی رسائی پر ناز کرنے لگتا ہے۔ یہ خصوصیت غالبؔ کے علاوہ مومنؔ میں بھی پائی جاتی ہے۔ اگر حد سے بڑھ جائے تو یہی خوبی عیب بن جاتی ہے۔ اس قسم کا ایک شعر کسی نامعلوم شاعر کا ضرب المثل بن کر رہ گیا ہے ؎

نگس کو باغ میں جانے نہ دینا ــــ کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا

یہاں بھی قاری مطلب کو پا سکتا ہے۔ اگر وہ اس شعر سے پیدا ہونے والے پورے ڈرامے کو اپنے خیال کے اسٹیج پر ادا ہوتا ہوا دیکھ سکے۔ اس شعر میں پہلی اور آخری کڑیاں

موجود ہیں۔ لیکن درمیان کی کئی کڑیاں غائب ہیں یعنی جب شہد کی مکھی باغ میں جائے گی اور پھر شہد لے کر لوٹے گی، اور اپنے چھتے میں پہنچے گی۔ اور یہ عمل ایک لمبے عرصے تک ہوتا رہے گا۔ تو کوئی شہد کا رسیا آکر چھتہ توڑے گا۔ اور شہد حاصل کرنے کے بعد چھتے کو موم نکالنے والے کے حوالے کر دے گا۔ یہاں تک کہ اُس موم سے شمعیں بنیں گی۔ اور جب یہ شمع روشن ہوگی، تو پروانہ اُس پر سر پٹک پٹک کر مر جائے گا۔ یہ شعر شاعرانہ بیان کے عیوب کی ایک مثال ہے۔ غالبؔ اور مومنؔ بڑے فن کار تھے۔ وہ فن کو برتنا جانتے تھے اور انھوں نے انتہا پسندی کی بجائے اس صفت کو اعتدال کے ساتھ برتا ہے۔ مومنؔ کہتے ہیں ؎

مومنؔ بتوں کو خلد میں لے جائیں گے کہیں — وعدہ ہے کافروں سے عذاب الیم کا

رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

رحم فلک اور مرے حال پر — تو نے کرم اے ستم آرا کیا

اب یہ عالم ہے کہ او آئینہ رُو — لوگ آئینہ دکھاتے ہیں مجھے

بیان کی یہ خوبی غالبؔ کے ہاں بڑی کثرت سے ملتی ہے۔ یہاں تک کہ کوئی ایسا شعر جس میں یہ خوبی موجود ہو۔ پڑھا جائے۔ تو خیال ہوتا ہے کہ یہ شعر غالبؔ کا ہوگا۔ غالبؔ کہتے ہیں ؎

بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل — کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ — اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

کیونکر اس بُت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم! — میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گذشتہ — تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

تماشائے گلشن تمنائے چیدن — بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اُٹھانے کی — فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

کہیں کہیں اسی صنعت کو ذرا سی تبدیلی کے ساتھ ایک ڈرامائی رنگ دے دیتے ہیں

اس صورت میں لب و لہجہ کا اتار چڑھاؤ ایک ہی شعر سے کئی کئی مطالب نکلوا دیتا ہے۔ مثلاً

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی" — بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ "ہاں کیوں ہو؟"

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا — ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں — بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

رات کے وقت مے پئے ساتھ رقیب کو لیے — آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

"غیر سے رات کیا بنی" یہ جو کہا تو دیکھیے — سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں

اس غزل میں ردیف اتنی معنی خیز ہے کہ لہجے کے اتار چڑھاؤ سے کئی کئی معنی نکل آتے ہیں۔ غالب کے لہجے میں ایک مخصوص ڈرامائی اندازِ بیان پایا جاتا ہے۔ اکثر اشعار میں خود کلامی کی سی کیفیت ہے۔ یہ خصوصیت غالب کو ان کے معاصر انگریز شاعر براؤننگ کی طرح ڈرامائی شاعری کا ادا شناس ٹھہراتی ہے۔ فرق یہ ہے کہ براؤننگ ایک نظم نگار تھا۔ اور اس خصوصیت کے اظہار کے لیے اس نے طویل نظم کا سہارا لیا۔ لیکن غالب غزل گو تھے۔ غزل کی اساس بیت پر ہے۔ یعنی ان کو انتہائی اختصار کے ساتھ دو مصرعوں پر مشتمل شعر میں پوری بات ادا کرنی پڑتی ہے۔

غالب کے کلام کی فکر انگیزی

غالب ایک عظیم شاعر تھے۔ اور زیرِ نظر مقالے میں ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان کی تمام خصوصیات پر بحث کی جائے۔ ہمارا مقصد صرف اتنا ہے کہ غالب کی عظمت کی نشاندہی کر کے قارئین کو غالب کے کلام میں دلچسپی لینے پر اُکسایا جائے۔ اس نقطۂ نظر سے غالب کے ماحول، شخصیت اور فکر و فن کی چند خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کلامِ غالب کی مقبولیت کا راز کیا ہے؟ ہمارا دور اگر دورِ شجاعت ہوتا تو ایسے شاعر کا کلام ہمارے لیے اپیل رکھتا جس میں بہادروں کے کارناموں کا تذکرہ ملتا ہو۔ ہمارا دور اگر اہلِ فکر کا دور ہوتا تو فلسفہ اور تصوف کی شاعری ہمارے لیے جذب و کشش رکھتی۔ اگر ہمارا دور شخصیت پرستی کا دور ہوتا، تو تاریخی شخصیتوں پر جن شعرا نے نظمیں لکھی ہیں۔ ان

کا کلام اس دور میں مقبول ہوتا۔ اتفاق یہ ہے کہ ہمارا دور سیاسی اور سماجی شعور کے ارتقا کا دور ہے۔ جس شاعر کے کلام میں سیاسی اور سماجی شعور سرے سے مفقود ہو۔ وہ آج مقبول خواص و عوام نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی مقبولیت کا راز ہمارے دور میں یہ ہے کہ ان کے کلام میں وہ مخصوص سیاسی اور سماجی شعور کارفرما نظر آتا ہے۔ جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ جوش کی مقبولیت کا راز ہمارے زمانے میں یہ ہے کہ ان کے کلام میں قومی جذبے کا وفور پایا جاتا ہے۔ ایک طرح سے یہ دور نفسیاتی دور بھی ہے۔ قوم کی قوم آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ لیکن انفرادی طور پر ہر شخص اپنے کو مجبور و مظلوم خیال کرتا ہے۔ ایسی شاعری جو انسانیت کو تسکین کا پیغام دے سکے اور ہمارے دکھ درد بیان کر کے ہمارے جذبات تک کا تنقیہ کر سکے۔ اس دور میں قبولِ عام حاصل کرے گی۔

وَلی کے دور سے جوشؔ و جگرؔ اور فیضؔ و فراقؔ کے دور تک ایسی پہلودار شخصیت ہمارے سامنے نہیں آئی۔ جیسی غالبؔ کی شخصیت تھی۔ غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ ان کے اشعار مختلف حالات میں اور مختلف ادوار میں ہمارے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ کوئی بھی صورتِ حالات کیوں نہ ہو؟ غالبؔ کا شعر حالات پر منطبق ہو جاتا ہے۔ غرضکہ بھرپور معنویت اور وسیع انسانی تجربے سے ہم آہنگی غالبؔ کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ معاملہ انفرادی ہو یا اجتماعی غالبؔ کے شعر سے حالات پر روشنی پڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ غالبؔ نے وہ شعر اُسی معنی میں کہا ہو۔ جس معنی میں ہم اُسے سمجھتے ہیں۔ لیکن شعر بہرحال ہمیں اپنے حالات کے مطابق محسوس ہوتا ہے۔

غالبؔ کی بڑی خصوصیت ان کا تفکر ہے۔ ہمارا دور جس طرح دورِ شجاعت نہیں ہے اسی طرح محض جذباتی شاعری کا دَور بھی نہیں ہے۔ تعلیم عام ہوتی جا رہی ہے، اور ہماری قوم کے ذہنی ارتقا کا عمل جاری ہے، اور شاعروں میں اقبال کے دور سے پہلے تفکر کو وہ اہمیت نہ تھی۔ جو غالبؔ کے کلام میں ہمیں ملتی ہے۔ غالبؔ نے جذبے کو تفکر کی کسوٹی پر پرکھ کر دیکھا۔ اس طرح شعر میں جذبات اور تفکر دونوں گھل مل گئے۔ اندازِ بیان میں رمز و کنایہ کا استعمال بھی تفکر کی نشاندہی کرتا ہے۔ بات کو اس طرح بیان کیا گیا کہ اشارہ کر دیا

جائے، اور بات سمجھ لی جائے۔ یہ ایمائی کیفیت ایسے قارئین ہی کے لیے جذب وکشش رکھ سکتی ہے۔ جو زیورِ علم سے آراستہ ہوں۔ غموں کو بھی نشاطیہ رنگ دے کر بیان کیا گیا۔ اس طرح غم کی شدّت کم ہوگئی۔ اور غم کا مقابلہ کرنے کی طاقت بڑھ گئی۔ اس نفسیاتی دور میں شخصیت کی اکائی ٹوٹتی جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شخصیت پارہ پارہ ہوتی جا رہی ہے۔ غالبؔ کے کلام میں جگہ جگہ اس کی شہادت ملتی ہے کہ انھیں شخصیت کے پارہ پارہ ہونے کا احساس ہے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے ذہن کے کس بل کے سہارے شخصیت کے بکھرے ہوئے اجزا کو یکجا رکھ سکتے تھے۔ ان کی شاعری کا پیغام ہے۔ یعنی خلا کا احساس موجود ہے لیکن ذہنی طاقت کی بنا پر وہ حالات سے مغلوب نہیں ہوتے۔

غالبؔ کے کلام میں ایک چاشنی ہے۔ نئے نئے استعارے، نئی نئی تشبیہیں، فرسودہ روایات سے رُوگردانی۔ دل نشیں تراکیب کا اختراع۔ اداے مطالب میں جدّت وندرت، الفاظ ومعانی کے امکانات پر نظر، ایجازِ بیان کے ذریعہ تھوڑی بات کہہ کر اشاروں میں بہت کچھ سمجھا دینے کی صلاحیت، اس قسم کی خصوصیات ہیں کہ آج کا قاری کلامِ غالبؔ سے پوری تسکین حاصل کر سکتا ہے۔ اس کے برخلاف دوسرے شعرا میں اگر کوئی ایک خصوصیت ملتی ہے۔ تو دوسری نہیں ملتی۔ لہٰذا مجموعی تاثر پیدا نہیں ہوتا اور تشنگی باقی رہ جاتی ہے۔ نشاطیہ اندازِ بیان سے غم کی کیفیت بھی پُر لطف و شیریں بن جاتی ہے۔ محاسنِ کلامِ غالبؔ میں ڈاکٹر عبدالرحمان بجنوری نے ایک مختصر سی فہرست ان تراکیب والفاظ کی پیش کی ہے۔ جن کو غالبؔ نے اُردو شاعری میں پہلے پہل استعمال کیا ہے۔ بعض ترکیبیں بڑی خیال افروز ہیں۔ مثلاً نبضِ خس، برگِ اوراک، طالعِ خاشاک، آئینۂ انتظار، سیاستِ دریا، نسیہ ونقدِ دو عالم، طعنۂ نایافت، ان کے علاوہ بھی بعض خوبصورت ترکیبیں غالبؔ نے وضع کی ہیں۔ جو انتہائی معنی خیز اور ناقابلِ فراموش ہیں۔ مثلاً ماتمِ یک شہرِ آرزو۔ ان ترکیبوں سے غالبؔ کی ایجاد پسند طبیعت کا اظہار ہوتا ہے۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا یہ ترکیبیں اجتہاد برائے

اجتہاد ہیں یا ہماری زبان کو فی الواقع ان ترکیبوں کی ضرورت تھی۔ کلامِ غالبؔ کا قاری اس نتیجے پر پہنچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ غالبؔ نے اُردو غزل کو بعض ایسے مضمون دیے جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نئے ہیں۔ ان مضامین کے لیے پہلے سے کوئی ذخیرۂ الفاظ موجود نہ تھا۔ نئے خیالات کے اظہار کے واسطے نئی زبان وجود میں آتی ہے۔ یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ چنانچہ غالبؔ کو نئے نئے الفاظ اور نئی نئی ترکیبیں ایجاد کرنی پڑیں۔ ورنہ جن خیالات کا اظہار مقصود تھا۔ ان کا ابلاغ ممکن نہ ہوتا۔ غالبؔ کی طرح مومنؔ نے بھی فارسی کی دلنشیں ترکیبیں وضع کیں۔ نزاکتِ خیال کے اعتبار سے مومنؔ کی نظیر نہیں۔ ان کے سامنے بھی یہی سوال تھا کہ کیونکہ شاعرانہ نازک خیالی کو الفاظ کا جامہ پہنایا جائے۔ یہاں غالبؔ و مومنؔ کا موازنہ مقصود نہیں۔ ورنہ ثابت کیا جا سکتا تھا کہ غالبؔ کے خیالات میں گہرائی ہے اور مومنؔ کے کلام میں نازک خیالی۔ لیکن غالبؔ اور مومنؔ میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ دونوں نے دلنشیں فارسی تراکیب اختراع کیں۔ بیسویں صدی کی اُردو غزل میں صفیؔ، عزیزؔ، محشرؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، فانیؔ، جگرؔ، جوشؔ، فراقؔ، فیضؔ اور نظم نگاری کی دنیا میں اقبالؔ، جوشؔ، چکبستؔ، محرومؔ۔ غرضکہ خاص داغؔ، امیرؔ اور جلالؔ کے تلامذہ کو چھوڑتے ہوئے اردو نظم و غزل کو غالبؔ نے ایک نئی زبان عطا کی۔ اس زبان میں فارسی کی دلنشیں اور معنی خیز ترکیبوں کی بہتات ہے۔ ان شعرا میں سے اکثر نے غالبؔ و مومنؔ کی ترکیبوں سے فائدہ اُٹھایا ہے اور بعض نے حسبِ موقع و حسبِ ضرورت ان ترکیبوں کو سامنے رکھ کر نئی ترکیبیں وضع کیں اور اس طرح زبان کو نئی وسعت اور نئی معنویت بخشی۔ ایسی ترکیبوں کی بدولت ہی خیالات کے دریا کو شاعر کوزے میں بند کرتا ہے اور چند الفاظ میں بہت کچھ کہہ دیتا ہے۔

شاعری میں زبان کا مسئلہ ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ غزل کی شاعری میں خصوصاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا الفاظ کی حیثیت شطرنج کے مہروں کی سی ہے۔ جن میں کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ وہی گنتی کے چند خیالات ہیں۔ ہجر و وصال، جفائے معشوق، ستمِ روزگار، گردشِ فلک، ان خیالات سے پیوستہ چند علامات ہیں۔ گل و بلبل، شمع و پروانہ

طور و موسیٰ، جام و ساقی۔ ان خیالات و علامات کے ساتھ ہم رشتہ عاشق کی خود آزار طبیعت ہے۔ جس کو شاعرِ غزل کی شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر اس عاشق کا آزار پسند محبوب ہے جس کی تمام صفاتِ حسن اگرچہ عورتوں کی سی ہیں۔ لیکن اسے مرد کے طور پر مخاطب کیا جاتا ہے۔ اس طرح ایک مخصوص فضا بنتی ہے۔ جس کے لیے ایک مخصوص زبان ہے جسے غزل کی زبان کہا جاتا ہے۔ پس غزل کی کیفیت شطرنج کے کھیل کی سی ہے جس میں الفاظ مہرے ہیں۔ ہر مہرے کی چال متعین ہے۔ غزل کی عمومیت کی بڑی وجہ غزل کی زبان ہے۔ چنانچہ بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے شاعر کے کلام میں ایک قسم کی یکسانیت موجود ہونا فطری اور منطقی ہے۔ اس کے باوجود عظیم شاعر وہی ہے، جو عمومیت میں انفرادیت کی شان پیدا کر سکے۔ غالبؔ جیسے عظیم فن کار غزل کی حدود میں رہ کر غزل کی عمومیت سے بلند ہو جاتے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو غالبؔ نے غزل میں ایک جدت پیدا کی ہے۔ غالبؔ کی شاعری محض شطرنج کا کھیل نہیں۔ اکثر اوقات غالبؔ نے بھی غزل کی زبان غزل کے مضامین اور غزل کی علامات سے باہر نکلے بغیر نئے خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن بعض اوقات وہ اجتہاد کی مسند پر فائز نظر آتے ہیں اور اردو غزل کو نئی زبان اور نئے ذخیرۂ الفاظ سے روشناس کراتے ہیں۔ اس طرح وہ ایک نئی روایت قائم کرتے ہیں۔ غالبؔ نے ہماری شاعری کو خیال اور زبان کے اعتبار سے نئی وسعت دے کر غزل کو نئی زندگی بخشی ہے۔ نئے احساس اور نئے خیالات رکھنے والے شعرا کو اس طرح ایک مثالی نمونہ ہاتھ آ گیا، اور آنے والے شاعروں کے لیے راستہ کھُل گیا کہ نئی بات کہنی ہو تو اُس کے مطابق زبان ایجاد کرو۔

اس کے برخلاف لکھنؤ میں ناسخؔ نے اور دہلی میں داغؔ نے اصلاحِ زبان کی ضرورت محسوس کر کے الفاظ کی ایک۔ اچھی خاصی تعداد کو متروک قرار دیا۔ لیکن نئے الفاظ کو رواج دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس طرح زبان کا دامن غیر شاعرانہ الفاظ سے پاک تو ہو گیا۔ لیکن وسیع ہونے کی بجائے اور بھی تنگ ہو گیا۔

ہمارے دَور میں غالبؔ کی مقبولیت کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ غالبؔ وہی طرزِ احساس رکھتے ہیں۔ جو ہمارے دور کی خصوصیت ہے۔ اُوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ.....

فکر انگیزی کے اعتبار سے غالبؔ کا کلام دوسرے شعرا کے کلام سے ممتاز ہے۔ جہاں تک تشبیہہ واستعارہ کا تعلق ہے۔ غالبؔ کا طرزِ احساس ہمارے زمانے کے طرزِ احساس سے ملتا ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں انگلستان، فرانس اور جرمنی تینوں ملکوں میں ایسے مدرسہ ہائے فکر پیداہوئے جنھوں نے حسی تشبیہہ کو شاعری کا ماحصل قرار دیا۔ یہ حالت کم وبیش بیسویں صدی کے ربع اوّل تک قائم رہی۔ اس سلسلے میں اگر نام گنوائے جائیں تو ایک پوری فہرست مرتّب ہو سکتی ہے۔ مثال کے طور پر بودلیئر، رانبو، رلکے، ایذرا پاؤنڈ اور ایلیٹ۔ فرانسیسی، جرمن اور انگریزی شاعری میں اس رجحان کے نمائندہ شاعر قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ یہی رجحان غالبؔ کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ درانحالیکہ غالبؔ کو تاریخی اعتبار سے ان شعرا پر اوّلیت حاصل ہے۔ علاوہ ازیں غالبؔ کے وہم وگمان میں بھی نہ ہو سکتا کہ ایسا کوئی مدرسۂ فکر کسی جگہ قائم ہے۔ غالبؔ کی حسی تشبیہات کے متعلق اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ان کے اس قسم کے اشعار میں امتزاجِ حسیات یا حسِ مرکب[1] کا استعمال ملتا ہے یعنی بعض اوقات ان کی تشبیہوں اور استعاروں میں ایک حس کے علاوہ ایک سے زیادہ حسیات کی کارفرمائی بھی نظر آتی ہے ؎

ویرانیٔ جز آمد و رفتِ نفس نہیں ——— ہے کوچہ ہائے نے میں غبارِ صدا بلند

جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا ——— اے وائے! نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

وصالِ جلوہ تماشا ہے پر دماغ کہاں ——— کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرواز

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق ——— لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے ——— سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے

ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج ——— میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

تمثالِ جلوہ عرض کر اے حُسن کب تلک ——— آئینۂ خیال میں دیکھا کرے کوئی

کہیں آنکھ کو کان اور کہیں دل کو نظر کا مدِّ مقابل ثابت کرتے ہیں۔ یہ طرزِ احساس اس قدر جدید ہے کہ ایسے اشعار کو انسانی نفسیات کے سمجھنے میں مثال کے طور پر پیش کیا

---

[1] حسِ مرکب SYNAESTHESIA

جاسکتا ہے اور ان کا تجزیہ نفسیات میں اضافے کا موجب ہو سکتا ہے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب — نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

خبر نگہ کو نگہ چشم کو عدو جانے — وہ جلوہ کر کہ نہ میں جانوں اور نہ تو جانے

دل مدّعی و دیدہ بنا مدّعا علیہ — نظّارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال — مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

تصوّف کے ساتھ جو غالب کا گہرا تعلق ہے۔ اس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے یہ کہہ دینا آسان ہے کہ غالب نے "تصوّف برائے شعر گفتن خوب است" کا اصول اپنایا ہے۔ اور ان کا تصوّف واردانی و تجرباتی نہیں بلکہ اکتسابی ہے۔ دراصل عظیم شاعر کی ایک پہچان یہ ہے کہ اس کا روحانی تجربہ خواہ اس تجربے کا سرچشمہ ہمدردی ہی کیوں نہ ہو اور اس تجربے کی بنیاد مطالعے اور مشاہدے ہی پر کیوں نہ ہو۔ اتنا گہرا اور سچا ہوتا ہے کہ اُسے محض اکتسابی یا علمی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ نشۂ مے اور روحانی کیفیت کے درمیان ایک قدر مشترک بھی ہوتی ہے۔ جس سے غالب نے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ چنانچہ تصوّف کے بعض اشعار غالب نے ایسے کہے ہیں جن پر واردانی ہونے کا گمان ہوتا ہے سہ

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا — کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا — درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

وا کر دیئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن — غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اے بہ خلا و ملا خوئے تو ہنگامہ زا — با ہمہ در گفتگو بے ہمہ و ر ماجرا

بزم ترا شمع و گل خستگیِ بوتراب — ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

تصوّف میں یہ کہنا کہ یہاں تک اسلامی تصوّف ہے۔ اور اس سے آگے ویدانتی تصوّف ہے یا ایرانی یا مسیحی تصوّف ہے، کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی زمانے میں

ریلوے اسٹیشن پر اس قسم کی آوازیں سننے میں آتی تھیں کہ یہ" اسلامی چائے" ہے اور یہ "ہندو پانی" ہے۔ تصوّف دراصل درجہ بندی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے جن اشعار میں معرفت کا رنگ ہے۔ وہ ہر مذہب اور ہر ملّت والے کو یکساں طور پر متاثر کرتے ہیں۔ میرے سامنے غالب کی ایک غزل ہے۔ اور میں اس کو جب بھی پڑھتا ہوں یہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنشد کا فلسفہ اس غزل میں اس طرح بند کر دیا ہے، جیسے دریا کوزے میں۔ اس غزل میں ایک قطعہ ہے ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود　　پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں　　غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟　　نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟　　ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ذاتِ الٰہی کو صفات سے مبرّا قرار دینا اپنشد ہی کا فلسفہ نہیں ہے۔ بعض اسلامی فرقوں میں بھی یہی عقیدہ پایا جاتا ہے۔ ہندو فلسفی کہتے ہیں کہ برہما نرگن ہے، پھر برہما خلّاقِ عالم بھی ہے۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ذاتِ الٰہی صفات سے مبرّا ہے تو اشیائے عالم میں جو صفات ہمیں نظر آتی ہیں وہ کہاں سے آئی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا مایا ہے۔ مایا کے ایک معنی یہ ہیں کہ وہ محض سراب ہے۔ یعنی ہے اور نہیں بھی ہے دیکھنے میں موجود ہے مگر حقیقت میں کچھ بھی نہیں۔ یہ تصوّر اپنشد کے علاوہ بدھ مت کے فلسفے میں بھی ملتا ہے۔ بلکہ بدھ مت میں حقیقتِ اشیا کو کوئی حیثیت نہیں دی گئی ہے اور وہ سب کی سب عارضی اور اضافی ہیں۔ اپنشد میں بعینہٖ یہ صورت تو نہیں ہے۔ لیکن ثنویت بھی نہیں ہے۔ یعنی یہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس عالمِ اسباب کی بنیاد برہما اور مایا پر ہے۔ یہ کہا جائے تو ایک قسم کی ثنویت پیدا ہوتی ہے۔ غالب اس غزل کے اندر اسی مسئلے میں سرگرداں نظر آتے ہیں کہ حقیقتِ مطلق ذاتِ خداوندی ہے، یا برہما اور مایا دونوں حقیقی ہیں یا ایسا ہے کہ ذاتِ الٰہی اپنی تشریح و تفسیر کے لیے مایا جیسی چیز تخلیق کرتی ہے کہ اس

لہ ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی ــــ ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے۔

کے ذریعے ذاتِ حقیقی کو سمجھا اور جانا جا سکے (یعنی مایا بے اصل نہیں، مگر برہما کے سامنے بے اصل ہے)

غالبؔ کی پہلو دار شخصیت میں غور و فکر کے لیے اتنا کچھ موجود ہے کہ مطالعہ کرنے والا کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا۔ جہاں تک اس کا مطالعہ ہے، اور جہاں تک سمجھنے کی استعداد اس کو حاصل ہے۔ غالبؔ کے کلام کی بلاغت اسے اسی حد تک اور اُسی معنی میں تسکین پہنچاتی ہے۔ مثلاً ہم چاہیں اپنشد کا فلسفہ درمیان میں لائے بغیر اسی قطعے سے وحدتِ وجود کا ثبوت ڈھونڈ سکتے ہیں۔ یعنی اس عالمِ مشاہدات میں جو کچھ ہے ذاتِ الٰہی کی بدولت ہے ـــــ افکارِ غالبؔ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اس قطعے کی تفسیر اسلامی تصوّف کی روشنی میں تشفی بخش طریق پر کی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ غالبؔ "رندِ ہزار شیوہ" تھا۔

غالبؔ کے بعض اشعار میں فلسفۂ تشکیک کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔ بیسویں صدی کو نشانِ استفہام یا سوالیہ نشان (؟) کہہ کر پکارا گیا ہے۔ انیسویں صدی تک انسان کو عقل اور قوتِ ایجاد پر بڑا ناز تھا۔ لیکن اب ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہے۔ نہ ہمیں اپنی ذات پر یقین ہے۔ نہ کسی دوسری ذات پر۔ اب یہ عالم ہے کہ ماہرینِ سائنس اپنے تمام علم و فضل کے باوجود محسوس کرنے لگے ہیں کہ انھیں ایک ذرّے کا بھی علم نہیں ہے۔ غالبؔ نے فلسفۂ تشکیک کی ترجمانی کر کے گویا ہمارے دَور کی ترجمانی کی ہے۔ تشکیک کے ساتھ ساتھ ایک طنزیہ طرزِ فکر بھی غالبؔ کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ اس طنزیہ فکر کو طنّازانہ بصیرت کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ گویا غالبؔ ان لوگوں پر ہنس رہے ہیں جنھیں اپنے یقین و ایمان پر ناز ہے۔ غالبؔ کا طنز ایسے لوگوں کے خلاف تو ہے ہی۔ لیکن اس کا رُخ کبھی کبھی وہ اپنی طرف بھی موڑ لیتے ہیں۔ اور کبھی کبھی حیات و کائنات کی قوتوں کو بھی ہدفِ طنز قرار دے لیتے ہیں۔ یعنی یہ طنز لامحدود ہے یہ طرزِ فکر جدید طرزِ فکر سے اس قدر ہم آہنگ ہے کہ غالبؔ کا شعر ہمیں اپنا ہی خیال معلوم ہوتا ہے۔

کسی شاعر کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمارے علم میں اضافہ کرے۔ شاعروں کی

کائنات اپنی جگہ ایک مطلق کائنات ہے۔ شاعری کا مقصد جمالیاتی تسکین کے علاوہ کچھ نہیں
افلاطون کے زمانے سے اہلِ فلسفہ شاعری کا مقصد جمالیاتی تسکین کے علاوہ اخلاقی و علمی
بھی مانتے آئے ہیں۔ افلاطون نے اپنی مثالی جمہوریہ سے شاعروں کو اس بنا پر ملک بدر کر دیا
تھا کہ افلاطونی دَور کے شاعر اپنی نظموں کے ذریعے اخلاق کی تعلیم نہیں دیتے تھے۔ بلکہ
اخلاق سوز خیالات کی تبلیغ کرتے تھے۔ اور لوگوں کو اچھا شہری بننے کی بجائے جذباتیت
میں مبتلا کرنا چاہتے تھے۔ افلاطون کے بعد ارسطو آیا۔ اس نے جمالیاتی تسکین کے پردے
میں اخلاقی تعلیم کو شاعری کا مقصد قرار دیا۔ لیکن اس دَور میں ہم شاعری سے اس قسم
کا مطالبہ نہیں کرتے۔ یوں تو شاعری اس معنی میں ہمارے علم میں اضافہ کرتی ہے کہ ہر نئی نظم
اور ہر نئی غزل لکھے جانے سے پہلے غیر موجود تھی، اور لکھے جانے کے بعد اس نے ادب
میں اضافہ کیا۔ لیکن جہاں تک علمی اور اخلاقی مطالبے کا تقاضا ہے۔ شاعری اسے پورا
کرنے کے لیے مجبور نہیں۔ شاعری کی ایک اپنی دنیا ہے۔ شاعری کو جن اصولوں پر پرکھنا
چاہیے وہ خود شعر و ادب کے اصول ہوں تو مناسب ہے۔ خارجی دنیا سے اصول لے کر
انھیں شاعری پر منطبق کرنا اسی قسم کی ایک صریح غلطی ہو گی۔ جیسے سائنس یا قانون یا
کسی دوسرے شعبۂ علم پر خارجی اصولوں کا اطلاق۔ چنانچہ ہم غالبؔ سے یہ امید کیوں
رکھیں کہ اس نے ہمیں کوئی ایسا پیغام دیا ہو گا۔ جو شاعری کا منصب نہیں۔ اس کے
باوجود جہاں تک دورِ جدید کا تعلق ہے۔ غالبؔ کا کلام جمالیاتی تسکین بھی دیتا ہے اور
ہمیں سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ آج وہی شاعر بڑا کہلا سکتا ہے جس کے کلام میں فکری عنصر
موجود ہو۔ محض جمالیاتی تسکین کسی شاعر کو عظیم شاعر نہیں بنا سکتی۔

غالبؔ کی شخصیت پر غور کرتے وقت یہ حقیقت ہمارے سامنے آتی ہے کہ جب
اس شخصیت کا عکس غالبؔ کے کلام میں نمایاں ہوتا ہے۔ تو ہمارے سامنے مختلف النوع
مضامین کا انبار لگ جاتا ہے۔ خود اپنا غم اور اپنے زمانے کا غم اور غم کا مقابلہ کرنے
کی طاقت، پھر مختلف قسم کے تجربے مثلاً واردات عشق، واردات تصوّف، وحدت الوجود
اور اس سے پیدا ہونے والے مراحل، حقیقت اشیا تک پہنچنے کی کوشش زندگی کے

متعلق ایک رجائی زاویۂ نگاہ زندگی کے جمالیاتی پہلوؤں سے لطف اندوز ہونے کی کوشش، مابعد الطبیعاتی مسائل پر تبصرہ اور ان سب سے زیادہ ایک متجسسانہ اور ناقدانہ نقطۂ نظر کسی ایک شاعر کے کلام میں اتنے مختلف قسم کے عناصر یک جا نظر نہیں آتے۔ اسی لیے غالب کی شاعری مختلف طبائع کے قارئین کو بیک وقت مطمئن کرنے میں کامیاب ہوئی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ غالب نے ایک مفکر شاعر کی حیثیت سے ہمارے علم میں اضافہ کیا ہے یا نہیں؟ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک متجسسانہ نقطۂ نظر رکھنے والا شاعر دورِ جدید کے تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ تشکیک و تجسس بیسویں صدی عیسوی کی ایک مسلّمہ خصوصیت ہے۔ غالب کے کلام میں حقیقتِ اشیا تک پہنچنے کی خواہش بنیادی جذبے کی حیثیت رکھتی ہے۔ خدا کی ذات سے خود اپنی ذات تک غالب ہر چیز کو جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ سنی سنائی باتوں پر ان کا یقین نہیں۔ چنانچہ مابعد الطبیعاتی مسائل کا روایتی حل غالب کو مطمئن نہیں کر سکا۔ یہی ان کی تشکیک کا راز ہے۔ ہمارا دور تجسس اور تنقید کا دور ہے۔ غالب نہ صرف ہر چیز کو جاننا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ ہر مسئلے پر بیباکی کے ساتھ تنقید بھی کرتے ہیں۔ ان کی تنقید عام طور پر طنز کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ خصوصیت اس لحاظ سے اور بھی قابلِ قدر ہے کہ غالب کے دور میں ہندوستان تو ایک طرف خود یورپ میں بھی تنقید اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ مشہور انگریز شاعر و نقاد آرنلڈ[1] نے اپنے ناقدانہ مقالوں میں بار بار یہ شکایت کی ہے کہ اہلِ انگلستان میں وہ تنقیدی شعور ابھی پیدا نہیں ہوا جو وقت کا اہم تقاضا ہے۔ اس سلسلے میں آرنلڈ نے انگریز قوم کا مقابلہ دیگر یورپین اقوام سے کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ تنقیدی شعور موجودہ زمانے میں اگر پایا جاتا ہے تو فقط اہلِ فرانس میں۔ لہٰذا انگریز قوم اہلِ فرانس سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ آرنلڈ غالب کا ہم عصر تھا۔ انگریز قوم کے متعلق آرنلڈ کا زاویۂ نگاہ جو کچھ بھی ہو۔ اہلِ ہند کو تنقیدی شعور کی ہوا تک بھی نہیں لگی تھی۔ چنانچہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ اُس دور میں ہندوستان جیسے روایت پرست ملک میں ایک شاعر پیدا ہو جس کی شاعری سراسر تنقیدِ حیات ہے اور جس کا زاویۂ نگاہ

---

[1] میتھو آرنلڈ (پیدائش ۱۸۲۲ء و وفات ۱۸۸۸ء) یہاں یہ دعویٰ ہرگز نہیں کیا جا رہا ہے کہ ہندوستان اور انگلستان میں تنقیدی اعتبار سے کوئی مقابلہ ہو سکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ غالب تنقیدی شعور کے معاملے میں اپنے دور سے آگے تھے۔

متجسسانہ ہے۔ یہ بات کھل کر ہمارے سامنے اس لیے نہیں آئی کہ غالب نقّاد نہ تھے، صرف شاعر تھے۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے دور سے بہت آگے ہیں۔ بلکہ درحقیقت دورِ حاضر کی ترجمانی اقبالؔ سے پہلے اگر ملتی ہے تو کلامِ غالب میں۔

غالبؔ کی داخلیّت اور معروضیّت

ہمارے دَور کے ایک خوش گو شاعر اور ممتاز نقّاد نے[1] میرؔ و غالبؔ کا مطالعہ ایک نئے انداز سے کیا ہے۔ انھوں نے کردار اور شخصیّت کا مسئلہ اُٹھایا ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غالبؔ کے ہاں وہ داخلیت نہیں ملتی۔ جو میرؔ کے کلام کا جوہر ہے۔ کردار اور شخصیّت خارجیّت اور داخلیّت کا دوسرا نام ہے۔ میرؔ اپنی ذات میں کھوئے ہوئے ہیں۔ اور ان کی شاعری ان کی شخصیّت کی ترجمانی کرتی ہے۔ لیکن غالبؔ کے کردار پر خارجی دنیا کے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے غالبؔ کی شاعری ان کے کردار کی عکاسی کرتی ہے۔ میرؔ و غالبؔ کو ہم رومانیت اور کلاسکیت کا نمائندہ قرار دے سکتے ہیں۔ میرؔ کی شاعری شخصیّت کی ترجمانی کی بنا پر رومانی شاعری کہلائی جا سکتی ہے اور اس کے برعکس غالبؔ کی شاعری کو کلاسیکی شاعری کہنا بجا ہوگا۔ یہ طریقِ فکر بڑا خیال انگیز ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مصنّف میرؔ پرست ہیں۔ اور غالبؔ کے کلام سے انھیں گہرا لگاؤ نہیں۔ اوّل تو یہ طریقِ تنقید ہمارے لیے کچھ زیادہ فائدہ مند نہیں۔ یہ طرزِ تنقید مدّرسین کا شیوہ رہا ہے۔ مدرسین کا طریقہ یہ ہے کہ موازنہ و مقابلہ ان کے نزدیک تنقید کا فرضِ اوّلین ہے۔ کبھی میرؔ کو سوداؔ سے بھڑا دیا اور ثابت کر دکھایا کہ دونوں کے درمیان چند باتیں مشترک ہیں اور چند متضاد۔ ایک کا کلام "آہ" ہے اور دوسرے کا "واہ"۔ کبھی ذوقؔ و مومنؔ اور غالبؔ کا تِگڈّا لڑا دیا۔ اس قسم کا موازنہ و مقابلہ مدّرسین کا شعار رہا ہے۔ چنانچہ میرؔ اور غالبؔ کا مقابلہ بھی ایسی ہی کوئی چیز ہے۔ اس سے مختلف نہیں۔ دوسرے فاضل نقّاد نے معروضیّت کی مثال ڈھونڈھی بھی تو کلامِ غالب سے۔ دراصل معروضیّت کی صحیح مثال سوداؔ کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ اور اگر

---

[1] مطالعۂ غالب از میرزا جعفر علی خاں اثر لکھنوی

مدرّسین کا طریقہ برتا جائے تب بھی یہ کہنا پڑے گا کہ غالب ایک درمیانی مقام پر فائز ہیں۔ نہ تو ان کے ہاں میر کی سی خالص داخلیت ہے اور نہ سودا کی سی انتہائی معروضیت۔ ہم نے غالب کی شخصیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اور ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ غالب کی شخصیت ایک ہمہ جہت شخصیت تھی۔ اگر موسیقی کی زبان استعمال کی جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ میر کی شاعری ایک نغمہ ہے، جو ایک تار سے نکل رہا ہے۔ اور غالب کی شاعری وہ نغمہ ہے، جو مختلف سازوں کی ہم آہنگی سے پیدا ہو رہا ہے۔ بڑے شاعر کے ہاں کلاسیکیت اور رومانیت، شخصیت اور کردار داخلیت اور معروضیت میں امتیاز نہیں ہوتا۔ گرد و پیش کے عوامل بھی اُسے متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اس کی ذات ہی اس کے لیے ایک کائنات ہوتی ہے۔ فاضل نقاد کے سامنے غالبًا انگریزی شاعری کی مثال تھی۔ مغربی شاعری کا ایک اہم شعبہ ڈرامائی شاعری ہے۔ اور ڈرامہ نگار کو اپنی شخصیت کو بھول جانا پڑتا ہے۔ ڈرامہ نگار کا کام یہ ہے کہ کردار کو واقعات میں سے گزارے اور یہ دکھائے کہ کردار کس حد تک واقعات کی وجہ سے بدلتا ہے اور ارتقا پذیر ہوتا ہے۔ لیکن مشرقی شاعری میں اور خصوصیت کے ساتھ فارسی اور اردو شاعری میں ڈرامہ نگاری کا کوئی عمل دخل نہیں رہا۔ اس کے علاوہ غزل کی صنف ایک ایسی صنف ہے۔ جو نہ داخلی ہے نہ معروضی نہ کلاسیکی ہے نہ رومانی۔ غزل کو مغربی اصول تنقید پر نہیں پرکھا جا سکتا۔ غزل کو پرکھنے کے پیمانے باہر سے مستعار نہیں لیے جا سکتے۔ اس کے لیے خاص پیمانے وضع کرنے پڑیں گے، جن کا تعلق غزل گوئی کی روایت سے ہو۔ سچ پوچھیے تو غزل ایک عمومی صنفِ سخن ہے۔ لیکن عظیم غزل گو شعرا نے اس عمومی صنفِ سخن میں اپنی انفرادی شخصیت کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ عمومیت بھی برقرار رہی ہے اور انفرادیت کا رنگ بھی نمایاں ہو گیا ہے۔ غالب کی غزل کے متعلق یہ دعویٰ کرنا بجا ہو گا کہ یہ غالب کی شخصیت کے اظہار کا ذریعہ ہے روایت کی حدود میں رہتے ہوئے اس میں ایک انفرادی شان موجود ہے۔

کلامِ غالب کی تہذیبی قدر و قیمت

اس مقالے میں کلامِ غالب کا سرسری مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کوشش نہیں کی گئی کہ کسی خاص نقطۂ نظر کو

اپنایا جائے یا کسی مخصوص زاویے سے کلامِ غالبؔ پر بحث کی جائے یا کوئی مربوط طریقۂ فکر اختیار کر کے فلسفیانہ انداز میں غالبؔ کی شاعرانہ عظمت ثابت کی جائے۔ البتہ مارکسی طریقۂ تنقید کو سامنے رکھ کر غالبؔ کے ماحول پر نظر ڈالی گئی ہے، اور نفسیاتی طرزِ تنقید کے تحت غالبؔ کی شخصیت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان دونوں طریقوں کو مربوط کر کے غالبؔ کے فکر و فن پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُس کے پیشِ نظر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہند ایرانی کلچر کا ایسا نادر نمونہ کسی دوسرے فن کار کی کاوشوں میں شاید ہی مل سکے۔ اس لحاظ سے کلامِ غالبؔ ہند ایرانی یا اسلامی ہندی تہذیب کا بے مثال شاہکار ہے۔ کلامِ غالبؔ کے علاوہ دوسرا ایسا شاہکار غالباً تاج محل کے سوا کوئی نہیں۔ خود اُردو زبان ایرانی کلچر کی پیداوار ہے۔ یا ہندو مسلم تہذیبوں کے میل ملاپ کا نتیجہ ہے اور جب یہ زبان اس قابل ہوئی کہ نازک جذبات اور بلند خیالات کی ترجمانی کر سکے، تو قدرت نے اس کو عظیم شاعر عطا کیا جس نے ماضی و حال و مستقبل تینوں زمانوں کی عکاسی کا حق ادا کیا۔

نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت

یہ کہنا آسان ہے کہ غالبؔ نے اپنے کلام کے جس حصے پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا تھا۔ اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مروّجہ دیوانِ غالبؔ ہی غالبؔ کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے کہ یہ دیوان غالبؔ اور ان کے فاضل روزگار احباب کے حسنِ انتخاب کا نتیجہ ہے۔ آخر کوئی تو بات ہوگی جو غزلیں کی غزلیں اصل مجموعۂ کلام سے خارج کر دی گئیں، اور بعض غزلوں کے اشعار قلمزد کر دیئے گئے۔ یہ سب کچھ بجا اور درست لیکن مروّجہ دیوان میں بھی ایسے اشعار کی کمی نہیں۔ جنھیں سمجھنا اور سمجھانا کارے دارد۔ اس کے ساتھ ہی نسخۂ حمیدیہ میں بلند پایہ اشعار کی کمی نہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ انتخاب کرنے والوں کو یہ اشعار پسند نہ آئے ہوں۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ زمانہ غالبؔ پرستی کا زمانہ ہے اور ایسے زمانے میں کلامِ غالبؔ کے وہ نمونے بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں جو خود غالبؔ کے معیار کے مطابق نہ تھے۔ جب ہم کسی ادب پارے کو بلند کرنے پر آ جائیں تو کمزور حتیٰ کہ بے معنی اشعار کو بھی معنی پہنا سکتے ہیں۔ اور ان اشعار میں ان گہرائیوں کا سراغ لگا سکتے

ہیں۔ جو خود شاعر کے خیال تک میں بھی نہ تھیں۔ اس میں شک نہیں کہ کلامِ غالب کا ایک حصہ آسانی کے ساتھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اس موقع پر مفسرینِ کلامِ غالب اپنی خدمات پیش کر دیتے ہیں اور اپنی تشریحات میں علم و فضل کے دریا بہا دیتے ہیں۔ یہ کچھ غالب ہی کے ساتھ مخصوص نہیں مشرق و مغرب میں ایسے شارحین کی کمی نہیں ہے۔ جو اپنی تشریحات میں وہ سب کچھ انڈیل دیتے ہیں جو ان کے اندر موجود ہوتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس علم و فضل کی نمائش سے اصل کلام کا کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ اس صورتِ حال میں یہ امر غور طلب ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت کیا ہو سکتی ہے۔

غالب کی شاعری کے تین دور ہیں متعلمینِ کلامِ غالب اس بات پر متفق ہیں کہ اوّل غالب نے اردو میں شعر کہنا شروع کیا۔ مادری زبان غالب کی اُردو ہی تھی۔ باپ کی زبان فارسی۔ گھر میں دونوں زبانیں استعمال کی جاتی ہوں گی۔ فارسی کے ساتھ مرزا غالب کو جو شغف تھا وہ محتاجِ بیان نہیں اس لیے ممکن ہے کہ بھولے بھٹکے فارسی میں بھی شعر کہہ لیتے ہوں لیکن باقاعدگی کے ساتھ انھوں نے دس گیارہ برس کی عمر سے یا حد درجے پندرہ برس کی عمر سے اردو میں شاعری شروع کی۔ اس ابتدائی شاعری کا حصہ ضرور نسخۂ حمیدیہ میں موجود ہونے کا امکان ہے۔ شعور کی پختگی کے ساتھ فارسی کی طرف میلان بڑھتا گیا۔ اور بہترین ایرانی شعرا کی زمینوں میں طبیعت کے جوہر دکھانے لگے۔ یہ ان کی شاعری کا دوسرا دور ہے۔ اس دور میں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں زورِ بیان دکھاتے رہے۔ لیکن خطوط کی زبان فارسی ہی تھی۔ دہلی میں ذوق و مومن کے سامنے پہلے پہلے ان کا چراغ نہ جلا۔ البتہ ایک مخصوص علمی حلقہ ایسا تھا۔ جو ان کے اردو کلام کی بھی ایسی ہی قدر دانی کرتا تھا۔ جیسی ان کے فارسی کلام کی۔ رفتہ رفتہ فارسی میں مکتوب نگاری موقوف ہوئی۔ اس وقت تک غالب کا شمار اپنے دور کے اساتذۂ اُردو میں ہونے لگا۔ یہ ان کی شاعری کا تیسرا اور آخری دور ہے۔

اگر یہ تاریخی جائزہ صحیح ہے تو نسخۂ حمیدیہ کی اہمیت میں کوئی کلام نہیں ہو سکتا۔ اس نسخے میں غالب کا ابتدائی کلام محفوظ ہے۔ غالب کی شاعری کا ارتقا دیکھنا ہو، تو نسخۂ حمیدیہ کو پیشِ نظر رکھنا پڑے گا۔ ابتدا میں جو رنگ ہے وہ کس طرح تبدیل ہوتا ہے اور کیونکر ترقی کرتا ہے، نسخۂ حمیدیہ کی اکثر غزلوں میں زبان ضرورت سے زیادہ فارسی آمیز ہے۔ اس کے برخلاف غالب کے آخری دور کی غزلیں سہلِ ممتنع کی بہترین مثال ہیں۔ غالب کی زبان کیونکر منجھی

اور صاف ہوئی۔ یہی حال خیالات کا ہے۔ ابتدائی دَور کی شاعری میں نکتہ آفرینی پائی جاتی ہے۔ یہ دَور وہ تھا جب غالب بیدل سے متاثر تھے رفتہ رفتہ حیات و کائنات کے مسائل نے ان کی توجہ کا دامن کھینچا۔ آخر میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زبان بھی سادہ ہو گئی ہے، اور خیالات بھی سادہ ہیں۔ اس دور میں ان کے اشعار سلیس و عام فہم ہو گئے۔ اس دَور تک پہنچتے پہنچتے ان کے خیالات بھی الجھنوں سے پاک ہو گئے۔ تجربے کی وسعت اور گہرائی اس آخری دَور کے کلام میں بھی موجود تھے۔ مگر وہ پہلی سی بات کہاں؟ بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر تھک چکا ہے۔ اور آخری منزل کا سفر نظروں کے سامنے ہے۔ اس پورے ارتقائی عمل کو سمجھنے میں نسخۂ حمیدیہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔ یہاں صرف غالب کی اُردو شاعری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نسخۂ حمیدیہ والی شاعری غالب کی فارسی گوئی کے ارتقا کی آئینہ دار بھی ہے۔ غالب کی فارسی شاعری پر نظر ڈالیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں جھول ہے ہی نہیں۔ عموماً ایسا نہیں ہوا کرتا۔ اگر غالب نے ابتدا سے فارسی ہی میں شعر کہا ہوتا۔ تو ان کے کلام کے ایسے نمونے موجود ہوتے۔ جنھیں ان کی ابتدائی مشق کا نتیجہ کہا جا سکتا۔ لیکن ہوا یہ کہ اُردو میں مشقِ سخن کرنے کے بعد جب غالب سنجیدگی کے ساتھ فارسی شعر گوئی پر آمادہ ہوئے۔ تو ان کی ریاضت کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اسی لیے کلیاتِ فارسی میں نومشقی کے نمونے موجود نہیں۔ غرضکہ نسخۂ حمیدیہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں غالب کے ارتقائے شعری کا سراغ ملتا ہے۔ نسخۂ حمیدیہ میں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جو اگرچہ ابتدائی دور سے تعلق نہیں رکھتے۔ لیکن کمزور یا غالب کے نزدیک ناپسندیدہ ہونے کی بنا پر خارج کر دیے گئے تھے۔ ایسے اشعار سے غالب کے شعری ذوق و معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ چنانچہ ان اشعار کا مطالعہ غالب کے متعلم کے لیے ازبس ضروری ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کے بیشتر اشعار عوام کے لیے دلبستگی کا سامان نہیں رکھ سکتے۔ اس نسخے کا مطالعہ غالب کے نقّادوں کے لیے ناگزیر ہے لیکن شعر دوست طبقہ مروّجہ دیوان ہی کو سرمے کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرے گا۔ نسخۂ حمیدیہ کی ایک اور اہمیت بھی ہے۔ غالب کی نفسیات سمجھنے میں یہ نسخہ ہماری مدد کر سکتا ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کے اوّلین

دور کی شاعری میں بے معنی اشعار کی کثرت ہے۔ ہمارے دور میں لامعنویت کوئی ایسی عجیب و غریب چیز نہیں۔ لامعنویت کی تہ میں بعض ذہنی عوامل کارفرما ہوتے ہیں۔ زبان اور خیال کی بعض الجھنیں ہوتی ہیں جنھیں سلجھانا ماہرینِ نفسیات کا کام ہے۔ غالب ایک عظیم فن کار تھے۔ ان کی لامعنویت میں بھی معنی کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ اور ان کی تشبیہات و استعارات کا مطالعہ ہمیں ان رجحانات تک پہنچا سکتا ہے۔ جنھیں سمجھے بغیر ہم غالب کی نفسیات تک رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ غرضکہ عوام کے لیے اس نسخہ کی افادیت ہو یا نہ ہو متعلّمین غالب کے لیے یہ نسخہ انتہائی قابلِ قدر ہے۔

کتاب پر سنِ طباعت درج نہیں۔ اس مجموعے میں تین[۳] قصیدے (۲۰۶ اشعار) گیارہ رباعیاں (۲۲ اشعار) اور دو سو پچھتّر[۲۷۵] غزلیں (۱۸۸۳ اشعار) ہیں۔ بطور مقدمہ ڈاکٹر عبدالرحمن بجنوری کا "محاسنِ کلامِ غالب" ہے۔ جس میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو[۲] ہیں، وید مقدس اور دیوانِ غالب۔ اس مجموعے میں غالب کے ابتدائی کلام کے علاوہ مروجہ دیوانِ غالب بھی بتمام و کمال موجود ہے۔ یہ دیوانِ غالب پہلی مرتبہ ۱۹۲۱ء میں چھپا۔

نسخۂ عرشی کی خصوصیات

دیوانِ غالب مرتبہ عرشی، انجمن ترقیٔ اردو (ہند) ۱۹۵۸ء مرتب کا دعویٰ ہے کہ اس مجموعے میں غالب کا تمام اردو کلام تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور مختلف ایڈیشنوں کا تقابل کر کے موزوں ترین متن پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کلامِ غالب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) "گنجینۂ معانی" ان اشعار پر مشتمل ہے، جو ابتداءً نسخۂ حمیدیہ میں تھے مگر متداول دیوان سے خارج کر دیے گئے۔ اس میں تین قصیدے ہیں، ۲۶۸ غزلیں ہیں جن میں سے چند مختصر اور نامکمّل ہیں چھ رباعیاں ہیں۔ (۲) "نوائے سروش" یعنی مروّجہ دیوانِ غالب۔ اس میں سولہ[۱۶] قطعے، ایک مثنوی، چار قصیدے ۲۳۴ غزلیں، سولہ[۱۶] رباعیاں ہیں (۳) "یادگارِ نالہ" کے عنوان سے غالب کا غیر مطبوعہ کلام مکاتیب و رسائل سے، اہلِ ذوق کی بیاضوں سے اور دوسرے امکانی طریقوں سے جمع کیا گیا ہے۔ اس میں چودہ[۱۴] قطعے، تین مثنویاں، چار قصیدے، ایک سلام، ایک مرثیہ جو تین بند کا بصورتِ مسدس ہے، ایک مکمل اور دو نامکمل سہرے،

ایک مخمس، ۲۲۴ مکمل و نامکمل غزلیں، جن میں فردیات بھی شامل ہیں، اور چار رُباعیاں ہیں۔ شروع میں عرشی کا ایک سو بیس صفحے کا دیباچہ ہے اور آخر میں اکاسی صفحے کی شرح غالب ہے۔ یہ دونوں مندرجات غالب کے متعلّقین کے لیے انتہائی قابلِ قدر ہیں۔ شرح غالب میں وہ تشریحات شامل ہیں جو غالب نے کی ہیں۔ دیباچے میں غالب کے فن پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام

۱۹۵۷ء میں شائع ہوا۔ متداول دیوانِ غالب کا سب سے قابلِ اعتماد اڈیشن یہ ہے۔ "تتمہ" غیر مطبوعہ کلام پر مشتمل ہے۔ "انتخاب نسخۂ حمیدیہ" میں بڑی خوش ذوقی کے ساتھ اُن اشعار کو منتخب کیا ہے جو واقعی قابلِ انتخاب ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ مروّجہ دیوان غالب میں ان کو ہونا چاہیے تھا شروع میں چھتیس ۳۶ صفحے کا فاضلانہ "مقدمہ" ہے، جس میں سب سے کام کی چیز غالباً دیوان غالب کی تاریخ ہے۔ کب کونسا اڈیشن متداول دیوان کا نکلا اور اُس اڈیشن کی خصوصیات کیا ہیں۔

"مرقعِ چغتائی" و "نقشِ چغتائی"

دیوانِ غالب کی اس سے بہتر شرح ممکن نہ تھی۔ رنگوں اور خطوط کے ذریعے چغتائی نے غالب کے خیالات اور طرزِ فکر کو پیش کر کے ہم پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔ جو کلچر غالب کے اشعار میں نغمہ بنا ہے وہ چغتائی نے تصویر میں نمایاں کر دیا ہے۔ مغل تہذیب کا ادا شناس چغتائی ہی غالب کے معانی تک پہنچ سکتا تھا۔ اوّل تو زبان کا ایک تصویری پہلو ہوتا ہے، دوسرے غالب کی شاعری میں بذاتہٖ ایک تصویری طریقِ فکر موجود ہے۔ چنانچہ یہ مشکل کام ممکن ہو گیا۔ "مرقع چغتائی" ایک شاہ کار ہے لیکن اس میں رنگینی کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ "نقشِ چغتائی" میں یہ نقص نہیں ہے۔

دیوانِ غالب کی شرحیں

بلحاظِ تعداد ان کی فہرست مرعوب کُن ہے۔ بہترین شرح تو وہی ہے جو غالب نے اپنے بعض اشعار کی خود کی ہے جو نسخۂ عرشی میں یہ اشارے موجود ہیں۔ مختصر شرح جو حسرت موہانی

کی ہے۔ وہ بھی غالب کو سمجھنے میں مدد کرتی ہے لیکن کوئی واقعی قابلِ اعتماد شرح ابھی تک نہیں لکھی گئی۔ ہر دَور اور ہر مکتبۂ فکر کو کلامِ غالب کی تفسیر اپنے طور پر کرنی ہے۔

(۴)

توضیحات

(بنیادی مسائل پر مزید بحث۔)

مذہب

غالبؔ مذہباً اثنا عشری تھے۔ ابتدا میں اسدؔ تخلص کیا۔ اور پھر اسد اللہ الغالب کی رعایت سے اسدؔ اور غالبؔ دونوں تخلص اختیار کیے[1]۔ آخر میں اسدؔ ترک کر دیا۔ لیکن اُردو مکاتیب میں "اسد اللہ" پر خط ختم کرتے ہیں۔ اکثر خطوط میں یہی صورت ہے کہ اگرچہ بعض میں اسد اللہ کی جگہ غالبؔ خط کے خاتمے پر آیا ہے۔ اردو اور فارسی کلام کی شہادت بھی یہی ہے، کہ اثنا عشری تھے۔ خطوں میں اپنے مذہبی عقائد کا اعلان بار بار کرتے ہیں۔

میں موحدِ خالص اور مومنِ کامل ہوں۔ زبان سے لا الٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لا موجود الا اللہ لا مؤثر فی الوجود الا اللہ سمجھے ہوئے ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ محمد علیہ السلام پر نبوّت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین اور رحمۃ اللعالمین تھے۔ مقطع نبوّت مطلع امامت ۔ ۔ ۔ ۔ اور امام من اللہ علی علیہ السّلام ہیں۔ ثم حسنؑ ثم حسینؑ (خط بنام نواب علاؤ الدین احمد خاں)

غالب اثنا عشری حیدری (خط بنام غلام حسنین قدر بلگرامی)

"بندۂ علی ابن علی ابی طالب ۔ اسد اللہ المتخلص بغالب (خط بنام محمد حسین ناخدائے شیرازی)

"صاحب! بندۂ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو" (خط بنام حاتم علی مہر)

"خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام۔ یہی ہے مذہبِ حق والسّلام والاکرام۔ علی علی کیا کر اور فارغ البال رہا کر" (خط بنام میر مہدی مجروح)

---

[1] یہاں اُردو شاعری کا ذکر ہے۔ فارسی میں غالبؔ ہی تخلص کرتے تھے۔

فارسی کلیات میں متعدد قصیدے حضرت علیؑ اور اور دوسرے ائمہ کی شان میں پائے جاتے ہیں۔ مثنوی ابر گہربار میں حضرت علیؑ کی منقبت یوں کہتے ہیں :-

همانا پس از خاتم المرسلینؐ — بود تا به مهدیؑ علیؑ جانشین
نژاد علیؑ یا محمدؐ یکیست — محمدؐ همان تا محمدؐ یکیست
که تا کینه از مهر بشناختم — بکس غیر حیدر نپرداختم
جوانی برین در بسر کرده ام — شبی در خیالش سحر کرده ام

ایک غزل کا مقطع ہے :-

غالب نام آورم نام و نشانم مپرس
هم اسد اللهم و هم اسد اللهیم

منصور فرقهٔ علی اللهیان منم — آوازهٔ انا اسد الله برآورم

اردو دیوان میں دو قصیدے حضرت علیؑ کی منقبت میں ہیں اور ایک سلام ہے :-

نقشِ معنی، ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت — سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم — دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و دیں
نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر — یا علیؑ عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں
جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا! — وصیِ ختمِ رسلؐ تو ہے بہ فتوائے یقیں
جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسدؔ — کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں
شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب — ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں

فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار — دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلنار
تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں — سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبیؐ — جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

سلام اسے کہ اگر بادشاہ کہیں اس کو — تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اس کو

فروغِ جوہرِ ایماں حسینؑ ابنِ علیؑ | کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اس کو
بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؑ بلند | بقدرِ فہم ہے، گر کیمیا کہیں اس کو
یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں | علیؑ سے آ کے لڑے اور خطا کہیں اس کو
علیؑ کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ | کرے جو اِن سے بُرائی بھلا کہیں اس کو

بھرا ہے غالبؔ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے، کہ خونیں نوا کہیں اس کو

ان شواہد کے پیشِ نظر غالبؔ کے اثنا عشری ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ لیکن تجہیز و تکفین بطریقِ اہلِ سنّت ہوئی اور درگاہِ حضرت نظام الدین اولیاءؒ میں دفن ہوئے۔ اس کے ذمہ دار نواب ضیاء الدین احمد لوہارو والے اور حکیم محمود خاں ہیں۔ مردہ بدست زندہ۔

خواجہ حسن نظامی نے بربنائے خوش فہمی غالبؔ کو سُنّی لکھا ہے۔ اور دلیل یہ دی ہے کہ جبھی تو درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ میں دفن ہیں۔ قبر کی وضع بھی اہلِ سنّت کی قبروں جیسی ہے۔ شیعہ ہوتے تو علی گنج شاہ مرداں کے قبرستان میں مدفون ہوتے۔ علاوہ ازیں چشتی نظامی سلسلے میں مرید بھی تھے۔ مجروح اور سرفراز حسین کے نام خطوں میں صوفی ہونے، ہمہ اوست کا دم بھرنے اور توکّل پیشہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ شیعہ مرید نہیں ہوتے۔

غالبؔ اور ہنگامۂ ۱۸۵۷ء

غدرِ دہلی کے افسانوں کے سلسلے میں خواجہ حسن نظامی نے "غالبؔ کا روزنامچۂ غدر" مرتب کر کے اس میں "دستنبو" کا خلاصہ شامل کر دیا ہے۔ اس مختصر سی کتاب سے ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے متعلق غالبؔ کا ردِّ عمل مکمل طور پر سامنے آجاتا ہے۔ روزنامچۂ غدر میں جو کچھ ہے۔ غالبؔ کے قلم سے نکلا ہوا ہے۔ حواشی کے سوا خواجہ حسن نظامی نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ البتہ انھوں نے غالبؔ کے اردو خطوط میں سے وہ ٹکڑے نکال کر ایک خاص ترتیب کے ساتھ سانچے میں ڈھال دیئے ہیں۔ جہاں جہاں ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کا تذکرہ ان خطوں میں آیا ہے۔ وہاں سے وہ ٹکڑا لے لیا گیا ہے۔ کتاب کی ترتیب اس سلیقے سے ہوئی ہے کہ یہ بکھرے ہوئے

اجزاء پڑھنے والے کو ایک مکمل روزنامچہ معلوم ہوتے ہیں۔ بظاہر غالب محض انگریز پرست اور مصلحت شناس تھے۔ لیکن بین السطور اس روزنامچے سے جو اثر پیدا ہوتا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ ہندوستان کی عالمگیر تباہی پر عمومیت کے ساتھ اور دلّی کی تباہی پر خصوصیت کے ساتھ غالب نے خون کے آنسو بہائے ہیں۔ مقتولوں اور مجبوروں کا انھوں نے بڑا ماتم کیا ہے۔ غالب نے "دستنبو" میں غدر دہلی کی تاریخ اس نقطۂ نظر سے لکھی ہے کہ انگریز حکومت کو غالب کی وفاداری پر کوئی شک نہ رہ جائے۔ باغیوں کے ظلم و ستم کی داستان بیان کی ہے پھر چار ماہ چار روز کے بعد باغیوں کی پسپائی اور انگریزوں کی حکومت قائم ہونے پر اظہارِ خوشی کیا ہے۔ اور باغیوں کو جو سزائیں دی گئیں انھیں منصفانہ بتایا ہے۔ "اسبابِ بغاوتِ ہند" لکھ کر سر سیّد نے مسلمان قوم کے لیے بریّت کا سامان کیا۔ "دستنبو" لکھ کر غالب نے حریت پسندوں کو مجرم گردانا اور اپنی ذات کی وکالت کا حق ادا کیا۔ سر سیّد کی وفاداری قوم کے ساتھ تھی۔ اور غالب کی اپنی ذات کے ساتھ۔

تصوّف، عشق اور غزل

شاعری کے موضوعات میں سب سے مقبول عشق کا موضوع رہا ہے۔ بعض اصنافِ سخن ایسی بھی ہیں جن میں عشق کے تذکرے سے گریز کرنا ممکن ہے۔ مثلاً رزمیہ شاعری، اخلاقی شاعری، مذہبی شاعری، لیکن شاعر چاہے۔ تو ان اصناف میں بھی جذبۂ عشق کا تذکرہ کرنے کی گنجائش نکال سکتا ہے۔ اس ضمن میں اقبال کی وہ لگن جو ملّی شاعری بن گئی یا شیلی و بائرن کا وہ جذبہ جو انقلابی شاعری میں ڈھل گیا، مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے۔ اس کا محور عشق ہی ہے۔ خواہ وہ عشقِ مجازی ہو یا عشقِ حقیقی۔ عشق کا شمار انسان کے بنیادی جذبات میں ہے۔ اور یہی وجہ عشقیہ شاعری کی مقبولیت کی ہے۔

فلسفیانہ نقطۂ نظر سے عشق کا شمار سماجی محرکات میں ہے۔ اس کا اثر کم از کم دو افراد پر پڑتا ہے۔ یعنی اس پر جو عشق کرے اور اُس پر جس سے عشق کیا جائے۔ اس دائرے کو اگر ہم وسیع کرتے چلے جائیں۔ تو عشق کا مرکز پورا معاشرہ یا پوری انسانیت تک

پہنچ سکتا ہے۔ ایسا عشق خود غرضی اور رشک وحسد سے پاک ہوگا۔ عشق کا دائرہ جتنا تنگ ہوگا۔ اتنی ہی اس کی بنیاد خود غرضی اور رشک وحسد پر ہوگی۔ ایسی صورت میں شخصی مفادات درمیان میں آجائیں گے۔ اور حرص وہوس اور خواہش حصول عاشق کو معاشرے کی بجائے ایک فرد پر توجہ مرکوز کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ دوسری صورت میں خواہشات کا کوئی دخل نہ ہوگا۔ عاشق کے پیش نظر شخصی مفاد اور خواہش حصول کی بجائے انسانیت کی بھلائی رہے گی۔ رومانی شعرا میں ورڈزورتھ اور شیلی کی شاعری انسان کی محبت پر مبنی ہے۔ لیکن عموماً عشق کا محور کوئی نہ کوئی فرد واحد ہی رہا ہے۔ فلسفیانہ عشق ہمارے جذبات کو اتنا متاثر نہیں کر سکتا۔ جتنا شخصی عشق۔ ابھی انسانیت اتنی مہذب اور شائستہ نہیں ہوئی ہے کہ فلسفیانہ عشق ایک عام قاری کو ہر حالت میں متاثر کر سکے۔ اس کے برخلاف جوانی کے پرشور زمانے میں حسینوں سے محبت کرنا ایک ایسا تجربہ ہے۔ جس سے اگر سب نہیں تو انسانوں کی اکثریت گزرتی چلی آئی ہے۔ عظیم شاعروں کے ذہنی ارتقا کے مطالعہ سے ضرور ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ابتدا میں ان کا عشق افراد سے ہوتا ہے اور آخر معاشرے بلکہ پوری انسانیت کے ساتھ۔

عشق کو ایک خوبی اور نفرت کو ایک برائی کہا جاتا ہے۔ اس لیے کہ نفرت سے ہمارے حیوانی جذبات ابھرتے ہیں اور اس طرح ہماری شخصیت کو پھیلنے اور پھولنے پھلنے کا موقع میسر نہیں آتا۔ لیکن عشق اپنی شخصیت کو فنا کر کے دوسری شخصیت کو اپنے اندر جاگزیں کرنے کا عمل ہے۔ اس فنا میں بقا کا راز مضمر ہے۔ عشق صادق کی منزل محبوب مجازی کا حاصل نہیں۔ یہ زندگی کے ساتھ محبت کرنے کا دوسرا نام ہے۔ کہتے ہیں کہ عشق ہی علم ہے۔ علم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجہول اور دوسری متحرک۔ جنسی عشق اپنی منزل مراد تک پہنچ کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اور محبوب مجازی کا وصل اس کا نصب العین ہے۔ جنسی عشق میں ہماری حیوانیت ابھرتی ہے۔ اور جب کوئی دوسرا شخص اس عشق کی راہ میں حائل ہوتا ہے۔ تو ہماری خواہشات رشک وحسد کا روپ دھار لیتی ہیں۔ اور اس طرح ایک آویزش شروع ہو جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عاشق کو طرح طرح کے صدمے اٹھانا پڑتے ہیں،

اور محرومیاں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ عشقِ صادق کی صورت میں ہمارا نصب العین ہی بدل جاتا ہے۔ جذباتِ اسفل کو ہم اپنے دل سے نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ عاشق اپنے معشوق کی ذات میں فنا ہو جاتا ہے۔ اور زندگی کے دھارے میں گھل مل جاتا ہے۔ ایسے عشق میں کسی دوسرے فرد کے ساتھ متصادم ہونے کا اندیشہ نہیں ہوتا۔ نہ کسی خواہش کی تکمیل نصب العین ٹھہرتی ہے۔ اس عشق سے عاشق کی روح میں ایک ارتفاع پیدا ہوتا ہے اور وہ پوری انسانیت کو اپنا محبوب بنا لیتا ہے۔ لیکن کتنے ہیں جو ترکِ خواہشات کریں اور فلسفیانہ عشق سے جذباتی رابطہ استوار کریں۔ معاشرے کی بھلائی چاہنا اور بات ہے اور معاشرے اور انسانیت کے مجرد تصور کے عشق میں "مبتلا" ہونا اور بات ہے۔ اُدھر کسی حسین سے دل لگانا ہوس پرستی اور نفس پروری کہلائے گا۔ اس کا حل یوں تلاش کیا گیا کہ ایک "شرعی" عشق کی تبلیغ ہوئی۔ عشق کرو اور حدودِ شرعی میں رہ کر عشق کرو یعنی معاشرے کی اجازت سے جسے چاہو اُسے اپنا لو اور اُس کے بن جاؤ۔ لیکن محبوبہ اور بیوی کا تصور ہم آہنگ نہ ہو سکا۔ نصب العین حاصل ہو جائے تو وہ نصب العین نہیں رہتا۔ عاشق اور اچھے شہری میں دو مختلف تصور کارفرما ہیں۔

عینیت کے پرستاروں نے افلاطونی تصورِ عشق کو نصب العین قرار دیا۔ یہ عشق جنسی آلودگی سے پاک کہا جاتا ہے۔ عورت اور مرد کے عشق میں جنسی جذبہ کارفرما ہوتا ہے لہٰذا افلاطونی عشق ہم جنسوں کے درمیان ہی ممکن ہے۔ (۱) ہمارے ذہن میں حسن کا جو تصور ہوتا ہے اُسے لیے ہوئے ہم زندگی کی شاہراہ پر گھومتے پھرتے ہیں اور گوشت پوست کے حسین مجسموں کا اُس سے موازنہ کرتے پھرتے ہیں۔ (۲) ایک حسین صورت کے بعد دوسری حسین صورت نظرنواز ہوتی ہے اور یونہی یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ حسن کہاں نہیں ہے؟ اس طرح ہمارا جوش ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور ہم کسی فرد کے حسن سے متاثر ہونے کی بجائے علی العموم پرستشِ حسن کرنے لگتے ہیں۔ (۳) پھر جسمانی حسن کے بجائے ذہنی حسن ہماری توجہ کو کھینچنے لگتا ہے۔ حسین وہ ہے جس کے خیالات حسین ہوں۔ (۴) اگلا درجہ قوانین اور معاشرتی اداروں سے محبت کا ہے۔ عاشق وہ ہے جو اچھا شہری ہو اور سماج کی محبت

میں سب کچھ بھول جائے اور انفرادیت اس میں باقی نہ رہے۔ (۵) آخر میں عاشق روحِ کائنات تک پہنچ جاتا ہے، یعنی اُس حسن تک جو ابدی ہے۔ یہ عشق عاشق کو خدا رسیدہ اور لافانی بنا دیتا ہے۔ (۶) عورت کو افلاطون اخلاقی و ذہنی اعتبار سے ناقص جنس بتاتا ہے (۷) عورت کے سلسلے میں افلاطون اشتمالیت کا قائل ہے اس لیے عورتوں کو کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔

مسیحیت نے مسیح کو خدا کا بیٹا اور مریم کو دوشیزہ کہہ کر عشق کا ایک نیا باب کھول دیا۔ اور حلول کے عقیدے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس طرح مسیح و مریم کا عشق ایک روحانی عشق بھی ہے اور جسمانی عشق بھی، مجازی عشق بھی ہے اور حقیقی عشق بھی۔ اِدھر ہندوستان میں کرشن بھگتی کا عقیدہ رائج ہوا۔ اُدھر افلاطونی عشق مسیحی عقاید میں گھل مل گیا، اس فرق کے ساتھ کہ ہم جنسی کا تصوّر وقت کے ہاتھوں قلمزد ہو گیا۔ تصوّف کی داغ بیل پڑی اور ہمہ اوست کا نظریہ پیدا ہوا۔ ہر حسین صورت اور ہر حسین منظر کو جلوۂ خداوندی کا مظہر سمجھا جانے لگا اور مجازی عشق کو حقیقی عشق کا ذریعہ خیال کیا گیا۔ عشق حقیقی اور جنسی محبت کے اظہار کے لیے ایک ہی قسم کی اصطلاحیں وضع ہوئیں اور شاعری میں دونوں کے لیے ایک سی علامتیں استعمال کی جانے لگیں۔ اس تصوّف کا لقب عجمی تصوّف ٹھہرا۔ پھر جب امرد پرستی اور طوائفیت کا دَور آیا اور ہندوستانی معاشرہ زوال آمادہ ہو گیا تو عشقِ حقیقی کی آڑ میں ہوس پرستی ہونے لگی۔

اُردو غزل کی نشو و نما اُس وقت ہوئی جب معاشرہ زوال آمادہ ہو چکا تھا، یعنی محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ اور اُس کے بعد کا دَور جو کم و بیش انیسویں صدی کے آخر تک قائم رہا۔ اُردو غزل میں جیتی جاگتی عورت کے لیے اُتنی گنجائش نہیں جتنی تصوّرِ عشق کے لیے ہے۔ طرزِ خطاب بھی کچھ ایسا ہے جیسا ہم جنسوں کے لیے موزوں ہوتا ہے۔ اس میں پردے کے رواج کو بھی دخل ہے اور ایرانی غزل کی امرد پرستانہ روایت کا حصّہ بھی ہے جس میں غلاموں سے اور ترک سپاہی زادوں سے عشق کا اظہار کیا جاتا رہا ہے اور صوفیانہ عشق کی بھی کارفرمائی ہے۔ حصولِ مطلب سے مایوسی نے غزل میں خود آزاری کے تصوّر کو راہ دی، چنانچہ محبوب ظالم اور عاشق آزار پرست ٹھہرا۔ ترک بچّوں اور نو عمر سپاہیوں کا عشق رنگ لائے بغیر نہ رہ سکا ہو گا۔ اظہارِ شوق کے جواب میں شمشیر و خنجر بھی نکل آتے ہوں گے۔ ان سب کے باوجود کوئی قطعی روایت

ایسی بھی نہیں کہ عورت کے عشق کو ٹکسال باہر قرار دے۔ بلکہ ایمائی کیفیت کے ساتھ پردے پردے میں عشق کرنا غیر فطری نہیں معلوم ہوتا۔ شاعرِ دربار کی رسائی اُس محبوبہ تک کہاں جو دراصل شاعر کے مربّی کی محبوبہ تھی لیکن غزل کے ذریعے دوسروں کے عشق کی ترجمانی اور اپنے عشق کا تذکرہ بھی لازم تھا۔ اسی لیے جاگیردارانہ دَور کی غزل میں حدِ ادب کا لحاظ بھی رکھنا پڑتا تھا۔ دراصل غزل جیسی عمومی صنف کی خوبی اور کمزوری یہی ہے کہ رموز و علائم کی آڑ میں جو چاہو سو کہہ لو۔ اس میں ہر طرح کے عشق کی گنجائش ہے یہاں تک عشق کی علامتوں کے سہارے وہ کچھ بھی کہا جاسکتا ہے جس سے عشق کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ البتہ معشوق کے تصورِ حُسن پر اس خلطِ مباحث سے جو بیتی وہ ناگفتنی ہے۔ وہ درمیانی جنس کا نمونہ بن کر رہ گیا۔

غالب نے عشق کو شائستگیِ نفس کا ذریعہ سمجھا۔ گویا عشق ایک تہذیبی عمل ہے۔ یہ نظریہ نہایت ہی دلکش ہے اور قرینِ عقل بھی ہے۔ ایک صاحبِ فکر انگریز ادیب نے اپنی محبوبہ کی تعریف یوں کی[1] کہ اس سے عشق کرنا درسِ شائستگی ہے۔

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے — انجمن بے شمع ہے، گر برق خرمن میں نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف — یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

اس شعر میں "ضعف" سے " کا ٹکڑا روائتی ہے، اسے حذف کر کے غالب کا مسلک سمجھ میں آجاتا ہے

غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی کی آرزو — جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نور کی — قسمت کھُلی ترے قد و رخ سے ظہور کی

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں — طاقت بقدرِ لذّتِ آزار بھی نہیں

کبھی کہتے ہیں کہ خلشِ عشق ہی تو ایک قابلِ قدر چیز ہے۔ جینے کا مزہ تڑپنے میں ہے۔

کوئی میرے دل سے پوچھے ترے تیرِ نیم کش کو — یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

کبھی حسن کی کیفیت اور عشق کی محرومی کو ترازوئے عدل پر تولتے ہیں تو برابر پلتے ہیں۔

---

[1] To love Her is a liberol education

بقدرِ ظرف ہے ساقی! خمارِ تشنہ کامی بھی   جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا

اپنی انانیت پر نظر جاتی ہے اور رگوں میں تُرک خون جوش کھانے لگتا ہے ؎

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر   دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

فراق و وصال دونوں میں وہی انتہا پسندی قائم رہتی ہے ؎

جوئے خوں بہنے دو آنکھوں سے کہ ہے شامِ فراق   میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

میں اور حظِ وصل، خدا ساز بات ہے   جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

محبوب کا خیر مقدم یوں ہوتا ہے کہ بہار آجاتی ہے اور پھول ہی پھول کھِل اُٹھتے ہیں ؎

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے   کہ غیرِ جلوۂ گل رہ گزر میں خاک نہیں

ہر حسین چیز شاعر کو حسنِ محبوب کا پیام دے کر مسرت بخشتی ہے ؎

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے   بہ جلوہ ریزیٔ باد و بہ پر فشانیٔ شمع

خود اپنی قلمی تصویر یوں کھینچی ہے ؎

اسد اللہ خاں تمام ہوا   اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

غزل میں ایک نیا مضمون ایجاد کرتے ہیں۔ محبوب ایسا چاہتے ہیں جو مے نوشی میں شریک ہو ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم   قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے   جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن   ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

روائتی مضامین بھی غالب کی غزل میں موجود ہیں۔ رشک اور حسد کے مضامین، کمر اور دہن کے مضامین، مسیح و خضر کے مضامین، مگر اندازِ بیان کی ندرت اکثر و بیشتر قائم رہتی ہے۔ عشقِ حقیقی، عشقِ مجازی، حرص و ہوس، یہاں سب کچھ، ایک فرق کے ساتھ موجود ہے۔ غالب کی غزل کا محبوب بالکل ہی روائتی اس لیے نہیں ہے کہ غالب ایک جمالیاتی حس رکھتے تھے اور ان کا ایک نظریہ حسن تھا[1]۔ غالب کی غزل میں نہ تو جرأت کی چوما چاٹی ہے نہ میر کی حسرت انگیزی اور حرماں نصیبی، مگر کیفیاتِ عشق کا بیان ضرور ہے۔ عشق اُن کے ہاں ایک تہذیبی عمل ہے۔ تجربے کی رنگارنگی

---

[1] نقدِ غالب میں پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کا مقالہ "غالب کی شاعری میں حسن و عشق" توجہ طلب ہے۔

اور تفکر کی عادت نے مضامینِ عشق کو وسعت دی ہے اور جمالیاتی حس نے جذبے کو نکھارا ہے اور ہوس اور حُسن پرستی میں امتیاز قائم کیا ہے۔ عشق کرنا بھی شائستہ عشق لوگوں ہی کا منصب ہے ورنہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

حسّی تشبیہہ یعنی ایمیج

حسّی تشبیہہ کے ذریعے قاری کے ذہن، جذبات اور حسّیات کو متاثر کرنا شاعری کا کام ہے۔ حسی تشبیہات عام طور پر چھ قسم کی تسلیم کی گئی ہیں۔ (۱) بصری، جن کا تعلق رنگ اور شکل و صورت سے ہوتا ہے۔ (۲) سمعی، مختلف آوازیں خواہ وہ گانے والوں کی ہوں یا سازوں سے نکلی ہوئی ہوں یا عالمِ فطرت سے متعلق ہوں یا چیزوں کے آپس میں ٹکرانے سے پیدا ہوئی ہوں۔ سماعت کو متاثر کرتی ہیں۔ (۳) لمسی، یعنی چیزوں کے گرم و سرد یا نرم و سخت ہونے کا احساس (۴) حرکی یعنی روانی اور حرکت سے متاثر کرنے کا طریقہ (۵) شامہ، یعنی خوشبو اور بدبو کا احساس (۶) تلخ و ترش و شیریں ذائقے کا اثر (۷) ان کے علاوہ ایسی تشبیہات بھی استعمال کی جاتی ہیں جو عقلی ہوں اور حسّیات کو درمیان میں لائے بغیر ذہن کو براہ راست متاثر کریں۔

حسّی تشبیہات کسی خاص مقصد کے تحت استعمال کی جاتی ہیں۔ کوئی مخصوص تاثر پیدا کرنا ہو اور قاری کو براہِ راست حسّی تجربے کی وساطت سے کوئی بات سمجھانی ہو تو حسّی تشبیہہ کا استعمال بجا اور درست لیکن غیر ضروری طور پر کسی ادب پارے میں حسّی تشبیہات کا انبار لگا دینا فن کاری کے خلاف ہے۔ تشبیہہ برائے تشبیہہ اصرافِ محض ہے۔ ادب میں انتہائی کفایت شعاری مدِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر غزل کی شاعری میں حسّی تشبیہہ کے لیے بہت کم گنجائش ہے لیکن قصیدے، مرثیے اور مثنوی میں حسّی تشبیہہ بڑی کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود غالب نے اردو غزل میں حسّی تشبیہہ کا استعمال بکثرت کیا ہے۔ یہ امر حیران کن ہے۔

کہ فارسی غزل میں وہ حسی تشبیہہ کو درمیان میں نہیں لاتے۔ حسی تشبیہہ میر و مومن کے کلام میں بھی پائی جاتی ہے۔ اتفاقیہ طور پر اس کو بہت سے شعرا نے برتا ہے جس مرکب اور ایک حس کو دوسری حس میں تبدیل کرنے کی مثالیں بھی اردو شاعری میں عموماً اور غزل میں کہیں کہیں مل جاتی ہیں۔ مختلف حسیات میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ اور شاعر چاہے تو حسیات سے وہی کام لے سکتا ہے۔ جو مختلف سازوں کو ایک ساتھ بجا کر ان کی ہم آہنگی کے ذریعہ لیا جا سکتا ہے۔ جس طرح بہت سی آوازیں آپس میں مل کر ایک ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح مختلف حسیات بھی ایک وحدت میں تبدیل ہو سکتی ہیں۔ حسیات کو ہم ایک زنجیر سے بھی تشبیہہ دے سکتے ہیں۔ جس کی کڑیاں ملی ہوئی ہوں۔ اور ہر کڑی ایک حس کی نمائندگی کرتی ہو۔ ایک نابینا کے متعلق مشہور ہے کہ بلند آہنگ ساز سے نکلنے والی آواز کو وہ اپنی دانست میں گہرے سرخ رنگ کا مترادف سمجھتا تھا اور فرانسیسی شاعر رآبنو نے حروفِ تہجی کی آوازوں کو رنگوں کا پیمانہ بنایا تھا۔ کسی آواز کو وہ سفید کہتا تھا۔ کسی کو سرخ بتاتا تھا اور کسی کو سبز کہہ کر پکارتا تھا۔ اگر شاعر کی کوشش یہ ہو کہ ہمارے مادی تجربے کو حسی تشبیہہ کے ذریعے شعر میں ڈھالا جائے تو یہ کوشش فائدے مند ثابت ہو سکتی ہے۔ ایک حس ہمیں دوسری حس کی یاد دلا سکتی ہے۔ انگریز شاعر جان کیٹس خوشبو کے لمس کا ذکر کرتا ہے۔ کہیں وہ خوشبو کو نرم اور معلق بتاتا ہے، اور کہیں روشنی کے پھولوں کے ہار کا تذکرہ کرتا ہے۔ اور یہ کچھ حیرت انگیز بھی نہیں۔ نظارے کے ذریعے آوازوں کی کیفیت پیدا کی جا سکتی ہے، اور آوازوں سے پیکر تراشی کا کام لیا جا سکتا ہے اور مختلف حسیات میں ایک انضباط پیدا کیا جا سکتا ہے۔ غالب کی حسی تشبیہہ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے۔

غالب اور معاشیات

مالی آسودگی صحیح معنی میں مرزا غالب کو حاصل رہی تو نوعمری میں یعنی دلی آنے سے پہلے جب تک ان کا قیام آگرے میں تھا۔ امیرانہ ٹھاٹھ سے گزر بسر ہوتی تھی۔ اگرچہ پانچ برس کی عمر میں باپ کی شفقت سے اور آٹھ برس کی عمر میں چچا کی سرپرستی سے محروم ہو گئے۔

۱۸۰۲ء میں عبداللہ خاں مارے گئے اور ۱۸۰۶ء میں نصراللہ بیگ ہاتھی سے گر کر جاں بحق ہوئے[۱]۔ لیکن ان کے نانا مرزا غلام حسین کمیدان رؤسائے آگرہ میں سے تھے۔ اس لیے ۱۸۱۳ء میں دلی آنے اور شادی ہونے تک فارغ البالی کے ساتھ بسر ہوتی تھی۔ نواب احمد بخش خاں والئ لوہارو تو غالب کو ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ ایک معاہدے کے تحت پنشن کے طور پر دیتے تھے۔ دلی آئے تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ مالی پریشانیاں لاحق رہنے لگیں۔ جب تک نواب احمد بخش خاں درمیان میں تھے۔ غالب نے کوئی شکایت نہ کی۔ لیکن ۱۸۲۶ء میں جب ان کے بڑے بیٹے شمس الدین خان فیروزپور جھرکہ کے نواب مقرر ہوئے اور پنشن کی رقم ان سے متعلق ہوئی تو غالب کو واقعی شکایت پیدا ہوئی۔ ساڑھے سات سو روپیہ کو وہ خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ادھر نواب شمس الدین نے اس رقم کی ادائیگی بھی بند کر دی اور ۱۸۳۱ء سے ۱۸۳۵ء تک یعنی شمس الدین خاں کی وفات تک غالب کو ایک پیسہ بھی وصول نہ ہوا۔ ۱۸۲۶ء سے پنشن کا جھگڑا شروع ہو گیا اور غالب کلکتے روانہ ہو گئے۔ تین سال سر توڑ کوشش کے باوجود حاصل کچھ نہ ہوا اور نومبر ۱۸۲۹ء میں جیسے گئے تھے ویسے ہی ہر پھر کے دلی آ گئے۔ ۱۸۳۶ء میں حکومت نے فیصلہ کیا کہ جو ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ ملتے ہیں وہی ملتے رہیں۔ اس ضمن میں غالب مقروض الگ ہو گئے اور فائدہ کچھ نہ پہنچا۔

۱۸۵۰ء میں حالات بدلنے شروع ہوئے۔ پنشن کی رقم ساڑھے باسٹھ روپے مہینہ تھی اور مرزا بڑے شاہ خرچ واقع ہوئے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں وقائع نگار کی حیثیت میں بہادر شاہ ظفر کے دربار سے منسلک ہوئے۔ پچاس روپیہ مہینہ تنخواہ ٹھہری جو دستور کے مطابق چھٹے مہینے ملتی تھی اور مرزا چاہتے تھے کہ ماہ بماہ ملنے لگے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ چھ مہینے تک قرض پر گزر اوقات رہتی تب جا کر کہیں تنخواہ کا منہ دیکھتے۔ ۱۸۵۴ء میں مرزا فخرو ولی عہد سلطنت غالب کے شاگرد ہوئے۔ اور ان کی سرکار سے چار سو روپیہ سالانہ ۱۸۵۷ء تک ملتے رہے۔ اس پر بھی مرزا کو تنگ حالی کا احساس رہتا تھا۔ ۱۸۵۴ء ہی میں نواب واجد علی شاہ

---

[۱] ذکر غالب از مالک رام ص ۱۸ و ۲۱ (دوسرا ایڈیشن)

والیٔ اودھ نے پانچ سو روپے سالانہ منظور کیے۔ دو سال بعد اودھ کی سلطنت ہی مٹ گئی۔ غرضکہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء رونما ہونے پر غالب کو احساس ہوا کہ ان کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں ہے۔ قلعے سے جو کچھ ملتا تھا اور لکھنؤ سے جو کچھ آتا تھا۔ وہ موقوف ہو چکا تھا۔ مستزاد اس پر یہ ہوا کہ سکہ کہنے کے الزام میں پنشن بھی بند ہو گئی۔

اس خراب حالی کے زمانے میں جب غالب واقعی مالی بحران میں مبتلا تھے۔ نواب ضیاء الدین احمد[۱] نے جو لوہارو کے رئیس تھے اور غالب کے طرفدار اور سسرالی عزیز تھے۔ امراؤ بیگم کا وظیفہ پچاس روپیہ مہینہ مقرر کر دیا۔ جو ان کو تاحینِ حیات ملتا رہا۔ اس طرح دراصل غالب کی امداد ہو گئی۔ یہ بات ۱۸۵۷ء کی ہے۔ پھر قدرت نے مدد کی اور رام پور کے نواب یوسف علی خاں ناظم نے غالب کی شاگردی اختیار کر لی۔ یہ بات بھی ۱۸۵۷ء ہی کی ہے۔ سو روپیہ مہینہ مشاہرہ مقرر ہوا، جو ۱۸۵۹ء تک باقاعدہ ملنے لگا۔ دلی میں رہیں تو سو روپیہ پائیں اور رام پور میں ٹھہریں، تو دو سو روپیہ لیں۔ لیکن رام پور کا قیام کچھ پسند نہ ہوا۔ ناظم ۱۸۶۰ء میں اللہ کو پیارے ہوئے تو نواب کلب علی خاں نے مقررہ رقم دینی منظور کر لی اور مرزا غالب کی وفات یعنی ۱۸۶۹ء تک یہ رقم انھیں ملتی رہی۔ ادھر ۱۸۶۰ء میں پنشن کا اجرا بھی ہو گیا۔ ساڑھے باسٹھ کی جگہ اب ساٹھ روپے مہینہ ملنے لگے۔ یہ ہے غالب کی مستقل آمدنی کی کیفیت۔ اس میں فتوحات شامل نہیں ہیں۔ ورنہ نواب احمد بخش کی زندگی تک لوہارو سے کچھ نہ کچھ آ جاتا تھا۔ کلکتے سے واپسی پر لکھنؤ پہنچے، اور قصیدہ والیٔ اودھ کی خدمت میں بھجوایا۔ پانچ سو روپیہ انعام دیا جانا منظور ہوا۔ لیکن بدقسمتی سے نہ مل سکا۔ بیچ والے کھا گئے۔ نواب کلب علی خاں کی تخت نشینی پر رام پور گئے۔ تو ایک ہزار روپیہ نقد اور ڈھائی سو کے پارچات ملے۔ پھر بھی تسلی نہ ہوئی۔

ان دنوں روپے کی قیمت اب سے کہیں زیادہ تھی۔ مگر مرزا ہیں کہ غلّے کی گرانی کی شکایت کرتے ہیں۔ ماش کی دال آٹھ سیر، باجرہ بارہ سیر، گیہوں تیرہ سیر، چنے سولہ سیر،

---

[۱] نواب احمد بخش کے بیٹے تھے۔ نواب امین الدین والیٔ لوہارو کے بھائی تھے۔ غالب کے شاگرد تھے نیر و رخشاں تخلص کرتے تھے۔ نواب علاؤالدین علائی نواب امین الدین کے بیٹے تھے۔ یہ بھی غالب کے شاگرد تھے۔

گھی ڈیڑھ سیر کا تھا۔ ان دنوں کے معیار کے مطابق گرانی اسی کو کہتے ہوں گے۔ پھر غالب کا رہن سہن بھی امیرانہ تھا۔ ڈیوڑھی پر کئی کئی نوکر رہتے تھے۔ زنانے میں خادمہ تھیں جو ملازم مستقل تھے۔ ایک داروغہ اور دوسرا کہار۔ ایک آدھ لڑکا بھی ملازم رہتا تھا۔ شراب کے رسیا تھے۔ ایک دل دوز آہ کے ساتھ کہتے ہیں "دو قسم کی انگریزی شراب ..... پیا کرتا تھا۔ یہ دونوں بیس روپیہ حد چوبیس روپیہ درجن آتی تھی ..... اب پچاس اور ساٹھ روپیہ درجن آتی ہے ..... یہ گڑ چال کی شراب میں نہیں پیتا۔ یہ مجھ کو مضرت کرتی ہے۔"
آبکاری ایکٹ نافذ ہوا تو مرزا کو بڑی تکلیف پہنچی۔ بڑے درد کے ساتھ لکھتے ہیں۔
"آبکاری کے بندوبست جدید نے مارا۔ عرق کے نہ کھنچنے کی قید شدید نے مارا۔ ادھر انسداد دروازۂ آبکاری ہے۔ ادھر ولایتی عرق کی قیمت بھاری ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون"
اچھا کھاتے تھے اور اچھا پہنتے تھے۔ اپنا ہی خرچ کیا کم تھا۔ اوپر سے توفیق اور مہمان نوازی سرشت میں داخل تھی۔ پھل اور بادام اور دو سیر گوشت کی یخنی معمولات سے تھی۔ پھر بھوکے نہ مرتے تو کیا کرتے۔

غالب کی لذت پرستی

حواسِ خمسہ پکار اٹھے یک زباں ہو کر   کہی ثبوت تری خوبیٔ بدن کے لیے (فراق گورکھپوری)

یہ شعر لذت پرستی کے رجحان کا آئینہ دار ہے۔ لذت پرستی کا لفظ کچھ ایسا ہے کہ کسی عظیم شخصیت سے اسے منسوب کیا جائے تو ثقہ حضرات کے ماتھے پر بل پڑ جاتا ہے۔ دراصل لذت پرستی کوئی ایسی بری چیز بھی نہیں ہے کہ جس کا نام لیتے شرم آنی چاہیے۔ لذت پرستی کا فلسفہ بھی کافی پرانا ہے۔ ایپی کیورس (EPICURUS) جو ایک قدیم یونانی فلسفی تھا۔ ایپیکورس کا قول تھا کہ زندگی کا نصب العین لذت پرستی ہے۔ ... لذت مسرت کے ہم معنی ہے اگر فرد واحد زندگی کا پورا پورا مزہ اٹھانا چاہے تو ہم اُسے لذتیت کا دلدادہ کہیں گے اور اگر معاشرے کا معاشرہ ہمارے پیش نظر ہو اور چاہیں کہ بڑی سے بڑی تعداد میں لوگ زیادہ سے زیادہ زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہوں۔ تو ہم اسے لذت کی جگہ مسرت

کہہ کر پکاریں گے۔ اس فلسفے کا پرستار نہ صرف اپنے لیے لذتوں کا طلبگار ہوتا ہے۔ بلکہ وہ پورے سماج کے لیے خوشی لانا چاہتا ہے۔ فلسفۂ اخلاقیات کے لحاظ سے اقدار کی چار قسمیں ہیں۔ صداقت، نیکی، حسن اور لذّت (مسرّت) حسن کا تعلّق جمالیات سے ہے اور لذّت و مسرّت کا رشتہ حسّیات سے ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ لذّت پرستی انسان کو حیوانیت میں مبتلا کر سکتی ہے، تو اس دعوے میں تھوڑی بہت سچائی ضرور موجود ہے۔ نفسانی خواہشات کی تکمیل کو حیوانیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ معاملہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ نفسانی خواہشات کی تسکین میں تحفظِ نسل کا بنیادی جذبہ بھی کارفرما رہتا ہے۔ لہٰذا لذت پرستی حیوانی سطح سے بلند ہو کر آفاقی اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ تحفظ نسل کا جذبہ نہ ہوتا، تو دنیا کی آبادی کہاں سے آتی؟ چنانچہ لذّت پرستی کا دائرہ اگر تنگ ہو تو خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل تک محدود ہو کر حیوانی سطح کا ہو جاتا ہے۔ اور بلند ہو تو تحفظِ نسلِ انسانی کے آفاقی اصولوں تک پہنچ جاتا ہے۔

جمالیاتی حس اور لذّت پرستی کا باہمی تعلق بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ غالب کے متعلق دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کا جمالیاتی ذوق بہت بلند تھا اور وہ خوبصورت چیزوں کے شوقین تھے۔ ان کے مزاج میں نفاست تھی اور ہر چیز جو انھیں پسند آتی تھی وہ حسین اور لطف انگیز ہو۔ کام و دہن کی لذّتوں کے وہ رسیا تھے۔ کبیلے ہوں تو گھٹیے املی کے پھول ہوں، تو کھٹے ہوں۔ آموں کے موسم میں آم کھانے کا شوق تھا لیکن آم ہوں تو میٹھے ہوں اور بہت ہوں۔ نمک نہ ہو تو کھانے میں لذّت نہیں آتی۔ بے نمک کے معنی بے مزہ کے ہیں۔ لذّتِ سنگ میں نمک کی حلاوت ڈھونڈھتے ہیں، ع

کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

اور آگے چل کر کہتے ہیں ع

دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

جسم کا نمک مانگنا ایک حقیقت ہے۔ اسی غزل کا مقطع ہے ؎

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ وجدِ ذوق میں زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چُنتا تھا نمک

بہار کا مصرف یہ بتاتے ہیں کہ شراب اور آم اور برف کا پانی اور شیرینی کا مزہ اٹھایا جائے۔ بوڑھے ہو گئے تو شراب پینے میں کمی آگئی۔ پھر بھی ع

پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں

یعنی موسم بھی لذّت انگیز ہو تو شراب پینے کا مزہ ہے۔ ان دنوں تھوڑی سی شراب عرق گلاب میں ملا کر پیتے تھے، تاکہ گلاب کی خوشبو سے بھی لذّت یاب ہو لیں۔ نقاہت بڑھ گئی لیکن شوق نہ چھوٹا ے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

نظر باز ہمیشہ سے تھے۔ دنیا کو ایک تماشا گاہ سمجھتے تھے اور نظاروں کو دیکھ کر جیتے تھے۔ موسیقی کے مبصر تھے۔ لیکن بڑھاپا آیا تو سماعت سے محروم ہو گئے تھے۔ اسی لیے سمعی تشبیہات کی ان کے کلام میں فراوانی نہیں ہے۔ ان کا کلام ایک بلند آہنگ نغمہ ہے مگر دھیما لہجہ ان کے اشعار میں نہیں پایا جاتا۔ لہجے کا اتار چڑھاؤ تو شاعر کو تب محسوس ہوتا ہے جب اس کی سماعت ناقص نہ ہو۔ اس کے برعکس بصارت سے انھوں نے سماعت کا کام بھی لینا چاہا اور خوبصورت نظاروں کو اشعار میں پڑو دیا

حسن پرست بلا کے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں وہ یک آہنگ سوز نہیں جو مثال کے طور پر میرؔ کی خصوصیت ہے۔ ان کا فلسفۂ زندگی تو یہ تھا کہ ہر چیز سے پوری پوری لذّت لینی چاہیے۔ رئیسانہ زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ذہنی تعیش میں بھی مبتلا رہے۔ وہ شدّتِ احساس اور سوزِ غم جو عشق کے گہرے تجربے ہی کا نتیجہ ہو سکتا ہے ان کے کلام میں کم ملتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ خوش باش دمے کہ زندگانی این است ہی کے قائل ہوں۔ نشاطیہ نقطۂ نظر رکھنے کی وجہ سے ان کا مسلک یہ تھا کہ غم کا بھی پورا مزہ اُٹھانا چاہیے۔ گویا اپنے کو اپنے سے الگ کر کے دیکھنا چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ دیکھیں کیا مزہ آتا ہے۔ آج غالبؔ کے پُرزے اُڑیں گے۔ اشعار کے علاوہ خطوط میں بھی متعدد مقامات پر اس جذبے کا اظہار کیا ہے۔ شراب ایسی تلخ ہو کہ سینہ ریش ریش

کر دے۔ پھر ذہنی کیفیت بدلتی تھی، تو چاہتے تھے کہ شراب گلاب آمیختہ ہو۔ شراب کی کیفیات کو انھوں نے جس خوبی سے نظم کیا ہے کسی دوسرے شاعر کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ لطفِ مے نوشی کا اس طرح اظہار کر سکے۔ فارسی میں حافظ و خیام یا پھر خود غالب کے فارسی اشعار ہی اس قابل ہیں کہ ان کے اُردو دیوان کے بہترین نشاطیہ اشعار کے مقابلے پر رکھے جا سکیں۔

جمالیات

غالب کا فارسی اور اردو کلام ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر جمالیاتی ہے۔ لذت پرستی کے زیرِ عنوان بتایا جا چکا ہے کہ ان کا ذوق کتنا نکھرا ستھرا اور پاکیزہ تھا۔ بہترین سے کم پر قناعت ہی نہ کر سکتے تھے۔ مسرت اور درد کا امتزاج نہ ہو تو حسن پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ یونان کی شاعرہ سیفو نے کہا تھا۔

محبت کی پجارن نغمے کی مسرت اور درد سے پاگل ہو جاتی ہے
اور نغمے کی پجارن محبت کے درد اور مسرت سے پاگل ہو جاتی ہے

غالب نے کہا ہے ؎

نفس گداختگیہای شوق را نازم	چو شمع ہا بسرا پردۂ بیانم سوخت

اور اسی بات کو کیفیت کی ذرا سی کمی کے ساتھ بھی ادا کیا ہے ؎

حسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ	پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

جمالیات کا تعلق کسی شاعر کے تصورِ حسن سے ہے۔ جمالیاتی اقدار سے بحث کرنا اس موقع پر کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس کے لیے اوّل تو یہ موضوع تفصیل کا طالب ہے۔ دوسرے جمالیاتی اقدار کوئی ایسی مسلّمہ اقدار نہیں کہ باتفاقِ رائے جملہ شعراء نے اسے تسلیم کر لیا ہو یہ ایک داخلی مسئلہ ہے اور اکثر تو یہ ہوا ہے کہ شعراء نے اس کی فلسفیانہ حیثیت پر غور و فکر کیے بغیر حسن کے متعلق اپنے کلام میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن ہم اس کلام کے مطالعہ سے چند نتیجے برآمد کر کے یہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شاعر کا جمالیاتی نقطۂ نظر یہ ہے۔ یہی حال غالب کا ہے۔ غالب نے اپنے تصورِ حسن کی تشریح نہیں کی۔ لیکن کلامِ غالب کے مطالعہ سے معلوم

ہوتا ہے کہ ان کا تصوّرِ حسن ایک انفرادی شان رکھتا ہے۔ ان کے بعض اشعار جمالیاتی کلیے چند اشعار کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ غالب ایک تربیت یافتہ ذوق رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ ان کے لیے عشق بھی ایک تہذیبی عمل تھا۔ غالب کی لذت پرستی کا حال بیان کیا جا چکا ہے۔ حسن پرستی کے متعلق ان کا یہ قول ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے کہ علی العموم دعوئ حسن پرستی رہے تو بہتر ہے۔ اشعارِ ذیل سے ان کے نقطۂ نظر کی ترجمانی ہوتی ہے

یک ذرّۂ زمیں نہیں بے کار باغ کا — یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا

تھی وہ اک شخص کے تصوّر سے — اب وہ رعنائیٔ خیال کہاں

ہے رنگِ لالہ و گل و نسریں جدا جدا — ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے — بجلوہ ریزیٔ باد و بہ پرفشانیٔ شمع

جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو — جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جمالیات کا تعلق صرف خیال ہی سے نہیں، شاعرانہ اظہار کے حسن سے بھی ہے۔ طرزِ ادا کا حسن، جسے حسنِ بیان کہتے ہیں، غالب کے لیے ایک بنیادی جمالیاتی قدر کا حکم رکھتا ہے اور جا بجا وہ اپنے اندازِ بیان پر فخر کرتے ہیں۔ جب حسنِ تصوّر اور حسنِ بیان میں مطابقت ہو تو شعر جمالیاتی شاہکار بن جائے گا۔ چنانچہ جہاں ایک مطابقت پیدا ہو گئی ہے (اور غالب کے بہترین اشعار اس معنی میں مثالی قرار دیئے جا سکتے ہیں) ایک ایسا نشاطیہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ ذہن میں پھول کھلنے لگتے ہیں اور روح میں انبساط کی لہر اٹھنے لگتی ہے۔ پھر بھی غالب کے الفاظ میں ایک قسم کی غنائیت کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ ہر چند کہ بلند آہنگ نغمگی سے ان کے اشعار معمور ہیں اور بلند خیالات سے اس نغمگی کا جوڑ بھی ہے۔

غالب کی گرم گفتاری

غالب عقلیت کے دلدادہ ضرور ہیں، لیکن عقل کے ذریعے محض استدلال کرنا ان کی نظر میں شاعری نہیں۔ جذبے اور تعقل کا امتزاج کلامِ غالب میں اُردو کے دوسرے تمام شعرا سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ گرم گفتاری غالب کی نمایاں خصوصیت ہے اور اس پر توجہ

نہ دی جائے تو غالب کے لہجے اور طرزِ بیان تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ گرم گفتاری جذبات کی حدت کا نتیجہ ہے۔ بتلایا جا چکا ہے کہ غالب کا تخیلی محور "آگ" ہے۔ محبوب بھی آتشیں ہونا لابدی ہے ؂

صبح آیا جانبِ مشرق نظر اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا

اِمشب آتشیں روئے گرم زِند خوانیہاست کز لبش نوا ہردم در شرر فشانیہاست

محبوب آفتاب ہے اور آفتاب محبوب، پھر شاعر آتش نوا نہیں ہوگا تو کیا ہوگا ــــ

"گرمِ زند خوانی" کا تعلق ہرمزد (ملا عبد الصمد) کی تعلیمات سے جو کچھ ہو، اصل میں غالب کے آتشیں تصورِ حسن سے ہے۔ خون گرم تھا، جذبات میں حدت تھی، تو تصورات میں ایک آتشیں کیفیت تھی۔ "سر گرمِ نالہ ہائے شرر بار" ہونے کا ذکر بھی روائتی بات نہیں اور بڑھاپا آیا تو جذبات کی خنک منزل میں آفتاب کی جگہ ماہتاب نے لے لی ؂

غافل ان ماہ طلعتوں کے واسطے چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

یعنی محبوب ماہ طلعت ہو تو عاشق بھی ماہ طلعت ہی ہو، جیسا جوانی میں اپنے کو سمجھتے تھے، اور ع یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

اب بھی بڑھاپے کے باوجود اپنے کو اس قابل سمجھتے ہیں کہ حسینوں کے مرکزِ توجہ سمجھے جائیں۔ اس لیے کہ محبوبوں کے محبوب ہیں اور خود اپنے عاشق۔ لیکن اب "آتش پرست" نہیں کہے جاتے، اب بھلا نالہائے شرر بار میں وہ سرگرمی کہاں! یہ دور تو وہ ہے کہ ع

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن

اور جسم ہے کہ احتراقِ خون سے سرد پڑا جاتا ہے۔ پھر بھی قابلِ تماشا ہیں۔ خون اور آگ کے گرم تصور سے پیچھا اس عمر میں بھی نہیں چھوٹتا۔ (ع جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے) لیکن پھول اور ستارے بھی دھیان میں آتے ہیں۔

غالب کے نظریۂ فن میں گرم گفتاری ایک جمالیاتی قدر ہے۔ بندش چست ہو، مضامین متین و اعلیٰ، اور لہجے میں گرم گفتاری۔ البتہ وہ شعرائے کرام جن کا نصب العین ہی قافیہ پیمائی ہے، گرم گفتاری سے علاقہ نہیں رکھتے۔ وہ تو قافیے پر تکیہ کر کے الفاظ جوڑتے

ہیں۔ لیکن جہاں سینے میں جذبات کا لاوا اُبل رہا ہو وہاں لہجے میں آتشیں کیفیت ہونی فطری ہے، چاہیے ابلاغ کے لیے استدلالی طرزِ بیان ہی کا سہارا لینا پڑے۔ جہاں دوسرے شعراء کی تعریف کی ہے اِسی بنا پر کی ہے۔

غالبؔ اور مطالعۂ فطرت

نیچرل شاعری اُردو میں رائج ہوئی تو "نیچرل" کے وہ معنی لیے گئے جو کلاسیکی انگریز شعرا اٹھارویں صدی میں لیتے تھے، یعنی "فطرتِ انسانی کے مطابق" اور وہ موضوعات سامنے آئے جو انسانی فطرت سے متعلق ہیں، امید، بخیلی و فضولی، آزادی، حسن، غم، سچ وغیرہ۔ اور مناظرِ قدرت کے معنی میں فطرت کی تصویر کشی اگر کی گئی تو بھی مطالعۂ فطرت کے بغیر، تخیل کے ذریعے اور روایتی اور کتابی انداز میں۔ نیچرل شاعری اور قومی شاعری مل جل کر ایک ہو گئے۔ فارم خواہ غزل کی ہو، یا مثنوی کی، یا مسدّس کی۔ غزل کی فارم ہو تو قطعے کے ذریعے تسلسل قائم کر کے نیچرل شاعری کی گئی۔ البتہ غزل کے مضامین لخت لخت اشعار سے گریز کیا گیا، اگرچہ زبان وہی غزل کی زبان رہی سبزہ، چمن، پھول، چاند، سمندر، دریا، بیر بہوٹی، آمدِ صبح، بہار، خزاں، وغیرہ اس طرح کے چند موضوعات ہیں۔ مراثی میں جو مناظر ہیں وہ بڑے ہی حسین مگر سب کے سب تخیلی ہیں اور مقصد کی خاطر بیان کیے گئے ہیں، اور مثنویوں میں بھی ایسا ہی ہے۔

غزل میں مناظر کشی اور مطالعۂ فطرت کی گنجائش نہ سہی، نہ ایسی روایت کبھی رہی ہے۔ پھر بھی غالبؔ کے کلام میں عالمِ فطرت کا بیان جہاں کہیں آتا ہے، تصنّع کا احساس نہیں دلاتا۔ "ذکرِ غالب" میں مالک رام نے اُن جانوروں کی فہرست گنوائی ہے جو غالبؔ کے ہاں پلے ہوئے تھے (طوطے، مینائیں، کبوتر، بلّیاں وغیرہ)۔ جانداروں اور خاص کر بے زبان جانوروں کی محبت غالبؔ کی طبیعت کے ایک رُخ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ گلشن، صحرا، ویرانہ روایتی مضامین سہی، بہار کی آمد پر یہ قطعہ اہلِ دل سے کیا کہتا ہے ؎

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

یہ آخری شعر وہی کہہ سکتا ہے جسے کیٹس (keats) کی طرح بہار کی زرخیزی کا مشاہدہ کرنے کا شوق ہو۔ بہار کی سرسبزی کی انتہائی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ نمی کی وجہ سے سطحِ آب پر کائی پھیل جائے۔ وہی شاعر اس کی تعریف کرے گا جسے مناظرِ فطرت سے دلی مناسبت ہو، ورنہ عام شعور رکھنے والا تو کائی سے نفرت کرتا ہے۔ پھر اسی قطعے میں کہتے ہیں ؎

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر　　بادہ نوشی ہے بادپیمائی

یعنی اپنے تجربات کے رنگین شیشے سے مطالعۂ فطرت کرتے ہیں۔

اس قطعے کی روشنی میں کلامِ غالبؔ سے ایسے متعدد اشعار نکالے جا سکتے ہیں، جو غالبؔ کی مشاہدۂ فطرت سے مناسبت کی دلالت کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غزل کی صنف کا تقاضا یہ ہے کہ عمومی تاثرات کو شعر میں بیان کیا جائے۔ انفرادی تصویریں مناظرِ فطرت کی اگر کھینچ سکتی ہیں تو نظم میں نہ کہ غزل میں۔

غالبؔ اور سرقہ

سرقے کا الزام شاعروں پہ قدیم یونانی زمانے سے لگایا جاتا رہا ہے۔ شعر پہ سرقے کا اطلاق اُس وقت ہوتا ہے جب دانستہ اور بغیر حوالہ دیئے ہوئے کسی شاعر کے اس خیال کو اس طرح نظم کیا جائے کہ مشابہت ظاہر ہو، اور ذہن اصل شعر کی طرف منتقل ہو۔ چنانچہ ایسی چوری پکڑی جاتی تھی تو مضمون چرانے کی بڑی بدنامی ہوتی تھی۔ آج بھی کم و بیش یہی صورتِ حال ہے، لیکن اب ہم یہ الزام عائد کرتے وقت بہت کچھ سوچتے اور مسئلے کی چھان پھٹک کرتے ہیں۔ ہم غور کرتے ہیں کہ کہیں یہ توارد تو نہیں ہے۔ ایک ہی زمانے کے دو شاعروں کے کلام میں توارد ہونا بین ممکن ہے۔ شاعر آخر انہی خیالات کو اپنے کلام میں نظم کرتا ہے جو فضا میں ہوتے ہیں، اور انہی موضوعات پر فکر کرتا ہے جو اس کے زمانے میں قابلِ توجہ اور مقبول ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شاعر ایک ہی دور سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ کسی غیر معروف شاعر کا شعر خصوصاً پرانے زمانے میں، محدود حلقے تک رسائی حاصل کر سکتا تھا

بعد کے کسی شاعر کو وہی یا ویسا ہی خیال سوجھ سکتا ہے جب کہ اُس کے فرشتوں کو بھی غیر معروف شاعر کے شعر کی خبر نہ ہو۔ غزل کی شاعری میں ردیف و قافیہ کی یا صرف قافیے کی یکسانی کی بنا پر توارُد کا امکان رہتا ہے خصوصاً اس صورت میں کہ غزل کی شاعری کی علامات جوں کی توں موجود ہیں یا وقت کے ساتھ اُن کی معنویت میں بہت نمایاں فرق نہیں ہوا ہے اور ان علامات کے ساتھ وہی رعایات و مناسبات مستعمل ہیں جو پہلے تھیں[1]۔ مضامینِ غزل گنتی کے ہیں، اس لیے توارُد ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ لیکن سرقے کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ میر نے ایک شعر میں دوآبے کا مضمون باندھا، جو ان کے معاصر بقاؔ کا نتیجۂ فکر تھا۔ بقاؔ نے دل جلے دل کے پھپھولے یوں پھوڑے ہیں ؎

میر نے گر ترا مضمون دوآبے کا لیا	اے بقاؔ تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
اے خدا میر کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے	اور بینی کا ہو یہ حال، کہ ترِ بینی ہو

ہو سکتا ہے کہ کوئی خیال شاعر کے ذہن کی گرفت کرے اور شاعر بےچارہ بے دھیانی میں وہ خیال نظم کر بیٹھے۔ میر کے ساتھ غالباً ایسا ہی ہوا، اور ایسا ہو جانا فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔ غالبؔ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ غالبؔ کی بیدلؔ پرستی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے بیدلؔ کی طرزِ فکر طبیعت پر اثر انداز تھی مگر بیدلؔ کا یہ شعر دھیان سے اُتر گیا ہوگا ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل	ہر کہ از بزمِ تو برخاست، پریشاں برخاست

شعر کہنے بیٹھے تو کہہ گئے ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل	جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

ورنہ بیدلؔ اتنے گمنام بھی نہ تھے۔ اُن کے کلام کے جاننے والے معاصرینِ غالبؔ میں زائد از شمار ہوں گے۔

عرشیؔ نے اپنے مرتب کردہ دیوانِ غالبؔ کے باب "شرحِ غالبؔ" میں عالمانہ تحقیق کے

---

[1] مشہور خوشگو صفیؔ لکھنوی کا یہ شعر کسے یاد نہ ہوگا ؎ غزل اُس نے چھیڑی مجھے ساز دینا — ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا
"آج کل" (دہلی) میں ایک صاحب نے کسی گمنام پرانے ایرانی شاعر کا ایک شعر دریافت کر کے بڑی تحقیق کے ساتھ دعویٰ کیا ہے کہ صفیؔ لکھنوی کا یہ شعر سرقے کی مثال ہے۔ ساری بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ قوافی میں یکسانی ہے اور ساز و آواز کے استعمال کی وجہ سے مناسبات میں مماثلت ہے، ورنہ مضمون میں اختلاف موجود ہے۔ عہدِ اکبری کے ایرانی شاعر کا کلام ریڈیو یا رسائل کے ذریعے

کے ساتھ ایسے فارسی اشعار نقل کیے ہیں جن کے نقوش غالب کے اُردو اشعار میں ملتے ہیں یہ سرقہ یا توارد نہیں، چراغ سے چراغ جلانے کا معاملہ ہے اوّل تو زبان کے ابتدائی دور کو ترجمے کا دور کہا جانا چاہیے۔ دوسری زبانوں سے بہترین افکار لے کر اپنی زبان کو مالا مال کرنا، اُردو شعرا کا دستور رہا ہے۔ میر کے کلام میں اس کی مثالیں ہیں۔ غالب کے کلام میں ایسا ہی ہے۔ اقبال کی پہنچ مشرق و مغرب کے سرمایۂ خیال تک تھی، انھوں نے اِسی اصول کے تحت گیسوے اردو کو سنوارا ہے۔ غالب نے ایک ایسے الزام کے جواب میں کہا ہے

مبر گمانِ توارُد، یقیں شناس کہ دُزد   متاعِ من ز نہاں خانۂ ازل بردست

یعنی یہ خیال تو میرا مال تھا۔ چور تو وہ ہے جو مجھ سے پہلے اس خیال کو لے بھاگا۔

دراصل خیال کسی کی جاگیر نہیں۔ خیال اُس کا ہوتا ہے جو اُس خیال کو قطعی شکل دے سکے[1]، نہ کہ اُس کا جو اُسے باندھنے کی ناکام کوشش کرے۔ سوال تقدیم و تاخیر کا نہیں، اور اگر ہے تو صرف اتنا کہ جب کسی خیال کو بہترین اسلوب بیان کے ذریعے آخری و قطعی شکل دے دی جائے تو نقالی کرنا عیب ہے۔ بعض شاعر تمام عمر اپنے مقبول ترین اشعار کی نقل اُتارتے ہیں اور اپنے مال کا سرقہ کرتے رہتے ہیں۔ غالب جیسا شاعر تو ثابت کرتا ہے کہ دیکھو، اس خیال کو یوں شعر کی صورت میں ڈھالتے ہیں۔ کبھی ایک ہی بات کو اُردو اور فارسی دونوں میں کہہ کر دکھایا ہے اور فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کونسا پیرایۂ بیان بہتر ہے۔

غالب اور عینیت

فلسفے کی ذیل میں غالب کی عینیّت بھی آجاتی ہے۔ الگ اِس پر تھوڑی سی بحث اس لیے کی جا رہی ہے کہ غالب کی شاعری میں فکری عناصر کی اہمیت نظر میں رہے۔ افلاطونی فلسفہ اسلامی افکار میں داخل ہو کر اہلِ فکر اور شعرا کو متاثر کرتا رہا ہے۔ جمالیات پر جن کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ حسن، صداقت، اور نیکی باہم مربوط ہیں۔ حسن کو تو صداقت اور نیکی پر فوقیت بھی دی جاسکتی ہے۔ حسن ہی صداقت اور نیکی کا سرچشمہ ہے، یعنی حسن کا تصور نہ ہو تو

---

[1] شیکسپیئر کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

صداقت اور نیکی کا تصوّر پیدا ہونا محال معلوم ہوتا ہے۔ حسن کا مجرّد تصوّر اپنی جگہ۔ ایک معروضی تصورِ حسن بھی موجود ہے جو بیک وقت شخصی بھی ہے اور آفاقی بھی۔ اگر میں کسی چیز کی تعریف کروں، لیکن دوسروں کے لیے وہ چیز اثر نہ رکھتی ہو تو میرا تصوّرِ حسن محدود اور بے معنی ہوگا اسی لیے کم از کم ایک تہذیبی نمونے یا طراز (Cultural Pattern) میں ایک تاریخی دور میں ایک ہی تصوّرِ حسن کا پایا جانا فطری ہے۔ بلکہ تصوّرِ حسن آفاقی بھی ہو سکتا ہے جس طرح افلاطونی تصوّرِ حسن آفاقی ہے۔ غالبؔ کے کلام میں حسن کا مثالی اور عینی تصوّر جاری و ساری ہے جیسے بدن میں خون۔ غالبؔ کو مثالی حسن کی پرستش سے کام تھا نہ کہ اُس کی ظاہری صورت سے۔ اصنام کا ذکر تو برائے بیت ہے، اصنام کی خوبی بھی اسی لیے قابلِ تسلیم ہے کہ ان میں حُسنِ کُل کی جھلک ہے۔

ظاہری پرستش بجائے خود نصب العین نہیں ہو سکتی ہے قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں دیر و حرم کی تعریف کرتے ہیں ؎

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنّا واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

یعنی دیر و حرم اسی حد تک قابلِ تسلیم ہیں کہ تمنّائے عشق کے اظہار کی صورتیں ہیں مگر یہ تصوّرِ حسن سے فرار کا ذریعہ بھی ہیں۔ غالبؔ کے حُسنِ تصوّر کا یہ عالم ہے کہ عالمِ امکاں سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے ؎

ہے کہاں تمنّا کا دوسرا قدم یارب ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

اور واقعی، نصب العین امکانات سے آگے کی چیز ہے، البتّہ دشتِ امکاں میں حسن کے نقشِ پا مل سکتے ہیں۔

اسی عینیّت یا مثالی حُسن کو چاہنے کا نتیجہ یہ ہے ؎

جامِ ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنّا مجھ سے کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

عاشق کے اندر وہ جذب و کشش پیدا ہوتی ہے کہ اُس پر جوہرِ عشق ہونے کا گماں ہوتا ہے اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ عاشق کی کیفیت اپنے اندر جذب کرنے لگتا ہے۔ مصرعِ ثانی کی خوبیوں پر اظہار کا یہ موقع نہیں۔

غالب کی بلند خیالی اور اُن کا نشاطیہ و انبساطی لہجہ ایک دوسرے سے پوری مطابقت رکھتے ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر اس خاکدانِ تیرہ سے کہیں بلند ہو کر سوچتا ہے اور اس کی رسائی ایسے عالم یا عالموں تک ہے جو اِس دنیا سے دور اور بالا ہیں۔ یہ رسائیِ فکر غالب ہی کا حصہ ہے۔ گویا مضامینِ عالی ہاتھ باندھے شاعر کی حضور حاضر ہیں ؎

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیِ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا
وہی اک بات ہے جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے — چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا
نہ ہو گا یک بیابان ماندگی سے ذوق کم میرا — حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
دونوں جہان دے کے وہ سمجھے، یہ خوش رہا — یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

بلندی، وسعت، نزاکت، گہرائی، اچھوتے پن کے لحاظ سے غالب کے اشعار مثالی ہیں۔

کلامِ غالب میں ترقی پسندانہ رجحانات

غالب نے پوری حقیقت شناسی کے ساتھ زندگی کے مادّی اور معاشی پہلوؤں کو نظر میں رکھا۔ سوانح اور مکتوبات کی روشنی میں یہ فیصلہ کرنا دشوار نہیں کہ غالب کوئی پھول سونگھ کر جینے والے جذباتی شاعر نہ تھے۔ غالب کے اُردو فارسی کلام میں ترقی پسندی کی جھلکیاں نظر آتی ہیں ؎

کچھ تو جاڑے میں چاہیے آخر — تا نہ دے بادِ زمہریر آزار
کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش — جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار
آگ تاپے کہاں تلک انساں؟ — دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار
اگر خدائے بداند کہ زندہ تو ہنوز — ہزار مشت زند بر دہانِ عزرائیل
غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر — کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
قد و گیسو میں قیس و کوہکن کی آزمائش ہے — جہاں ہم ہیں وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے
ناے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے — جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہوئے
لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

اگر بوئے بجائے دانہ دہقاں نوکِ نشتر کی — رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے
ہوئی زنجیر، موجِ آب کو فرصت روانی کی — کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی؟

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ترقی پسند تحریک کو ۱۹۳۵ء تک انتظار کرنا تھا، اس لیے ترقی پسند ادب کے اصولوں پہ کلامِ غالبؔ کو پرکھنا درست نہیں ہو سکتا، لیکن یہ اشعار جو بیک نظر انتخاب کیے گئے ہیں، ترقی پسند رجحانات کا واضح اشارہ کرتے ہیں۔ میں نے اس زاویۂ نگاہ سے دیوانِ غالبؔ کا جائزہ نہیں لیا، لیکن ایسا جائزہ لیا جانا چاہیے۔ معاشی پہلو تو غالبؔ کو متاثر کرتا ہی تھا، اس سے جو فلسفۂ زندگی مترتّب ہوتا ہے وہ بھی غالبؔ کے شعور میں موجود تھا۔ (۱) معاشی بدحالی، جو جاگیرداری اور سرمایہ داری کے نتیجے میں ظہور میں آتی ہے، جسموں کے بکنے کی ذمّہ دار ہے۔ پھول سے جسم بازار میں بکنے لگتے ہیں۔ چوری، چور بازاری، طوائفیت، سب معاشی بدحالی اور سرمایہ دارانہ نظام ہی کی پیداوار ہیں۔ (۲) انقلابی شاعری، جو دار و رسن کی آزمائش گاہ ہے، قد و گیسو پر مرمٹنے کو نصب العین قرار نہیں دیتی۔ (۳) انسان دوستی اور عوام پرستی کی لگن میں انقلابی شاعروں نے اپنا خون تک دیا ہے۔ "ہاتھ ہمارے قلم ہوئے" میں "ہمارے" سے مراد ایک دو نہیں، نہ صرف معاصرینِ غالبؔ ہیں، بلکہ ہر ملک اور ہر دَور کے انسانیت پرست شعرا ہو سکتے ہیں۔ (۴) اس قسم کے اشعار روایتی مضامینِ غزل سے اس قدر مختلف ہیں کہ قاری کو یہی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شاعر اپنے دل کی بات، پورے خلوص کے ساتھ، ہم تک پہنچا رہا ہے۔

یہاں یہ اعتراض اُٹھایا جا سکتا ہے کہ کیا غالبؔ کو فلسفۂ انقلاب سے واقعی آگاہی تھی، اور اگر نہیں تھی تو کیا ہم اپنے دَور کے خیالات کو زبردستی کلامِ غالبؔ پر منطبق نہیں کر رہے۔ میں عرض کروں گا کہ عظیم شاعری میں ایک ایسا شعور ملتا ہے، خواہ وہ مبہم ہی سہی، جو عالمگیر اور ابدی ہوتا ہے اور وقت اور مقام کا پابند نہیں ہوتا۔ انقلابی شاعری کی اساس تین کلیوں پر ہے۔ (الف) طبقاتی پیوستگی و آویزش (ب) تبدیلیِ صفت (ج) نفیِ نفی۔ سو ایک ایسے دور میں طبقات کا ایک دوسرے پر اثر انداز ہونا مسلّم ہے، جیسا دَورِ غالبؔ کا تھا۔ دوسرے یہ کہ وہابی تحریک کی وجہ سے خصوصاً اور بڑھتے ہوئے انقلابی نظریے کی وجہ سے

عموماً، باشعور اہلِ ہند، مجاہدینِ آزادی میں تبدیل ہوتے جاتے تھے اور آخر کار ہو گئے تھے۔ تیسرے اہلِ ہند کا ہر محاذ پر انگریزی سامراج سے شکست کھانا، مگر جنگ جاری رکھنا۔ سراج الدولہ، میر قاسم، ٹیپو سلطان، تانتیا ٹوپی، رانی جھانسی سے لے کر رانا پرتاپ، محمود الحسن اسیرِ مالٹا، عبید اللہ سندھی، آربندو گھوش کی تحریکوں تک، اور آخر میں بھگت سنگھ اور دت کی قربانی تک، نفی اُنفی کا اصول کارفرما ہے۔ غالب کے دور میں کیا کچھ نہیں ہوا؟ ۱۸۵۷ء کی انقلابی جنگ کس دور میں لڑی گئی تھی؟

یہ ایک تاریخی حادثہ ہے کہ غالب جاگیردارانہ نظام کے زوال اور سرمایہ دارانہ نظام کی ابتدا کے زمانے میں پیدا ہوئے اور اُن کو خلعت، جاگیر اور پنشن کے حصول کی تمنا عمر بھر رہی۔ اس کے باوجود اُنھوں نے حالات کو سمجھنا چاہا اور اپنے زمانے سے آگے دیکھنے کی کوشش کی۔ شاعری کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ (۱) زندگی کی عکاسی (۲) حقیقتِ اشیا کا ادراک۔ غالب نے اپنے مشاہدے اور تخیل سے دونوں مقصد حاصل کر کے دکھا دیئے۔ غالب نے عصرِ حاضر کے انسان کی طرح ارضی زندگی سے اپنا رشتہ جوڑا اور معاشی اور مادی مقاصد کو نظرانداز نہیں کیا۔

غالب کا طنز

حالات کی خرابی پر غم و غصہ طنز کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بجائے سادہ و صاف زبان استعمال کرنے کے طنز نگار کبھی ہنسی اُڑاتا ہے، اور پھبتی کستا ہے کبھی ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے دوہرے معنی ہوتے ہیں۔ ظاہری معنی کچھ اور ہوتے ہیں اور باطنی کچھ اور۔ کبھی ان کے بین بین راستہ اختیار کرتا ہے، جسے خالص طنز کا نام دیا جاتا ہے۔ بہرحال مقصد حالات کے ساتھ بے اطمینانی کا شدید اظہار ہوتا ہے۔ طنز کی سطحیں بھی بے شمار ہیں۔ کہنے کو تو طنزیہ شاعری ایک قسم کی معاشرتی شاعری ہے۔ لہٰذا طنز کا رخ سماج کی طرف ہونا اور معاشرے کی برائیوں کے خلاف غم و غصہ کا اظہار طنز نگاری کا اصلی مقصد ہے۔ لیکن کبھی طنز نگار حیات و کائنات پر طنزانہ نگاہ ڈالتا ہے۔ اور کبھی وہ اپنی ذات کو اپنے طنز کا نشانہ بناتا ہے۔

طنز نگاری کے لیے حدود کا تعین چنداں ضروری نہیں۔ خدا سے لے کر انسان تک اور معاشرے سے لے کر حیات و کائنات تک ایک لامحدود علاقہ طنز نگار کو دعوتِ تنقید دیتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ ہے کہ ایک مثبت عینیت طنز نگار کے تحت شعور میں ہوتی ہے جس کا گردوپیش سے مقابلہ اُسے طنزیہ انداز اختیار کرنے پر اُکساتا ہے۔ سماج کی اصلاح کے بجائے طنز نگار اپنے دل کا غبار نکالتا ہے اور اپنے ہم خیالوں کو تسکین اور حالات کا مقابلہ کرنے کا پیغام دیتا ہے۔

طنز نگار حقیقت کا کوئی ایک پہلو اپنے سامنے رکھتا ہے۔ ایک نہ سہی ایک سے زیادہ سہی۔ لیکن یہ ایک بنیادی شرط ہے کہ حقیقت کا مطالعہ تمام و کمال وسعت کے ساتھ نہ کیا جائے۔ بلکہ توجہ کو ایک یا چند پہلوؤں تک محدود رکھا جائے۔ اگر ہم تمام و کمال حقیقت پر اظہارِ خیال کرنے بیٹھیں تو چند برائیوں کے ساتھ کچھ خوبیاں بھی ہمارے سامنے آجائیں گی۔ برائیوں کے خلاف اظہارِ غم و غصہ کرنے کے ساتھ ساتھ ہم خوبیوں کا اعتراف بھی کریں گے۔ اس سے ایک مفاہمت پیدا ہوگی۔ اور آخر میں ہم بے اطمینانی کی جگہ اطمینان کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، اور جس کے خلاف ہمیں شدید غصہ تھا، اُسے معاف کر دیں گے اس طرح طنز کا اثر ختم ہو جائے گا۔ طنز نگار کا ایک حد تک تنگ نظر ہونا بھی ضروری ہے۔ وہ مفاہمت اور معافی کا قائل نہیں ہوتا۔ اور اگر ہو جائے تو پھر وہ طنز نگار نہیں رہتا۔ طنز نگاری میں مبالغے کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر بات سیدھی سچی ہو، اور مبالغے کے بغیر سادہ طریقے سے بیان کر دی جائے تو طنز کا اثر ہلکا ہو جائے گا۔ طنز کا وار بھرپور ہونا چاہیے اور لہجے میں ایسا زہر خند ہو کہ اس کا اثر محسوس کیے بغیر کوئی نہ رہ سکے۔ یوں تو طنز اپنی جگہ بھی ایک حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن جب طنز کا اشتراک مزاح کے ساتھ ہو جائے تو اس کا اثر کئی گنا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم خالی طنز کا لفظ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ عام طور پر طنز و مزاح کو یکجا کر کے بولتے ہیں۔ جو دراصل دو چیزیں ہوں۔ لیکن عموماً ساتھ پائی جاتی ہیں۔ طنز کو مزاح سے الگ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دونوں کے پیرائے ملتے ہوئے ہیں۔ لیکن اثر الگ الگ ہیں۔ طنز میں نفرت اور ناخوشی کا رنگ ہوتا ہے۔ لیکن مزاح شوخیِ طبیعت، فطری بذلہ سنجی اور خوش دلی سے پیدا ہوتا ہے۔ جب ہنسنا ہنسانا مقصود ہو، ہمیں طنز کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن جب

بے اطمینانی اور برہمی کا اظہار مقصود ہو تو محض مزاح ہمارے کام نہیں آسکتا۔[1]

طنز کی ایک مشہور مثال وہ ہے جس میں انگریز طنز نگار سوئفٹ (SWIFT) نے آئرلینڈ کے لوگوں کی بے بسی اور افلاس اور انگریز حکام کے ظلم و تشدد کو بے نقاب کیا ہے۔ اس کے مقالے کا نام ہے "چند عاجزانہ تجویزیں"۔ مصنف یہ رائے دیتا ہے کہ آئرستانی بچوں کو پکا کر کھانا چاہیے۔ ان کا گوشت بڑا لذیذ ہوتا ہے۔ انگریز اہل ثروت اپنے کھانے کی میز کو اس لذیذ گوشت سے سجائیں تو بڑا مزا آئے۔ اس طرح ایک تو آئرلینڈ کی آبادی ضرورت سے زیادہ نہ بڑھنے پائے گی۔ دوسرے غریب ماں باپ کو اولاد پیدا کرنے کا پھل بھی مل جائے گا۔ اور دولت حاصل کرنے کی خاطر وہ اور بھی زیادہ بچے پیدا کریں گے۔ تیسرے گندگی میں لتھڑے ہوئے اور گلیوں اور سڑکوں پر پڑے ہوئے یا آوارہ کھیلنے والے بچوں کے مسئلے کا بہترین حل یہ ہے کہ انھیں بڑے آدمیوں کی میز پر چنا جائے، اور ان کے گوشت سے لذت حاصل کی جائے۔ یہ مقالہ بظاہر کتنا معصوم معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں خون کے آنسو چھپے ہوئے ہیں۔ یہ طنز نگاری کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔

اردو شاعری میں اتنی گنجائش تو کہاں کہ حالات پر کھل کر تبصرہ کیا جائے۔ شہر آشوب کے ذریعے سودا نے اپنے زمانے پر اچھا طنز کیا۔ لیکن شہر آشوب سودا کی ایک مختصر نظم ہے۔ نظیر اکبرآبادی نے عوامی زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں۔ سماج کے نچلے طبقے سے نظیر کو پوری آگاہی تھی۔ لیکن سودا کے برخلاف نظیر کا مقصد طنز نگارانہ نہ تھا۔ کہیں کہیں طنز بھی ہے لیکن طنز سے زیادہ مزاح کی کارفرمائی ہے، اور نقطۂ نظر غیر ہمدردانہ نہیں ہے۔ نظیر کی نظمیں بھی مختصر نظمیں ہیں جہاں تک غالب کا تعلق ہے انھوں نے طنز کے لیے غزل کی صنف کو منتخب کیا، اور غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کی بنیاد بیت پر ہے۔ دو مصرعوں میں جتنا مطلب سما سکتا ہے اس سے زیادہ پر غالب کی دسترس نہیں ہے۔ اس کے علاوہ غزل کے مضامین اپنی اپنی جگہ آزاد ہوتے ہیں، اور ایک شعر دوسرے سے بے تعلق۔ چنانچہ کسی غزل میں دو ایک شعر

---

[1] خالص مزاح بھی غالب کے ہاں مل جاتا ہے مگر خال خال سے

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصے میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

بغل میں غیر کی آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ
سبب کیا خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا

دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

طنزیہ بھی ہو سکتے ہیں۔ اس طرح مجموعی تاثر پیدا نہیں ہوتا۔ ان بندشوں کے ساتھ ہم غالبؔ کی طنز نگاری پر نظر ڈالیں تو اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ حدودِ غزل میں رہ کر انھوں نے اپنی طنزانہ طبیعت کے جوہر اس خوبی سے دکھائے کہ دوسرا غزل گو اُن کے رتبے کو نہیں پہنچتا ؎

زندگی اپنی جو اس شکل سے گزری غالبؔ — ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا — وگرنہ شہر میں غالبؔ کی آبرو کیا ہے؟

نہ لٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا — رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

اگر خدائے بداند کہ زندہ ام تو ہنوز — ہزار شست زنار بر دہان عزرائیل

ناقدریٔ زمانہ کی شکایت غالبؔ نے بار بار کی ہے۔ لہجہ کبھی انتہائی درد انگیز اور تلخ ہو جاتا ہے ؎

حسد، سزائے کمالِ سخن ہے، کیا کیجے — ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کیجے

میں اس موقع پر غالبؔ کی "طنزانہ بصیرت" (IRONIC VISION) کا مسئلہ اٹھانا نہیں چاہتا[1]۔ اس میں شک نہیں کہ حیات و کائنات پر غالبؔ نے ایک طنز نگار کی طرح نظر ڈالی ہے لیکن اس خاص شعر میں مرکزی خیال معاشرے میں شاعر و فن کار کی حیثیت کا ہے۔ میرؔ جب زمانے کی ناقدردانی کی شکایت کرتے ہیں تو مرکزِ خیال اُن کی اپنی ذات ہوتی ہے۔ یہاں شاعروں اور ادیبوں کے طبقے کی طرف سے فریاد کی جا رہی ہے۔ طنز کے اس شعر میں دو رُخ ہیں۔ "حسد" کا رخ متشاعروں کی طرف ہے اور "ستم" کا رُخ اہلِ ثروت اور اہلِ دانش کی طرف۔ غالبؔ اپنے دَور کے فنکاروں کے مسائل سے آگاہ نظر آتے ہیں اور اُن کی ترجمانی کر رہے ہیں، اگرچہ اس آگاہی کی تہ میں اُن کا ذاتی تجربہ چھپا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ شعر کے تیور کہہ رہے ہیں کہ حسد اور ستم کے باوجود وہ شکست تسلیم نہیں کرتے۔ ع

آخر گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

بھی غموں کے مقابلے میں سینہ سپر رہنے کی ہمت کا اظہار کرتا ہے۔ یہاں بھی لہجہ درد انگیز ہے مگر بات ذاتی نوعیت کی ہے اور شکایت مقدّر سے ہے نہ کہ معاشرے سے۔ اگرچہ تکلیف

---

[1] میرے دوست پروفیسر اختر اقبال کمالی نے یہ اصطلاح وضع کرکے ایک ضرورت کو پورا کیا ہے۔ انھوں نے ایک مقالے میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث بھی کی ہے۔

معاشرے ہی سے پہنچتی ہیں۔ ع ہزار مشت زند بر دہانِ عزرائیل، ہیں طولِ عمر اور تنگیٔ رزق ذاتی نوعیت کا شکوہ ہے، اور شکایت کا رُخ کارپردازانِ قضا و قدر کی جانب ہے

طنز کے لیے غالب کا دو رُخا پن جب زبان کا دوہرا استعمال کرنے میں ظاہر ہوتا ہے تو بڑی پُرلطف صورتِ حال پیدا ہوتی ہے، یعنی کجامی زنی سے

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

"بندہ" اور "نوکر" پر زور دیجیے تو حُسنِ طلب ہے، "آپ" (بہادر شاہ ظفر، ممدوحِ غالب) کو سامنے رکھیے تو دوسرا پہلو نکلتا ہے۔ دونوں باتیں غالب کے پیشِ نظر ہیں، اسی طرح ع

ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا

یا سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہگری کچھ شاعری "ذریعۂ عزت" نہیں مجھے

یا روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ

اور حسن و عشق کے معاملات میں بھی یہی انداز ہے۔ غالب کی شاعری میں طنز کے پہلو اور سطحیں قابلِ غور ہیں۔ یہاں غالب کے تمثیلی (ڈرامائی) اندازِ طنز نگاری کو اُجاگر کرنا کافی ہے اس لیے کہ زبان کے دوہرے استعمال سے یہی مراد ہے۔ شاعر اور مخاطب اور قاری، گویا ڈراما کے تین کردار ہیں۔ مکالمے سے مخاطب، الفاظ کے صریحی و سطحی معنی اخذ کرتا ہے اور قاری، صریحی و سطحی معنی کو سمجھ کر، اُن سے گذرتا ہوا اصل اور گہرے مطالب تک پہنچتا ہے اور حظ حاصل کرتا ہے ان تینوں کرداروں میں روابط کی صورت یہ ہوتی ہے کہ چھُپی ہوئی عداوت اور ظاہری دوستی یا خدمت گذاری شاعر کی طرف سے، بے سوچے سمجھے ہر بات کو سچ ماننے اور اپنی بڑائی پر اترانے کا جذبہ مخاطب کی طرف سے، اور کورس کی طرح "تنقیدی شعور"، اور شاعر سے ہمدردی، قاری کی طرف سے متوقع ہے۔ ایڈی پس کمپلکس (oedipus Complex) کا اصول طنز میں خاص طور پر کارفرما رہتا ہے، یعنی پدر دشمنی کا جذبہ۔ غالب کی طنز نگاری میں ایک انوکھا احساس ملتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں کبھی کبھی ڈرامے کے تینوں کردار سمیٹ لیتے ہیں، یعنی خود اپنے خلاف طنز کر کے محظوظ ہوتے ہیں۔ ع تھی خبر گرم کہ غالب کے اڑیں گے پُرزے

خود ہی ایک لہجہ بناتے ہیں اور اس کے تاثر سے خود ہی لطف اندوز بھی ہوتے ہیں۔ میں اسے خود شعوری کے کمال سے تعبیر کروں گا۔ طنز نگار ہمیشہ نقاد ہوتا ہے، ایک طرفہ اور متعصب نقاد سہی۔ غالب تنقیدی شعور کے مالک تھے۔

غالب کی ارضیت

غالب کی ارضیت کی طرف اشارہ کرنے سے ہماری مراد یہ نہیں کہ ان کے کلام میں روحانی اقدار سرے سے مفقود ہیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ مادی زندگی اور اس کے مسائل کے ساتھ غالب کا گہرا تعلق ہے۔ شیخ محمد اکرام نے "غالب نامہ" میں اور مالک رام نے "ذکرِ غالب" میں اشارہ کیا ہے کہ ترک خاندان کے لوگ مذہب کے ساتھ بہت زیادہ شغف نہیں رکھتے ترک یوں تو اسلام سے آئے اور انھوں نے اسلام کی بیش بہا خدمات بھی انجام دیں۔ لیکن ان کی سرشت میں ایک عنصر جسے کافرانہ کہہ سکتے ہیں اور جو قبل از اسلام موجود تھا۔ کچھ نہ کچھ باقی رہا اور یہ امرِ واقعہ ہے کہ غالب کے کلام اور ان کی نجی زندگی دونوں میں ارضیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یوں تو غالب موحد تھے۔ مذہباً مسلمان اور اثنا عشری اور فکری لحاظ سے تصوف کے ساتھ یک گونہ تعلق خاطر رکھنے والے ہیں لیکن ان کی عملی زندگی میں مذہب کو کچھ زیادہ دخل نہ تھا۔ عقل انھیں مذہب کی طرف لے جاتی تھی اور ادراکِ نفس درحقیقت اشیا کی جانب ان کی توجہ مبذول کراتی تھی تو ان کی حیاتی زندگی کام و دہن کی لذتوں کی جانب انھیں ترغیب دلاتی تھی ؎

دل جو قمارِ عشق سے اپنا لگا چکے — وہ کعبتین چھوڑ کے کعبے کو جا چکے
ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — واں جو جاویں گرہ میں مال کہاں

یہاں عشق کا لفظ محض روائتی ہے۔ ورنہ اشارہ شوقِ قمار بازی کی طرف ہے[۱]۔ شراب کے متعلق یہ سب کو معلوم ہے کہ اُن کا مسلک کیا تھا۔ اب تو زمانہ بدل گیا ہے۔ اور ہم اتنے "ترقی یافتہ" ہو گئے ہیں کہ اگر کوئی شخص شراب نوشی کی علت میں گرفتار ہو تو وہ اپنے شوق کا اظہار برملا کرتا ہے اور جھجک نہیں محسوس کرتا۔ لیکن غالب کا دور کچھ ایسا تھا کہ شریف

---

[۱] زندگی پر حادثاتِ زمانہ کے اثر کی فلسفیانہ تشریح اس ایچ سے کرتے ہیں ؏ صحبتیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال

گھرانوں کے مسلمان پیتے بھی تھے۔ تو اس کمزوری کو چھپانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود غالب اپنی شراب نوشی پر نادم نظر نہیں آتے۔ نہ اسے راز رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ اپنے دور کے ان معدودے چند مشاہیر میں سے ہیں جو اپنی شراب نوشی کا اعلان بار بار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اسلامی معاشرے میں شراب نوشی کوئی فخر کی بات نہیں خیال کی جاتی۔ طرز فکر کے اعتبار سے کہا جا سکتا ہے کہ غالب اسلامی فکر و فلسفہ سے پوری طرح آگاہ تھے۔ پھر بھی ان کے فکر میں ایک جھلک غیر اسلامی افکار کی ملتی ہے۔ عملی زندگی میں وہ آزادہ رو تھے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی ذمہ دار ان کی وراثت ہو لیکن یہ ایک فکری مسلک بھی ہے۔ غالب پر "دہریت" کا جو الزام تھا، اسی مسلک کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وجودیت اور مظاہر پرستی میں بھی دیکھنے والے دہریت کا عنصر پاتے ہیں۔

ارضیت کی ایک عام اور فلسفیانہ صورت بھی ان کے کلام کے مطالعہ سے ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس کا تعلق عقاید سے نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے۔ جو غالب کو بیسویں صدی کے طرز فکر سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ بعض اوقات ان کی تشبیہات ٹھوس اور مادی ہوتی ہیں ؎

کہاں تک روؤں اس کے خیمہ کے پیچھے قیامت ہے!
مری قسمت میں یارب! کیا نہ تھی دیوار پتھر کی؟

پتھر کی دیوار کہہ کر شاعر نے تشبیہ میں جسامت اور دبازت پیدا کر دی ہے۔ ہم اپنی تشبیہوں میں مادی زندگی سے اپنی پوری پوری وابستگی ثابت کرتے ہیں۔ ہماری حیاتی تشبیہ اگر ماورائی قسم کی ہو تو ہم اسے ناقص کہہ سکتے ہیں۔ اس لیے کہ ہمارا حسی تجربہ مادی دنیا تک محدود ہے۔ اس قسم کی تشبیہات کی کلام غالب میں کمی نہیں ہے ؎

یوسف اُس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی — گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا
ہے کیا جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے — کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں
خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار — کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں
مر گیا پھوڑ کے سر غالب وحشی ہے ہے — بیٹھنا اس کا وہ آ کر تری دیوار کے پاس
مجکو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا — میں غریب اور تو غریب نواز

اشک کا مضمون باندھتے ہیں تو ایک خوبصورت بصری تمثال کے ذریعے نگاہ کو تار نقاب بنا دیتے ہیں ؎

اُلجھا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار
مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

غالبؔ کی ایک خصوصیّت یہ ہے کہ وہ واقعیّت نگاری سے بڑی مناسبت رکھتے ہیں۔ واقعیّت سے وہ آنکھ نہیں چرانتے اور مادیّت کو خواہ مخواہ درمیان میں لانا نہیں چاہتے اور اس بات کے اظہار سے شرماتے بھی نہیں۔ یہ بھی ہمارے دور کی ایک اہم خصوصیّت ہے ہم جانتے ہیں کہ ہمارا نقطۂ نظر مادّی ہے، اور ہم پکے دنیا دار ہیں۔ غالبؔ کے دَور میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ ہوگی۔ لیکن وہ اتنے بے باک اور صاف گو نہ تھے۔ یہ مسئلہ تصوّرِ حیات کی بنیادی اقدار کا ہے۔ یہ دنیا اچھی بری جیسی کچھ ہے۔ زندگی ہمیں یہ سکھاتی ہے کہ اس دنیا کو قبول کر لینا ہمارا فرض ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کی دنیاداری میں ہمیں اپنے دور کا پرتو نظر آتا ہے۔ غالبؔ کی موقع شناسی اور مصلحت کوشی کو ہم چاہے زبان سے پسندیدہ نہ کہیں اس لیے کہ "زمانہ با تو نہ سازد، تو با زمانہ بساز" کے بغیر عملاً زندگی گذارنا ممکن نظر نہیں آتا۔ عارف کے مرنے پر ذرا غالبؔ کا ردِّ عمل دیکھیے ؎

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا، کوئی دن اور

یعنی عارف کا مرثیہ لکھ رہے ہیں۔ اور خون کے آنسو روتے جاتے ہیں۔ لیکن عارف کے کردار کا صحیح جائزہ پیش کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتے۔ اور جب قریبی عزیزوں کے ساتھ یہ حال ہو تو بہادر شاہ ظفر کس گنتی میں ہیں کہ انھیں بخش دیا جائے ؎

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا
آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار

یعنی آپ مغل شاہنشاہوں کے وارث اور دلّی کے بادشاہ کہلاتے ہیں۔ کیا اس میں آپ کی رسوائی نہیں ہوتی کہ ملازمِ خاص کا یہ حال ہو کہ ننگے پھریں اور ادھار لے کر کھائیں۔ لہجے میں ایک وہ رُکھاپن بھی رہتا ہے۔ طنز بھی ہے اور حسنِ طلب بھی۔ دو رُخے پن کی خصوصیّت ایک مخصوص عقلیّت اور رضیّت کی پیداوار ہوا کرتی ہے۔ جب بہادر شاہ ظفر کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے کہیں ؎

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسروؔ، سراج الدین کو غالبؔ

یعنی مرشدِ روحانی بنا کر ان کی مریدی پر ناز کریں، تو غالبؔ کی مفاد پرستی اور دورُخے پن میں کلام نہیں کیا جا سکتا، اور انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد اس بیعت کا جو حشر ہوتا ہے وہ بھی ہم سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔

اسی طرح بہادر شاہ ظفرؔ کا سکّہ کہنے کے الزام میں انگریز حکومت نے ہنگامہ ۱۸۵۷ء کے بعد غالبؔ کی پنشن بند کر دی اور دربار موقوف کر دیا تو انھوں نے بھی حکّامِ وقت کی شان میں قصیدہ نگاری سے ہاتھ اُٹھا لیا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ غمِ روزگار میں ایسے پھنسے کہ شعر و شاعری سے کوئی خاص تعلق باقی نہ رہا۔ اس صورتِ حال کو انھوں نے بڑی واقعیت پسندی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ جب تک دربار میں جگہ ملتی تھی، اور خلعت و انعام سے نوازا جاتا تھا، حکام کی تعریف میں قصیدے لکھتا تھا۔ انعام و اکرام بند تو "چھٹی" بھی موقوف۔ غالبؔ کے اس بیان میں لہجہ بڑا طنزیہ ہو گیا ہے لیکن نقطۂ نظر خالص دنیادارانہ ہے۔ آنے والے دَور کو انھوں نے اسی نقطۂ نظر سے دیکھا اور اُس سے مصالحت کی۔ اسلامی اور روحانی اقدار کو ذہن کے پچھلے خانے میں بند کر کے مصلحتِ وقت کو اُوپر رکھا اور افادیّت کی راہ پر چل پڑے۔

ارضیّت کا مظاہرہ ایک اور طرح سے بھی ہوتا ہے۔ جب کسی شاعر کے بیان میں طرزِ استدلال منفی ہو تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہر اُس بات کی نفی کرے گا جو ماورائیت اور مابعد الطبیعات کی سطح سے متعلق ہو۔ غالبؔ کے کلام میں جو ہم کو ایک تشکیک کا عنصر ملتا ہے اور جہاں کہیں حیاتی تجربات سے غیر متعلق کوئی قول پایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اس قول کی نفی کی کوشش بھی پائی جاتی ہے۔ تو اس سے یہ اثر مرتّب ہوتا ہے کہ شاعر کسی صورتِ حال میں بھی اپنی عقلیّت اور ارضیّت کو ترک کرنے پر تیار نہیں۔ بلکہ ماورائی نقطۂ نظر کی تردید ہوتی ہے۔ اور اگر تردید بھی نہ ہو تو کم از کم اس پر شک کیا جاتا ہے۔ شاعر ہر بات کو ارضیّت کے علاقے سے عقل اور تجربے کی روشنی میں جانچتا پرکھتا ہے اور مافوق الفطرت پر اعتبار نہیں کرتا۔ زبان سے اقرار کرے بھی تو لہجے سے انکار کر رہا ہوتا ہے۔ یہ کیفیت کلامِ غالبؔ میں جگہ جگہ موجود ہے۔

(۵)

غالبؔ کا اسلوبِ بیان

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

اسلوب کا مسئلہ شخصیت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ بظاہر اسلوب کا تعلق خیالات اور ان کے اظہار سے ہے۔ لیکن ہمارے خیالات اور طرزِ اظہار پر ہماری شخصیت کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ رومانی تنقید میں خصوصیت کے ساتھ اسلوب اور شخصیت میں رشتہ تلاش کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ رومانی تنقید میں لکھنے والے کی انفرادیت پر زور دیا جاتا ہے۔ نفسیات کے ارتقا کے ساتھ ساتھ شخصیت کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ نفسیاتی تنقید میں بھی اسلوب پر بحث کرتے وقت شخصیت پر توجہ دی جاتی ہے۔ چنانچہ میرؔ کے اسلوبِ شاعری پر غور کرتے وقت ہمیں یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ ان کے شدتِ احساس میں ان کے حالات اور ان کی ذاتی خصوصیات کا کتنا پرتو ہے۔ ان کی دروں بینی۔ ان کی مقاومتِ غم، ان کا دھیما اور پُرسوز لہجہ۔ ان کی شخصیت کے اجزا ہیں۔ یہی حال دوسرے اہلِ کمال کا ہے۔ سوداؔ کی معروضیت، نظیرؔ کی خارجیت، دردؔ کا تصوف اور اسی طرح دوسرے مشاہیر شعرا کی اہم خصوصیات ان کی شخصیت کے مطالعہ ہی سے سمجھ میں آتی ہیں۔ غالبؔ کے سلسلے میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ ان کا ماحول کیا تھا؟ اور ان کی شخصیت کیسی تھی؟ اور ماحول اور شخصیت کے امتزاج سے ان کی شاعرانہ شخصیت فن کے آئینے میں کس طرح ابھرتی ہے۔

اغلاق و ابہام

ایک عام اعتراض غالبؔ کے کلام پر کیا جاتا رہا ہے کہ اس میں اغلاق ہے۔ خود غالبؔ نے اپنے اشعار کے اغلاق و ابہام کا اعتراف کیا ہے۔ دقت پسندی غالبؔ کی طبیعت کا

خاصہ ہے ؎

تنگیِ دل کا گلہ کیا؟ یہ وہ کافر دل ہے　　کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح　　میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل
ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے　　دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

غرضکہ غالب زندگی اور فن میں دشواری کو آسانی پر ترجیح دیتے تھے۔ عظیم فن کار کی پہچان یہی ہے۔ مشکل پسندی اور باریک بینی کے ذریعے غالب منازلِ فن کی چوٹیاں سر کرتے ہیں، اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کو تامل و تفکر کرنا پڑتا ہے تب کہیں گوہرِ معنی تک اُس کی رسائی ہوتی ہے۔ اپنے اسلوب کے متعلق خود کہتے ہیں کہ اسد اور شیر اور بُت اور خدا اور وفا اور جفا اور اسی قسم کی دوسری رعایات کو دونِ مرتبہ سمجھتے ہیں۔ بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ شعر کہنے کا آسان طریقہ غالب کو پسند نہ تھا۔ لفظی رعایات اور پیش پا افتادہ مضامین کا استعمال کمتر درجے کے شعرا کا شعار رہا ہے۔ غالب نے ہمیشہ یہ چاہا کہ دشواری سے گزر کر شعر کہا جائے۔ تعقید کو ایک شعری عیب تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن غالب نے اس عیب کو بھی خوبی کر دکھایا۔ حسنِ تعقید اور ایجازِ کلام کا ربط بڑا لطف دیتا ہے ؎

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے　　یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین　　کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور
دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے　　ہے ترے تیر کا پیکان، عزیز
ہم کو ستم عزیز، ستم گر کو ہم عزیز　　نا مہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "عربی میں تعقیدِ لفظی و معنوی دونوں معیوب ہیں۔ فارسی میں تعقیدِ معنوی عیب اور تعقیدِ لفظی جائز ہے بلکہ فصیح و ملیح"۔[1] یہاں یہ امر غور طلب ہے کہ تعقید کا عیب جب غالب کے کلام میں واقع ہو تو وہ حسن کیوں بن جاتا ہے۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ دوسرے شعرا جب تعقید میں مبتلا ہوتے ہیں تو قاری کو احساس ہوتا ہے کہ یہ شاعر کے عجزِ کلام کی دلیل ہے۔ لیکن غالب کے ساتھ ایسا نہیں۔ ان کے شعر میں خیال کی ایک پیچیدگی ہوتی ہے

۱۔ ایک جگہ لکھتے ہیں "میرا فارسی دیوان جو دیکھے گا، وہ جانے گا کہ جملے کے جملے مقدر چھوڑ جاتا ہوں۔" اردو دیوان میں بھی یہی حال ہے۔

ایسے خیال کا اظہار جب الفاظ میں کیا جاتا ہے تو معنوی پیچیدگی لفظی تعقید سے بدل جاتی ہے گویا تعقید ایک آئینہ ہے جس میں ہم غالب کے طرزِ فکر کو دیکھ سکتے ہیں۔ آسانی کی راہ سے گزرنا غالب کا طریقہ نہیں۔ اسی لیے ہم ان سے یہ امید نہیں رکھتے کہ سامنے کا مضمون صفائی اور روانی کے ساتھ بیان کر دیں گے۔ یہاں حالؔی کا ایک شعر یاد آتا ہے، جس میں تعقید کا عیب ناپسندیدہ صورت میں ابھرتا ہے ؎

بیگانگی میں حالؔی یہ رنگِ آشنائی　　سن سن کے سر دھنیں گے سب اہلِ حال تیرا

یہاں "تیرا" کا تعلق "رنگِ آشنائی" سے ہونا چاہیے تھا، مگر تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ حال حالؔی کا سر دھنیں گے۔

دقّت پسندی کے اسباب متعدد ہو سکتے ہیں۔ بعض اوقات کسی شاعر کی نفسیات ہی ایسی ہوتی ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار آسانی کے ساتھ نہیں کر سکتا۔ ایسی صورت میں یہی غنیمت معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی نہ کسی طرح اظہارِ خیال تو کیا۔ آسانی کے ساتھ نہ سہی دشواری ہی کے ساتھ سہی۔ غالب کا شمار اسی قبیل کے شعرا میں ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شاعر کے خیالات روایتی نہیں ہوتے۔ ان میں جدّت اور ندرت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اس دور کا مذاقِ عامہ روایتی اسالیبِ بیان کو پسند کرتا ہے۔ چنانچہ ایسے شاعر پر اغلاق اور دقّت پسندی کے الزامات لگائے جاتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ غالب کے سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ اپنے زمانے کے شاعروں سے مختلف ہے اور یہ پھبتی ان پر کسی گئی تھی کہ ان کا کہا یہ خود سمجھیں یا خدا سمجھے اور غالب کو اعتراف کرنا پڑا تھا ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سن سن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

کبھی اغلاق کی بنیاد ایجازِ کلام پر ہوتی ہے۔ دو جملوں کے درمیان وہ کچھ نہ کچھ چھوڑ دیتے ہیں تاکہ قاری اسے خود پُر کر سکے۔ ظاہر ہے کہ قارئین کے ذوق کی تربیت جس قسم کے شعرا کے کلام سے ہوتی رہی ہے۔ وہ اس جھنجھٹ میں پڑنے کے لیے تیار نہیں کہ خیال کا کونسا حصّہ فی بطنِ شاعر ہے۔ جس تک پہنچنا ان کا اپنا کام ہے۔ ان کے علاوہ بھی ایک سبب

ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ شاعر قاری کو چکر دینا چاہے۔ یہ بات چنداں مستحسن نہیں۔ مگر گمان ہوتا ہے کہ کبھی کبھی غالبؔ ایسا بھی کر گزرتے تھے۔ بڑے شاعر کے ساز میں ہر طرح کا نغمہ ہوتا ہے۔

لفظی اور معنوی دِقّت پسندی

غالبؔ کا وہ کلام جو طرزِ بیدلؔ میں ہے عام طور پر مغلق ہے۔ لیکن یہ اِغلاق معنوی نہیں لفظی ہے اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بیدلؔ کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ نکتے سے نکتہ نکالتے تھے اور بات سے بات پیدا کرتے تھے۔ بیدلؔ کے کلام میں ایک پیچیدگی ہے جسے غالبؔ نے اپنے ابتدائی کلام میں نہ صرف قبول کیا بلکہ نمونہ قرار دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ غالبؔ کا ابتدائی کلام ایک گورکھ دھندا بن کر رہ گیا۔ جس قسم کی غزلیں نسخہ حمیدیہ میں پائی جاتی ہیں اور جن کو غالبؔ اور ان کے احباب نے مروّجہ دیوان سے خارج کر دیا تھا۔ ان میں اسی قسم کا اِغلاق ہے۔ خیالات کچھ ایسے مشکل نہیں۔ اس لیے کہ اپنی زندگی کے اُس دَور تک غالبؔ ان تمام تجربات سے نہیں گزرے تھے۔ جنھوں نے ان کی شاعری میں گہرائی اور وسعت پیدا کی۔ تجربات سے گزرنے کے بعد بھی کلامِ غالبؔ کے بیشتر حصّے میں ایک قسم کا اغلاق و ابہام موجود رہتا ہے لیکن اس کی بنیاد مختلف ہے۔ یہ معنوی اغلاق ہے۔ جب خیالات ہی پیچیدہ ہوں تو اظہارِ بیان میں صفائی کہاں سے آئے۔ اسی لیے انھوں نے کہا کہ ؎

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح   میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

عظیم خیالات کو دو مصرعوں میں ظاہر کرنا۔ دریا کو کوزے میں بند کرنا ہے۔ چنانچہ ابہام پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایجازِ کلام اور حسنِ تعقید کا سہارا لیتے ہیں کہیں نزاکتِ تخیّل درمیان میں آجاتی ہے۔ لطیف و نازک خیالات کو قلمبند کرنا بھی آسان نہیں۔ کہتے ہیں ؎

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت   میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں
زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستمگر ورنہ   کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

اس نزاکتِ تخیّل سے شعراء کی آنے والی نسلیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ شاہ عبدالعلیم آسیؔ سکندر پوری نے کہا ؎

آپ اُٹھ جاؤں گا تم مجھ کو اٹھاتے کیوں ہو　　میں نہ تابوتِ عدو ہوں نہ رہ ورسمِ وفا

مومن کی نزاکتِ تخیل اور طرح کی ہے یعنی پہاڑ کھودا اور چوہا نکلے۔ علاوہ ازیں مومن کے ہاں تصنّع زیادہ ہے مگر اس کے یہ معنی بھی نہیں۔ مومن کی نزاکتِ تخیل یکسر بے مغز ہے۔

وسعتِ خیال

غالب کے طرزِ فکر میں ایک جگہ وسعت ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں کہ تیر کا زخم تلوار کے زخم سے فروتر ہے۔ اس لیے کہ تلوار کے زخم میں کشادگی ہے اور تیر کے زخم میں تنگی ہے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں　　وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

زخم نے داد نہ دی تنگیٔ دل کی یارب!　　تیر بھی سینۂ بسمل سے پر افشاں نکلا

یار نے تشنگیٔ شوق کے مضموں چاہے　　ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

شق ہو گیا ہے سینہ خوشا لذّتِ فراق　　تکلیفِ پردہ داریٔ زخمِ جگر گئی

یہ وسعت و کشادگی غالب کی ایک ایسی خصوصیت ہے۔ جو شاعری سے قطع نظر زندگی معتقدات اور خیالات میں ملتی ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں ے

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا　　یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اور وسیع المشربی کے متعلق اس سے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔

نفسیاتی کیفیت

غالب کے اسلوب کی ایک خصوصیت یہ ہے۔ وہ اپنی ذہنی کیفیات کو نظم کرتے ہیں۔ اس معاملے میں کوئی ان کا ہمسر اردو شاعری میں نظر نہیں آتا۔ یہاں غالب کا مقابلہ داغ سے کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ داغ معاملات کی شاعری کرتے ہیں اور غالب کیفیات کی۔ خود اپنی ذہنی کیفیت کو انھوں نے یوں بیان کیا ہے ے

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ　　ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیّت کا　　کہ سانپ فرش ہے اور سانپ کا ہے من تکیہ

نفسیات کی رُو سے آئینے اور سانپ کی علامتوں پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے۔ سانپ تو خیر انسان کا ازلی دشمن ہے اور سانپ کا تصور انتہائی خوف انگیز ہوتا ہے۔ لیکن آئینہ حساس شخصیتوں کے لیے کچھ کم خوف انگیز نہیں، جب کوئی حسّاس شخص آئینے میں اپنے آپ کو دیکھتا ہے تو وہ سراسیمہ ہو کر چیخنے لگتا ہے۔ اور بھاگ جانا چاہتا ہے۔ اوّل تو آئینے میں جیتے جاگتے انسان کے سامنے اس کی بے جان تصویر ہوتی ہے۔ گویا زندگی موت کو تک رہی ہے، دوسرے خلوتِ تنہائی میں اپنے مقابل ایک انسان کو دیکھنا اپنی جگہ تشویش اور خوف کا باعث ہوتا ہے۔ پھر غالبؔ پر اس دور کے لوگوں کے ہاتھوں جو کچھ بیتی اس کی بنا پر وہ انسان کی صورت سے خائف تھے۔ خواہ وہ انسان خود انھیں کا ہم شکل کیوں نہ ہو۔ یہ خیال جب ذہن پر منعکس ہوا تو جنوں کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ کُتّے کے کاٹے کا بھی یہی اثر ہوتا ہے۔ غرض کہ یہ نفسیاتی کیفیت ایک قسم کے جنون کی طرف اشارہ کرتی ہے، اور یہ جنون ایسے شخص کو ہو سکتا ہے۔ جو انتہائی حسّاس ہو۔ نرگسیت میں مبتلا ہو اور خود ترحمی کا شکار ہو۔ یعنی یہ محسوس کرے کہ دنیا نے اس کی قدر نہ پہچانی اور زمانہ اس کا دشمن ہے۔ یہ خیال کسی نہ کسی صورت میں غالبؔ کے کلام میں راہ پائے بغیر نہیں رہتا۔ نفسیاتی کیفیات ہی حسّی تشبیہات کی بنیاد ہیں۔ شدّتِ احساس کبھی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ جیسے اس شعر میں ؂

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے — آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

اور شاعر مدافعتی انداز میں اپنی ذات پر یا تقدیر پر یا پروردگارِ عالم پر طنز کرنے لگتا ہے غالبؔ میں مقاومتِ غم کا زبردست حوصلہ تھا۔ کوئی دوسرا ہوتا تو پاگل ہو گیا ہوتا۔ لیکن غالبؔ بڑی سے بڑی تکلیف ہنس کر برداشت کر لیتے تھے۔ بہت ہوا تو طنز کے ذریعے دل کا غبار نکال ڈالا۔ ماہرینِ نفسیات کا خیال ہے کہ شاعری بجائے خود تنقیۂ جذبات کا نام ہے۔ عین ممکن ہے کہ شاعری غالبؔ کے لیے ذہنی توازن برقرار رکھنے کا ذریعہ بنی ہو۔

کبھی اپنی خود پرستی کا بُت توڑنے کا ارادہ ظاہر کرتے ہیں۔ نفس جب تک حائل رہے گا معرفت حاصل نہ ہو سکے گی، یا نفسیاتی اصطلاح میں جب تک دبی ہوئی خواہشیں ستائیں گی شعور کی منزل تک پہنچنا ممکن نہ ہو سکے گا ؂

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

غالبؔ اپنی ذات کی محبت میں مریضانہ حد تک مبتلا بھی ہیں اور اپنی مریضانہ کیفیت کا احساس بھی رکھتے معلوم ہوتے ہیں۔ بار بار اپنے پہ رحم کھاتے ہیں، پھر خود ترحمی پہ جھنجلا اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ؏

ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

اپنی ذات کی محبّت میں وہ اس بُری طرح مبتلا ہیں کہ ان کا تصورِ حسن بڑی حد تک ان کے اس تصوّر کا منّت کش ہے، جو انھوں نے اپنی شکل و شباہت کے متعلق قائم کیا تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ جب میں جیتا تھا تو میرا قد انگشت نما تھا اور رنگ چمپئی تھا۔ ان دونوں اوصاف کو ہم غالبؔ کے محبوب میں دیکھتے ہیں۔ اردو غزل کا روایتی معشوق بھی دراز قامت ہوتا ہے۔ یہ خصوصیت اُردو غزل نے وراثت میں ایرانی غزل سے پائی ہے۔ ورنہ ہندوستانی عورت بوٹا سا قد رکھتی ہے، سرو قامت نہیں ہوتی۔ لیکن جب غالبؔ اپنے معشوق کی دراز قامتی کا ذکر کرتے ہیں تو وہ روائتی لہجہ میں نہیں ہوتا ؎

سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے

گویا محبوب بھی سرو صنوبر کا ہم قد ہے ؎

ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

محبوب کی بلندئ قامت سے لعل و گہر کو بھی اوج مل گیا ؎

بیادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم ہر ایک داغِ جگر آفتابِ محشر ہو

بلندئ قامت کا یہ تصوّر کہ آگ کے شعلے کی طرح اس کا قد بلند ہو۔ ایک نہایت ہی لطیف اور خوبصورت تصوّر ہے، اور جہاں تک چمپئی رنگ کا تعلق ہے غالبؔ کے اشعار میں آگ پھول اور خون کی تشبیہیں معمولاً استعمال ہوئی ہیں۔

اپنی محبّت کے ساتھ ہم جنسی کا تصوّر بھی وابستہ ہے ؎

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ مشکیں نہ دبا یہ زمرّد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

بے وفا معشوق کی محبت میں بھی ایک گہرا نفسیاتی نکتہ پنہاں ہے۔ جس کا تعلق ہم جنسی

کے جذبے سے ہے۔ بے وفا معشوق میں ہزاروں عاشقوں کے پسینے کی بُو آتی ہے ؎

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کو مے کہ آج
آرزوئے بوسۂ لب ہائے میگوں ہے مجھے

معنویّت

غالب کے اغلاق و ابہام کا ایک سبب یہ تھا کہ انھوں نے زبان کو ایک انوکھے طریقے سے برتا۔ ندرتِ خیال کے لیے ضروری ہے کہ زبان بھی نئی استعمال کی جائے۔ اوپر مثالیں دی جا چکی ہیں کہ کس طرح غالب نے نئی نئی ترکیبیں وضع کیں۔ نئی ترکیبوں کے ذریعے وہ ان خیالات کا ابلاغ کر سکے، جو اردو شاعری میں اُس سے پہلے موجود نہ تھے۔ علاوہ ازیں انھوں نے جانے پہچانے الفاظ کو بھی نئی معنویت دی۔ یعنی عام الفاظ کو اس معنی میں استعمال کرنے سے گریز کرنا چاہا جس معنی میں دوسرے شعرا انھیں استعمال کرتے چلے آئے تھے۔ اس طرح انھوں نے زبان کے ساتھ بظاہر ایک جبر کیا اور الفاظ سے اپنی خواہش کے مطابق نئے معنی اخذ کیے۔ یہی وجہ ہے کہ قارئین غالب کی زبان کو سمجھنے میں دشواری محسوس کرتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ہوا کہ غالب نے ایسے الفاظ غزل کی زبان میں داخل کیے جو پہلے استعمال نہ کیے جاتے تھے۔ ایسی زبان کو لوگوں نے یا تو مہمل کہا۔ یا غیر شاعرانہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ پرانے الفاظ کو نئے معنی دینا اور نئے الفاظ کو غزل کی زبان میں شامل کرنا اردو شاعری پر غالب کا ایک بہت بڑا احسان ہے۔ ان کے علاوہ غالب نے توالیٔ اضافات سے کام لیا ہے۔ توالی اضافات سے مراد یہ ہے کہ اضافتوں کے ذریعے خیالات کو مربوط کیا جائے۔ اضافتوں کی بھرمار زبان کے شعرا کی نظر میں ایک عیب ہے۔ لیکن خیال آفرینی کے لیے اس کے سوا چارہ کار نہیں بلکہ سچ پوچھیے تو توالیٔ اضافات سے کفایت شعاری پیدا ہوتی ہے اور تھوڑے سے الفاظ میں بہت سے خیالات کا اظہار ممکن ہو جاتا ہے۔ توالیٔ اضافات سے غالب کو ایک اور بھی فائدہ ہوا۔ بندش میں چستی آگئی۔ دوسرے شعرا جن کے پاس کہنے کو کچھ نہیں ہوتا ہے لفظوں کے ساتھ کھیلتے ہیں اور الفاظ کی زیادہ سے زیادہ تعداد میں کم سے کم مطالب بیان کرنے کو اپنی فتح تصور کرتے ہیں۔ ایسے شعرا کے کلام میں حشو و زوائد کی فراوانی ہوتی ہے

غالب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ان کا کلام حشو و زوائد سے پاک ہے۔ ان کے لیے تو سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ دو مصرعوں کے شعر میں پورا خیال ادا کیونکر ہو۔ ان کے ایجازِ کلام کا مقصد یہ ہے کہ خیال کے غیر ضروری حصے یا وہ ٹکڑے، جنھیں قاری کا ذہن خود پُر کر سکتا ہے چھوڑتے چلے جائیں، اور اس طرح چند الفاظ میں پورا خیال قاری تک پہنچا دیں۔ توالی اضافات کا مقصد بھی یہی ہے۔ اس طرح وہ اضافتوں کی مدد سے بڑی بات کو تھوڑے الفاظ میں ادا کر دیتے ہیں۔

ارتقائے زبان کی تاریخ جاننے والے یہ بات اچھی طرح جانتے ہیں کہ شروع میں فاعل، فعل، مفعول، اسمِ صفت وغیرہ الگ الگ استعمال نہیں کیے جاتے تھے۔ قدیم زمانے کے انسان پوری بات، ایک لمبے سے لفظ کے ذریعہ ادا کر دیتے تھے اور ایک ہی لفظ سے سارا مطلب واضح ہو جاتا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب زبان قواعد کی گرفت سے آزاد تھی، اور ادائے مطالب کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ جس طرح ہو چند آوازیں نکال کر جو پیغام دینا مقصود ہو وہ دے دیا جائے۔ توالیٔ اضافات کا مقصد بھی یہی ہے کہ پورے خیال کو ایک ساتھ ادا کر دیا جائے۔ غالب نے زبان کے ساتھ ایک اور عمل بھی کیا ہے۔ بعض اوقات انھوں نے دو خیالوں کو عطف و اضافت کے بغیر ملایا ہے۔ یوں تو غالب سے پہلے بھی زبان کے ایسے سانچے موجود تھے۔ غالب کی شاعری نے آنے والی نسلوں کے لیے اس قسم کے اختراعات کا دروازہ کھول دیا مثال کے طور پر ؏

مر گیا غالبِ آشفتہ نوا کہتے ہیں

یہاں آشفتہ نوا کی ترکیب اسی قسم کی ایک ترکیب ہے۔ اضافتوں کے ذریعے خیالات کو باہم جوڑنا ایک ذہنی عمل کی غمازی کرتا ہے۔ جہاں تک تسلسلِ خیال قائم ہے۔ وہاں تک توالیٔ اضافات کی مدد سے خیال کی ایک لہر چلی پڑی اور جہاں وہ خیال ٹوٹا وہیں اضافات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ مثال کے طور پر ؎

کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ! برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

یہاں مصرعِ اولیٰ میں کمالِ گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید ایک لہر ہے یا ایک سلسلۂ خیال ہے۔ جو "کمال" سے شروع ہو کر "دید" پر ختم ہوتا ہے۔ یا اسی غزل کا ایک دوسرا شعر ؎

بہ نیمِ غمزہ ادا کر، حقِ ودیعتِ ناز　　نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ

جس میں نیامِ پردۂ زخمِ جگر اپنی جگہ خیال کا ایک ٹکڑا ہے۔ جہاں اضافات کا سلسلہ ختم ہوا۔ وہاں گویا خیال مکمل ہو گیا۔

غالب کے قارئین کی شکایت نادرست نہیں۔ غالب نے جس زبان کو استعمال کیا وہ ایک نئی زبان تھی اور اس کو سمجھنے میں اگر قارئین کو دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ تو یہ کوئی ایسی عجیب بات نہیں۔ غالب کی کوشش یہ تھی کہ کوئی لفظ غیر ضروری طور پر استعمال نہ کیا جائے اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلامِ غالب ایک گنجینۂ معانی بن گیا۔ عظیم شاعر وہ ہے جس کے کلام میں معانی کی تہیں موجود ہوں۔ ایک ہی شعر کو مختلف موقعوں پر پڑھا جائے تو پورا اترے۔ ایک ہی شعر تصوّف فلسفہ۔ معاملاتِ عشق کاروبارِ زندگی ہر جگہ حاوی ہو۔ ہم نے جابجا غالب کے بعض اشعار اس طرح نقل کیے ہیں کہ ایک ہی شعر کو کبھی سیاست کبھی تصوّف کبھی فلسفہ، کبھی عشق، کبھی نجی حالات، کبھی عمومی کاروبارِ زندگی کی ذیل میں مثال کے طور پر پیش کیا ہے یہ غالب کی معنویت ہی کا نتیجہ ہے کہ ان کے کلام کی متعدد شرحیں کی جا چکی ہیں اور امید کی جاسکتی ہے کہ ہر نئی نسل اپنے حالات کی روشنی میں کلامِ غالب کی تشریح و تفسیر کرے گی اور ہر مرتبہ نئے معانی کا سراغ لگائے گی۔

فنی انضباط اور زبان کا برمحل استعمال

شاعری کے متعلق دو نظریے عام طور پر پائے جاتے ہیں۔ ناقدوں اور قارئین کا ایک طبقہ یہ خیال کرتا چلا آیا ہے کہ شاعری ایک وہبی چیز ہے۔ اکتسابی نہیں۔ لہٰذا شاعر کے لیے فن کار ہونا ضروری نہیں۔ شاعر الہام یا وجدان کے بل بوتے پر شعر کہتا ہے۔ یہ زبان دانوں اور قواعد مرتب کرنے والوں کا کام ہے کہ وہ کسی شاعر کے کلام میں فن کارانہ خوبیاں تلاش کرتے پھریں۔ شاعر پر تو ایک جذب کا عالم طاری رہتا ہے اور شاعری کا مقصد

دنیا کو پیغام دینا ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ شاعری ایک فن ہے مشق و ریاضت سے اس فن کو ترقی ہوتی ہے۔ وجدان والہام محض ڈھونگ ہے۔ اصل چیز شاعر کی زبان پر قدرت ہے اور فنی نکات پر عبور ہے۔ چنانچہ جیسے جیسے شاعر کی مشق بڑھتی جاتی ہے۔ اس کا کلام خوب سے خوب تر ہوتا جاتا ہے۔ اصل میں یہ دونوں نظریے ناقص ہیں۔ شاعری ایک پیغام بھی ہے اور ایک فن بھی ہے۔ بڑا خیال نہ ہو۔ تو محض فن کاری عظیم شاعری پیدا نہیں کر سکتی اور اسی طرح فن سے آگاہی نہ ہو تو شعر نقائص سے معمور اور تاثر سے عاری ہو جاتا ہے۔ بڑا شاعر وہ ہے جو ان دونوں نظریات کو ہم آہنگ کر سکے۔ لیکن وہ اپنے فن کو اس طرح برتے کہ شاعری پر کاریگری کا گمان تک نہ ہو۔ میر اور غالب جیسے عظیم شعرا کے کلام کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ انھیں بہترین خیالات اور بہترین طریقۂ اظہار پر کامل دسترس حاصل تھی۔ غالب نے جس خوبی کے ساتھ اپنے ہر لفظ کو پُر معنی بنایا ہے اور بیان کے جو اسالیب اختیار کیے ہیں۔ ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب کو شعر کے صناعانہ پہلوؤں پر کامل عبور تھا۔ انھیں اگر فخر تھا تو اپنے طرز بیان پر اس لیے کہتے ہیں کہ ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے　　　کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور

اس سے یہ مراد نہیں کہ آتش کی طرح غالب بھی شاعری کو محض "مرصع سازی" جانتے تھے اگر ایسا ہوتا تو ان کی شاعری میں خیال کی بلندی اور فکر کی گہرائی کی جگہ محض صنائع و بدائع ہی پر زور ہوتا۔ لیکن یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غالب ایک باشعور فن کار تھے اور فنی خوبیوں کو شعر کہتے وقت نظر سے اوجھل نہ ہونے دیتے تھے۔ کالرج نے شاعری کی تعریف یوں کی ہے کہ "شاعری بیک وقت جذبہ بھی ہے اور انضباط بھی" اور ہمارے زمانے کے نقاد و شاعر ٹی۔ ایس ایلیٹ نے کہا ہے کہ "شاعرانہ الہام کے لیے تنظیم بھی ضروری ہے" مقصد یہ ہے کہ جذبے کا سرچشمہ خواہ الہام ہو، خواہ لاشعور لیکن اس قطرے کو گہر بننے کے لیے فن کارانہ صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس ضرورت سے غالب پوری طرح آگاہ تھے۔ اپنے شاگردوں کو فنِ شعر کے غوامض سمجھاتے ہیں اور بار بار تاکید کرتے ہیں کہ یوں کرو اور اس سے بچو۔ مرزا تفتہ نے ایک غزل میں پروانہ اور دیوانہ کے ساتھ مردانہ ترکانہ وغیرہ قوافی استعمال کیے تو غالب نے ان کو تنبیہ کی کہ ایطا ایسا شاعرانہ

عیب ہے، جس سے گریز کرنا لازم ہے۔ صرف اصلی قوافی ہی استعمال کرنے چاہئیں۔ حروفِ علت میں الف کا گرنا انھیں کھٹکتا تھا۔ صنائع لفظی کی بہتات بھی ان کو پسند نہ تھی۔ البتہ صنائع کو وہاں پسند کرتے تھے۔ جہاں وہ معنوی خوبیوں سے مطابقت کرے۔ فارسی کلام میں ان ترکیبوں سے پرہیز کیا ہے، جو فارسی گویانِ ہند سے مخصوص ہیں اور اہلِ ایران کے شیوے کے مطابق نہیں۔ اردو میں غالب کی کوشش یہ تھی کہ طرزِ عام سے ہٹ کر شعر کہا جائے یعنی اُردو میں وہ اجتہاد کے قائل تھے۔ الفاظ کا انتخاب اور تشبیہہ و استعارہ کا استعمال محض آرائشِ کلام کی خاطر نہ کرتے تھے۔ زبان کا آرائشی پہلو شعرائے لکھنؤ میں زیادہ نمایاں ہے۔ میر و غالب نے ہمیشہ اس سے بچنے کی کوشش کی ہے۔ داغ کی طرح محض روزمرہ کو نظم کرنا غالب کا شیوہ نہ تھا۔ ان کے خیالات بلند تھے۔ اسی لیے طرزِ بیان اکثر جگہ پُرشکوہ ہوگیا ہے۔ اپنے ایک شاگرد کے ایک قصیدے کی داد یوں دیتے ہیں "زبان پاکیزہ، مضامین اچھوتے، معانی نازک، مطالب کا بیان دلنشیں" اپنے دور کے ایک شاعر کے دیوان پر اظہارِ رائے کرتے ہوئے یوں تعریف کرتے ہیں "الفاظ متین، معانی بلند، مضمون عمدہ، بندش دلپسند" اگر ہم نظریہ قائم کریں کہ غالب کے نزدیک شاعری میں کون سی خصوصیات ہونی چاہئیں۔ تو یہ کہیں گے کہ خیال کی بلندی اور بیان کی عمدگی کے بغیر اچھی شاعری ہونی ممکن نہیں۔

بندش کی چستی ایک جمالیاتی قدر ہے

بندش کی چستی پر غالب نے بہت زور دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام غیر ضروری صنائع سے پاک اور معنویت سے لبریز ہے۔ صنعتیں جہاں آئی ہیں با معنی بن کر آئی ہیں۔ یعنی انھوں نے صنعتوں کے استعمال سے اپنے معانی کے ابلاغ میں مدد حاصل کی ہے۔ محض آرائش کے طور پر نہیں جیسا کہ عام شعرا کا طریقہ ہے۔ اوّل اوّل نکتہ آفرینی پر توجہ دیتے تھے لیکن جب ایک طرزِ خاص ان سے منسوب ہوگیا۔ تو نکتہ آفرینی سے بھی گریز کرنے لگے۔ اپنے ایک شاگرد کے مطلع پر یوں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہیں۔ "اس مطلع میں خیال ہے

دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ برآوردن' یعنی لطف زیادہ نہیں ہے۔" دقّت پسندی سے مراد باریک بینی ہے یعنی طرزِ بیدل کی شاعری جس میں بڑی حد تک شعر کی خوبی کا انحصار نزاکتِ تخییل پر ہو، آخر میں غالب کو پسند نہ آتی تھی۔ اگرچہ مشقِ سخن کی ابتدا میں انھوں نے یہ طرز مستحسن خیال کیا تھا۔ شعر کی تعریف اس طرح کی ہے" شعر ایک معشوقہ اپری پیکر ہے۔ تقطیعِ شعر اس کا لباس اور مضامین اُس کا زیور ہیں۔" ایک جگہ کہتے ہیں" شاعری معنی آفرینی ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں ہے۔" غرض کہ غالب نے شعر کے معنوی و صوری حسن پر یکساں زور دیا ہے اور شعر کا صوری حسن جسے اندازِ بیان کہنا چاہیے غالب کی شاعری کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اس کی بنا پر ان کے شعر کو دوسرے شعرا کے کلام سے الگ پہچانا جا سکتا ہے۔ بندش کی چستی غالب کی شاعری کے تینوں ادوار میں قائم رہتی ہے۔ پہلے دَور کی شاعری میں اگرچہ خیالات کہیں کہیں ضرورت سے زیادہ نازک اور پیچیدہ ہیں۔ لیکن بیان کی خوبی کو شاعر نے کہیں ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ دوسرے دَور کی شاعری میں غالب کی گرفت فن پر اور بھی مضبوط ہو گئی۔ اُدھر شعور کی پختگی اور تجربات کی رنگارنگی نے خیالات پر اثر ڈالا اور نزاکتِ خیال کے ساتھ بلندیٔ فکر پیوستہ ہو گئی۔ ایسی صورت میں بندش کی چستی نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ اس دَور کے بہت سے اشعار علمی حلقوں میں ضرب المثل بن کر رہ گئے ہیں۔ تیسرے دَور کی شاعری میں غالب سہل نگاری کی طرف متوجہ نظر آتے ہیں۔ اردو مکاتیب میں کئی مقامات پر انھوں نے سہلِ ممتنع کو بہترین شاعری قرار دیا اور دعویٰ کیا ہے کہ ان کا کلام سہلِ ممتنع کی مثال ہے۔ اس دور کی شاعری میں زبان کی سلاست اور صفائی، اور اضافتوں کی بھرمار سے گریز، اہم خصوصیات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس زمانے کی غزلیں نسبتاً عام فہم ہیں۔ یہاں تک کہ بعض غزلوں کو ہمارے زمانے کے مغنّی محفلوں میں گاتے ہیں کہ تہ در تہ معانی میں سے سطحی معنی کی تہ تک اُن کی رسائی ہو جاتی ہے اور فلم سازوں نے انھیں فلموں میں شامل کر لیا ہے۔ لیکن قبولِ عام کی یہ سند یہ ثابت نہیں کر سکتی کہ شاعرانہ خوبیوں کے لحاظ سے تیسرے دَور کا کلام غالب کی تمام اعلیٰ ترین شاعرانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ اس کلام میں نہ پہلے کے سے بلند خیالات ملتے ہیں۔ نہ وہ پُر شکوہ لہجہ ہے۔ پھر بھی بندش کی چستی بدستور قائم ہے۔ یہاں مراد جن غزلوں سے ہے۔ اُن میں سے چند کی نشاندہی

کی جاتی ہے۔ اس طرزِ شاعری کو غالب نے "طرزِ تازہ" کہا ہے، اس لیے کہ ان کے واسطے نیا تھا۔

ع   دائم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں [1]

ع   ابنِ مریم ہوا کرے کوئی

ع   سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

ع   دردِ منت کشِ دوا نہ ہوا

ع   نکتہ چیں ہے غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے

ع   کوئی اُمید بر نہیں آتی

ع   بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے

ع   دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے

ع   دیا ہے دل اگر اس کو بشر ہے کیا کہیے

ع   نیر سے توسن کو صبا باندھتے ہیں

ع   لطفِ نظارۂ قاتل دمِ بسمل آئے

ع   غیر لیں محفل میں بوسے جام کے

ع   پھر اس انداز سے بہار آئی

ع   کوئی دن گر زندگانی اور ہے

۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۷ء کے درمیانی زمانے میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہوگا اور زبان کی تسہیل کو اصلِ اصول بنا کر ایک فہرست بنائی جا سکتی ہے مگر دوسری کوئی شہادت نہ ہونے کی بنا پر ایسی فہرست قیاسی ہو گی۔ بعض اوقات ایسی شہادتیں مل بھی جاتی ہیں۔ چند غزلیں خطوط میں خود غالب نے نقل کی ہیں۔ کچھ غزلیں اُس زمانے کے اخبارات و رسائل میں شائع ہوئیں۔

غالب اور دلّی کی ٹکسالی زبان

بندش کی چستی سے قطع نظر غالب کے تیسرے دَور کی شاعری بلحاظِ زبان ایک مثالی

---

[1] نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور کو لکھتے ہیں "جب بادشاہ دہلی نے مجھے نوکر رکھا .... تو میں نے ایک غزل طرزِ تازہ پر لکھی یعنی جولائی ۱۸۵۰ء سے سہلِ ممتنع کا رنگ اختیار کیا اور یہ اُس طرز کی پہلی غزل ہے۔

حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر روزمرہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ ابتدا میں غالب زبان کی شاعری کے قائل نہ تھے۔ اب بھی ہم جب رنگِ غالب کا ذکر کرتے ہیں۔ تو ہماری مراد اس خاص کیفیت سے ہوتی ہے، جو بلند خیالات کو پُرشکوہ لہجے میں تمام فنی لوازم کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بلیغ انداز سے اظہار کرنے کا نام ہے اور جب ہم داغ کی شاعری کا تذکرہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ واہ کیا معاملہ بندی ہے اور کیا روزمرہ ہے۔ لیکن آخر میں غالب کی اردو غزلوں میں بھی روزمرہ کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ قلعے سے غالب کا تعلق پیدا ہوا تو قلعے کی زبان سے بھی انھیں متاثر ہونا پڑا۔ یہ زبان جو اردوئے معلیٰ کہلاتی تھی۔ اردو زبان کی مثالی صورت تھی اور محاورے کے اعتبار سے سند کا درجہ رکھتی تھی۔ غالب نے اگرچہ کُلّی طور پر زبان کی شاعری کسی دور میں بھی نہیں کی۔ لیکن ۱۸۵۰ء کے بعد ان کی شاعری میں زبان کے ایسے پہلو نظر آتے ہیں، جو دلی والوں سے مخصوص ہیں۔ بعض ناقدوں کا خیال ہے کہ قلعے کے تعلق سے علاوہ غالب نے اس دور میں میر کے لہجے کا اثر بھی قبول کیا۔ زبان کی شاعری اس طرح دو آتشہ ہو گئی۔ اوّل تو قلعۂ معلیٰ کا محاورہ پھر میر کے لہجے کا اثر جب خود غالب کے رنگِ سخن میں گھل مل جائیں تو نشتریت پیدا ہو جانا کوئی حیرت انگیز بات نہیں۔ مستزاد اس پر یہ ہوا کہ اکثر غزلوں کے لیے انھوں نے چھوٹی بحروں کا انتخاب کیا۔ ایسی بحریں میر کو بھی دل پسند تھیں۔ اسی لیے غالب کے آخری دور کی اردو شاعری رنگِ میر سے قریب ہے اور اس پر دلی کی زبان اور محاورے کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ تاہم غالب کی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ وہی بندش کی خوبی۔ وہی ایجازِ کلام اور وہی خیال آفرینی جس میں تجربے سے چاشنی پیدا ہو گئی ہے۔ لیکن ابوالکلام آزاد نے عزیز لکھنوی کے دیوان "گلکدہ" پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے ضمناً غالب کی شاعری پر جو تبصرہ کیا ہے۔ وہ مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی یہ کہ غالب کا بہترین کلام ان کے دورِ دوم کا کلام ہے۔ جب توالی اضافات کا استعمال مناسب طور پر کیا گیا ہے۔ اوّل دور کی شاعری بڑی حد تک فارسی زدہ ہے۔ اضافتوں کی یہ کیفیت ہے کہ پورے شعر میں اضافتیں ہی اضافتیں ہیں۔ نام کے لیے کوئی ایک آدھ لفظ بغیر اجازت کے آ گیا ہے۔ وہ بھی بصیغۂ فعل یا بطور ردیف و قافیہ۔ اضافتوں کی زیادتی سے معنوی اشکال پیدا ہونا لازم نہیں۔ اضافتیں لگاتے چلے جائیے۔ اگر خیال میں گہرائی

نہیں ہے تو معنی تک پہنچنا چنداں دشوار نہیں مشکل وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں موشگافی کی کوشش کرتے ہیں اور خیال پوری طرح ادا نہیں ہوتا۔ غالب کا صحیح رنگ جو درمیانی دورِ شاعری میں پیدا ہوا وہ ہے جب اضافتیں معنوی ضرورت پورا کرنے کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ یعنی جب اضافتوں کا استعمال انتہائی فن کارانہ ہے، اور بلاغت کے تقاضے پورا کرتا ہے۔ اسی طرح تیسرے دور کی شاعری، گو سہلِ ممتنع کی اچھی مثال ہے، خیال آفرینی کا وہ جوہر اپنے اندر نہیں رکھتی جس کی توقع ہم کلامِ غالب سے رکھتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ غالب جیسا خیال آفریں شاعر اردو زبان کو نصیب ہی نہیں ہوا جس کی رسائی غالب کی شاعری کے آخری دور کے خیالات تک بھی ہوتی۔ زبان کے بامعنی استعمال اور بندش کی خوبی کے اعتبار سے تو ذوق و داغ بھی غالب سے ٹکر نہیں لے سکتے۔ ذوق اور داغ زبان کی شاعری کرتے ضرور ہیں۔ لیکن ان کی رسائی اعلیٰ خیالات نہیں محض الفاظ تک ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری میں الفاظ کی بھرمار ہے۔ محاورے کی سند ضرور ہاتھ آجاتی ہے لیکن کہنے کے قابل بات کم ہوتی ہے اور قافیے سے مضمون سوجھتا ہے۔ زبان کے اسالیب پوری طرح برتنا غالب ہی کا کام تھا۔ غالب کے کسی شعر کے کسی لفظ کو کسی دوسرے ہم معنی لفظ سے بدلا نہیں جا سکتا۔ یعنی ہر لفظ اپنی جگہ ناگزیر ہے اور محسوس ہوتا ہے مضمون اپنے لیے موزوں قافیہ خود تلاش کر لیتا ہے یعنی مضمون سے قافیہ سوجھتا ہے، اور معنی کے اعتبار سے جس لفظ کی ضرورت ہو۔ وہی منتخب کیا جاتا ہے۔ یہ محض روائتی اور ڈھیلی ڈھالی، بے مغز، کھوکھلی شاعری نہیں[۱]۔ جہاں ایک کی جگہ دوسرا لفظ، مثلاً آفت کی جگہ فتنہ کہہ دینے سے شعر پر

---

[۱] کسی ترتیب کے بغیر یادداشت سے چند اشعار قدیم و جدید شعرا کے لکھتا ہوں۔ اس میں کسی تعصب کو دخل نہیں۔ اس قسم کے اشعار بعض صورتوں میں خوبصورت مجموعۂ الفاظ کہلائے جا سکتے ہوں تو خیر، مگر ان سے اردو غزل کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ یہ زبان کا بے جا استعمال ہے۔

۱۔ دیا میرے جنازے کو جو کاندھا اُس پری رُو نے ـــــ گماں ہے تختۂ تابوت پہ تختِ سلیماں کا

۲۔ شفق پھولی ہے دیکھو شام کو شہرِ بدخشاں میں ـــــ لبِ رنگیں پہ مسّی مل کے اس نے پان کھایا ہے

۳۔ آتشِ شوق کیا بجھے، ناصح ـــــ تو پتنگے لگائے جاتا ہے

۴۔ دیکھنا رشک اُس کی محفل میں ـــــ ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

۵۔ اللہ رے حُسنِ دخترِ رز ـــــ زاہد کے حواس کھو رہی ہے

۶۔ بس تیغ کے منہ چڑھے نہ بجلی ـــــ کیوں جان سے ہاتھ دھو رہی ہے

۷۔ کیوں ترے لب پہ تبسم مجلسِ ماتم میں ہے ـــــ یہ ہنسی بھی کیا مرے پھولوں میں ہے آئی ہوئی

۸۔ ملا کر بھی وہ رکھتے ہیں تو میں پہچان لیتا ہوں ـــــ یہ ٹکڑا ہے جگر کا اور وہ ٹکڑا مرے دل کا

۹۔ ایک دو تین چار پانچ نہیں ـــــ سب خطائیں مری معاف کرو

اثر نہیں پڑتا۔ غالب کے ہاں ہر لفظ پُر معنی ہے۔ زبان کا صحیح استعمال یہی ہے کہ خیال کے ساتھ پوری طرح مطابقت کرتی ہو بلکہ ہم آہنگ ہو جائے۔ اس لحاظ سے اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ فارسی زدہ ہونے کے باوجود غالب کی زبان ہم عصر اور آنے والے شعرا کی زبان کی نسبت زیادہ صحیح و بلیغ ہے تو درست ہوگا۔ دِلّی کی ٹکسالی زبان غالب کے پیمانۂ غزل میں ڈھل کر اور بھی حسین ہو جاتی ہے۔ اِس دَور کی شاعری جاڑوں کی دھوپ ہے یعنی لذت بخش و پُرسرور۔ زندگی بھر کے تجربے شعر کا روپ بھر لیتے ہیں۔ جذبے کی ہیجانی کیفیت اور گفتار کی گرمی وقت اور فاصلے کی وجہ سے نرم پڑ جاتی ہیں۔ ورڈسورتھ کا نظریۂ شعر صادق آنے لگتا ہے ؎

پہلے آتی تھی (حالِ دل) پہ ہنسی ــــ اب کسی بات پر نہیں آتی
جانتا ہوں (ثوابِ طاعت و زہد) ــــ پر (طبیعت) اُدھر نہیں آتی
(ابنِ مریم) ہوا کرے کوئی ــــ میرے دکھ کی (دوا) کرے کوئی
بک رہا ہوں (جنوں) میں کیا کیا کچھ ــــ کچھ نہ سمجھے (خدا) کرے کوئی
کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے ــــ (کاش) یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

بقیہ

۱۰۔ چل کر، پھر کر، دیکھا بھالا، جانچا پرکھا، سمجھا بوجھا ــــ سب سے اعلیٰ، سب سے ادنیٰ، میں ہی میں ہوں تو ہی تو ہے
۱۱۔ علاج کی نہیں حاجت دل و جگر کے لیے ــــ بس اک نظر تری کافی ہے عمر بھر کے لیے
۱۲۔ خدنگِ ناز نے دونوں کو سرفراز کیا ــــ مزے ہیں دل کے لیے، چین ہیں جگر کے لیے
۱۳۔ چلتے ہوئے وہ دل کو نظر میں لیے ہوئے ــــ ہم رہ گئے نظر کو جگر میں لیے ہوئے
۱۴۔ آسان تم سمجھتے ہو خنجر کا باندھنا ــــ بیٹھے رہو گے درد کمر میں لیے ہوئے
۱۵۔ ادا سے آڑ میں خنجر کی منھ چھپائے ہوئے ــــ مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے
۱۶۔ آج وہ اوڑھ کے نکلے ہیں دوپٹہ آبی ــــ آسماں رنگ بدلتا نظر آتا ہے مجھے
۱۷۔ خونِ ناحق کا عوض آخر ملا کس حسن سے ــــ نام سے تعویذ کے باندھے گئے بازوئے دوست
۱۸۔ اے صبا، بس اور کیا دوں قبرِ مجنوں کے لیے ــــ خاک تھوڑی سی چڑھا دینا مری چھانی ہوئی
۱۹۔ یار کے ہاتھوں ہوا جو کچھ ہوا، اے تیغِ ناز ــــ تیری عریانی ہوئی یا میری قربانی ہوئی
۲۰۔ حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گزرے ہیں ــــ میرا مرنا، تری زلفوں کا پریشاں ہونا
۲۱۔ اللہ اللہ یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور ــــ کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا
۲۲۔ تعلی سے یہ نفرت ہے کہ بعدِ مرگ خاک اپنی ــــ اگر اٹھتی بھی ہے، جا بیٹھتی ہے خاکساروں میں
۲۳۔ کسی کے عشق میں دردِ جگر سے دل یہ کہتا ہے ــــ ادھر بھی آنکلنا، ہم بھی ہیں امیدواروں میں
۲۴۔ وصل کی شب بھی اداے رسمِ حرماں میں رہا ــــ صبح تک میں التماسِ شوقِ پنہاں میں رہا
۲۵۔ کام اپنا کر چکی بیماریِ عشقِ بتاں ــــ میں فریبِ نسخہ و تاثیرِ درماں میں رہا

اس طرح کی شاعری کس قدر غیر حقیقی اور مصنوعی ہے بلکہ سنجیدگی کے لہجے نے اسے کتنا مزاحیہ بنا دیا ہے۔ اس کا فیصلہ تو قارئین پر ہے، لیکن غالب کے آہنگ سے یہ قطعاً خارج ہے۔ نمبر ۲۰ و نمبر ۲۱ میں غالب کی ناکامیاب نقل اور نمبر ۲۴ و نمبر ۲۵ میں مومن کا رنگ اڑانے کی کوشش ہے۔ نمبر ۵ سے نمبر ۱۹ تک چٹخارے دار، بے معنی لفاظی کے سوا کچھ نہیں۔

میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے (جذبۂ دل) اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے
بوجھ وہ (سر) سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے (کام) وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

کلامِ غالبؔ کا تجزیہ زبان کے نقطۂ نظر سے

میں نے غالبؔ کی تین غزلوں کے سات اشعار منتخب کر کے فارسی و عربی الفاظ کی نشاندہی قوسین کے ذریعے کی ہے۔ ان میں بھی "ثوابِ طاعت و زہد" ہی ایک غالبؔ کے رنگ کی ترکیب ہے۔ "ابنِ مریم" نام ہے۔ "حالِ ملی" اور "جذبۂ دل" آسان ترین اُردو ترکیبیں ہیں۔ طبیعت، دوا، جنوں، خدا، کاش، سر، کام ایسے الفاظ ہیں، جو ہماری روزمرّہ کی بولی میں شامل ہیں۔ ہندی الاصل الفاظ کی کثرت اس قدر ہے کہ بعض مصرعے کے مصرعے ایسے الفاظ پر مشتمل ہیں۔ مثلاً:۔ اب کسی بات پر نہیں آتی ـــ اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے (کاش) یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

کاش کا لفظ نظرانداز کر دیا جائے تو پورے کا پورا شعر ہندی الاصل الفاظ کا مجموعہ ہے اور اسی طرح سر اور کام کو اگر خارج کر دیں تو یہ شعر بھی اسی قبیل کا ہے

بوجھ وہ (سر) سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے (کام) وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

ایک اور بات قابلِ غور نظر آتی ہے ع میرے (دُکھ) کی دوا کرے کوئی
یہاں "دکھ" کا لفظ دانستہ استعمال کیا گیا ہے۔ ورنہ اس کا ہم وزن "غم" موجود تھا اور غالبؔ دُکھ کی نسبت غم سے زیادہ مانوس رہے ہیں۔ دُکھ تو شاید اس سے پہلے انھوں نے استعمال ہی نہیں کیا۔ لیکن غم بار بار ان کے اشعار میں آیا ہے۔ کہیں کہیں محاورے اور ضرب الامثال بھی نظم کیے ہیں۔ ع ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا یا ع کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ایک جگہ تو آئے کا استعمال وہی ہے جو بیگماتِ دہلی ہی کی زبان سے مخصوص ہے

میرے ہونے میں ہے کیا رسوائی اے وہ خلوت نہیں جلوت ہی سہی

ایک مقام پہ "ایسا ہی" بڑے پُرمعنی طریقے سے باندھا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے اپنا اور اب لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

زبان کے ایسے نازک الفاظ کا استعمال ثابت کرتا ہے کہ اپنی شاعری کے تیسرے دور میں غالب کو محاورہ دہلی پر اتنا عبور ہو گیا تھا کہ ان کی زبان لائقِ استناد ٹھہرائی جاسکتی ہے مختلف ادوار کی غزلوں میں ہندی الاصل الفاظ اور عربی فارسی الفاظ کا تناسب مختلف رہا ہے۔ شماریات کی مدد سے غالب کی زبان پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اردو کا سب سے بڑا شاعر ہم سے کم از کم اتنی توجہ کی توقع رکھ سکتا ہے۔ ہمارا دور ایک تحقیقی دور ہے۔ غالب کے اس پہلو پر بھی ریسرچ ہونی چاہیے۔ تاکہ کلامِ غالب میں زبان کے ارتقا کا مسئلہ تحقیق کے بعد کسی قدر وثوق کے ساتھ منظرِ عام پر لایا جا سکے۔

پہلا دور

ربطِ یک شیرازۂ وحشت (ہیں) اجزائے بہار — سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا — سرِ تارِ نظر (ہے) رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا

اسدؔ (کو) بت پرستی (سے) غرض دردِ آشنائی (ہے)

نہاں (ہیں) نالۂ ناقوس (میں) در پردہ "یارب ہا"

حیرت ہمہ اسرار (پہ) مجبورِ خموشی — ہستی (نہیں) جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ

یہ اشعار غالب کی شاعری کے دورِ اولین سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہندی الاصل الفاظ کا تناسب عربی فارسی الفاظ کے مقابلے میں اتنا ہی ہے یا اس سے بھی کچھ زیادہ جتنا تیسرے دور شاعری کے کلام میں عربی و فارسی الفاظ کا تناسب ہندی الاصل الفاظ کے مقابلے میں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایران یا توران کا کوئی شاعر دلّی میں آنکلا ہے، اور فارسی میں شعر کہتا ہے لیکن ہر شعر میں ایک آدھ لفظ اردو کا بھی ڈال دیتا ہے۔

درمیانی دور

یہ غالب کی شاعری کا سنہری دور ہے۔ زبان اور خیال کے لحاظ سے یہ غالب کی شاعری کا نمائندہ دور ہے۔ اور اگر ہم غالب کو خود غالب ہی کے معیار پر رکھ کر پرکھنا چاہیں تو اس دور کے بہترین اشعار کو معیار بنائیں گے ؎

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

یہاں ہندی الاصل اور عربی فارسی الفاظ کے درمیان عدل برتا گیا ہے۔ ایک پلڑے میں ہندی الفاظ کو رکھ دیجیے اور دوسرے میں عربی فارسی الفاظ کو ؎

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر
کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

تناسبِ الفاظ وہی قائم رہتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ لفظ خواہ کسی زبان کا بھی کیوں نہ ہو تخلیقی عمل کی بنا پر بے ساختہ ذہن میں ابھر آیا۔ کسی قسم کا تکلّف تصنّع یا آورد محسوس نہیں ہوتا ؎

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں!
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حفِ نظر
طاقت ربا وہ ان کا اشارا کہ ہائے ہائے

تو سکندر ہے مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضرؑ کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے!
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے؟

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

دوسرے دور کی شاعری میں ایک طرف توانائی اضافات ہے، اور دوسری طرف زبان اور محاورے کے پہلو اور دونوں کے درمیان آہنگ قائم کیا گیا ہے۔ یعنی اس سے قطع نظر کہ کسی لفظ کی اصل کیا ہے ہر لفظ کو اس اصول کے تحت برتا گیا ہے کہ خیال کو اپنے اظہار کے لیے کس لفظ کی ضرورت ہے اور کونسا لفظ حقیقتاً ناگزیر ہے جس کے بغیر خیال اور اظہار میں مکمل مطابقت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ اس رنگِ شاعری کو دوسرے اسالیبِ شاعری پر فوقیت دی جاتی ہے۔

غالب کی شاعرانہ شخصیت کا آہنگِ تضاد

ایک مشہور انگریز شاعر و مفکر کا قول ہے کہ شاعر کے لیے یک رنگ و یک آہنگ ہونا

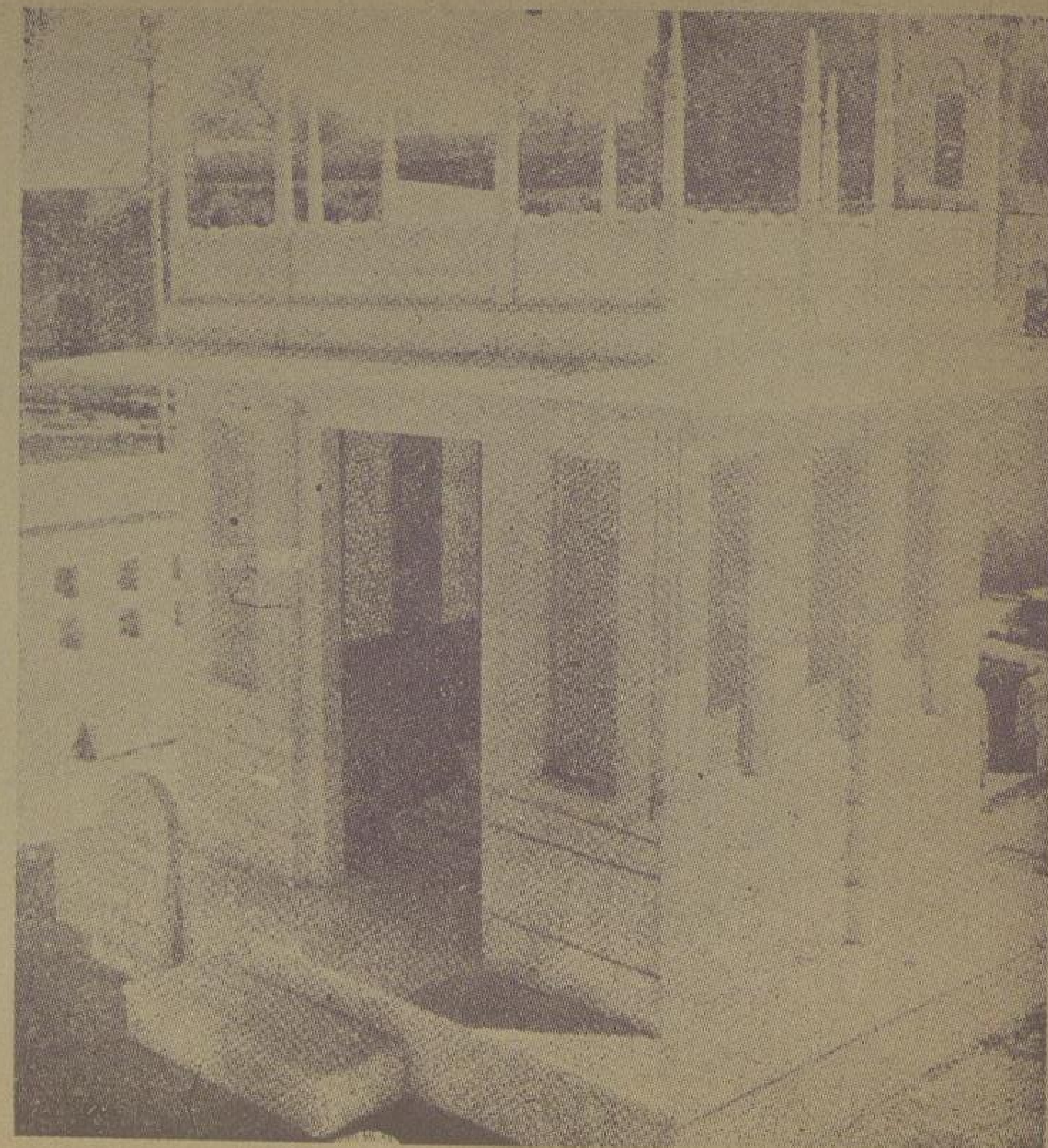
ضروری نہیں۔ ایک عظیم شاعر کا لہجہ ہر آن بدلتا رہتا ہے۔ اس میں خلوص بھی ہوتا ہے اور تصنّع بھی جبّ وطن بھی ہوتا ہے۔ زمانہ سازی اور سیاست کے میدان میں کبھی کسی طبقے سے تعلّقِ خاطر کا اظہار ہوتا ہے، اور کبھی کسی طبقے کے ساتھ وابستگی کا دعویٰ۔ کسی جگہ مذہبی شغف ہوتا ہے اور کسی جگہ روحانی اقدار سے بے زاری۔ ایقان اور تشکیک پہلو بہ پہلو موجود ہو سکتے ہیں۔ شاعروں کو یہ بھی لازم نہیں آتا کہ مروّجہ اصولِ اخلاق کی پیروی کریں، اور اپنے کو انسانیت کا نمونہ بنا کر دکھائیں۔ نفسیاتی گتھیاں سلجھاتے سلجھاتے شاعر خود اپنے لیے معمّہ بن جاتا ہے۔ لہجہ کہیں سنجیدہ ہوتا ہے، کہیں مزاحیہ اور کبھی اس میں تضحیک ہوتی ہے۔ اپنے دل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے مگر علوم و فنون کے پیچھے بھی دوڑتا ہے۔ معاشرے کے ساتھ شاعر کا تعلّق بھی عجیب ہے۔ انسان دوستی کا دعویٰ اور مردم بے زاری کا احساسِ تنہائی نہ ہو۔ تو تخلیقِ شعری غیر ممکن۔ لیکن تنہائی کاٹنے کو آتی ہے، اور خلا کا احساس پاگل کیے دیتا ہے۔ اُدھر یہ محسوس ہوتا ہے کہ معاشرہ کیا ہے۔ ایک قلعہ ہے یا ایک جیل خانہ۔ ہمہ وقت محاصرے کی سی حالت میں ہوتا ہے۔ لیکن شاعر معاشرے ہی کی پیداوار ہوتا ہے اور معاشرے ہی کی طرف اُس کا روئے سخن ہوتا ہے۔ آزادی اور یکسوئی کسی لمحہ میسّر نہیں آتی۔ ایک نقاد نے ایک شاعر سے کہا کہ تمھیں پہننے کو کپڑا اور کھانے کو روٹی میسّر ہے۔ یہی نہیں بلکہ پینے کو شراب بھی مل جاتی ہے۔ پھر بھی تم ہو کہ شکایتِ زمانہ سے لبریز ایک ساز کی مانند ہو۔ شاعر نے جواب دیا کہ روٹی اور کپڑے سے یا غم غلط کرنے کو تھوڑی سی شراب سے وہ روحانی خلا کیوں کر پُر ہو سکتا ہے۔ جس کا احساس ہی شاعری کی اساس ہے۔ شاعروں کے ساتھ ایک مصیبت یہ ہے کہ انھیں تن آسانی حاصل ہو تو اچھا شعر نہیں کہہ سکتے۔ اور اگر بے اطمینانی میں گزرے تو شاعری کی طرف توجہ نہیں کر سکتے اس کے علاوہ جو لوگ انتہائی نیک دل، مخلص اور انسان دوست ہوتے ہیں ان کا کلام بھی دلکشی سے معرّا ہوتا ہے۔ جب تک آزار پسندی اور آزار پرستی نہ ہو شعر میں نفسیاتی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ انانیت نہ ہو تو شاعر کا کوئی اپنا رنگ نہیں ہوتا۔ غرضکہ شاعرانہ شخصیت کے اجزا اتنے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں کہ دور سے دیکھنے والا سوانح نگار کسی شاعر کی شخصیت سے مرعوب نہیں ہو سکتا اور اسے مثالی شخصیت کا انداز لگانا مشکل ہوتا ہے۔

ان عوامل کے پیشِ نظر ہمیں کوئی ایسا اصول ڈھونڈھنا پڑتا ہے، جو شاعر کو غیر شاعر پر اور بڑے شاعر کو چھوٹے شاعر پر ترجیح دینے کا معیار قرار پا سکے۔ ایسا اصول جینئس یعنی شاعر کے تخلیقی جوہر کو معیار ماننے کے علاوہ دوسرا کوئی موجود نہیں۔ غالبؔ کی شاعرانہ شخصیت کا مطالعہ بھی اسی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ ورنہ زندگی کے ہر میدان میں ان کے معاصر اس پلیے کے موجود تھے۔ جنھیں اُن پر فوقیت حاصل تھی۔ لیکن اوسط نکالا جائے۔ تو مجموعی طور پر غالبؔ کو اپنے معاصرین پر فوقیت دی جائے گی اور خالص ذاتی جوہر یا تخلیقی جوہر کے نقطۂ نظر سے بھی وہ اپنے معاصرین پر فوقیت رکھتے تھے۔ وہ ایک عظیم فن کار تھے۔ ماضی کو انھوں نے اپنی ہستی میں سمو رکھا تھا۔ حال سے وہ ہم آہنگ تھے اور مستقبل ان کی نظر میں تھا۔ بڑا شاعر وہی ہے جو بیک وقت ماضی و حال و مستقبل پر حاوی ہو اور یہ بات اُردو شاعروں میں ہمیں غالبؔ کے اندر بدرجۂ اتم ملتی ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ جس دَور کی تربیت کلامِ غالبؔ کے مطالعہ کے ذریعے ہوگی۔ وہ حقائقِ زندگی کو سمجھے' اور زندگی کو اچھی طرح بسر کرنے کی اہلیت رکھے گا۔ زندگی کے ہر موڑ پر غالبؔ کا شعر ہمیں تسکین دیتا ہے اور ہماری ترجمانی کرتا ہے۔ ہماری اُمنگیں، الجھنیں اور محرومیاں ایک عمومی انداز میں غالبؔ کا شعر بن گئی ہیں، گویا انھیں آواز مل گئی ہے اور جب جذبے کی شدت کو آواز مل جائے تو تنقیۂ جذبات ہو جاتا ہے۔

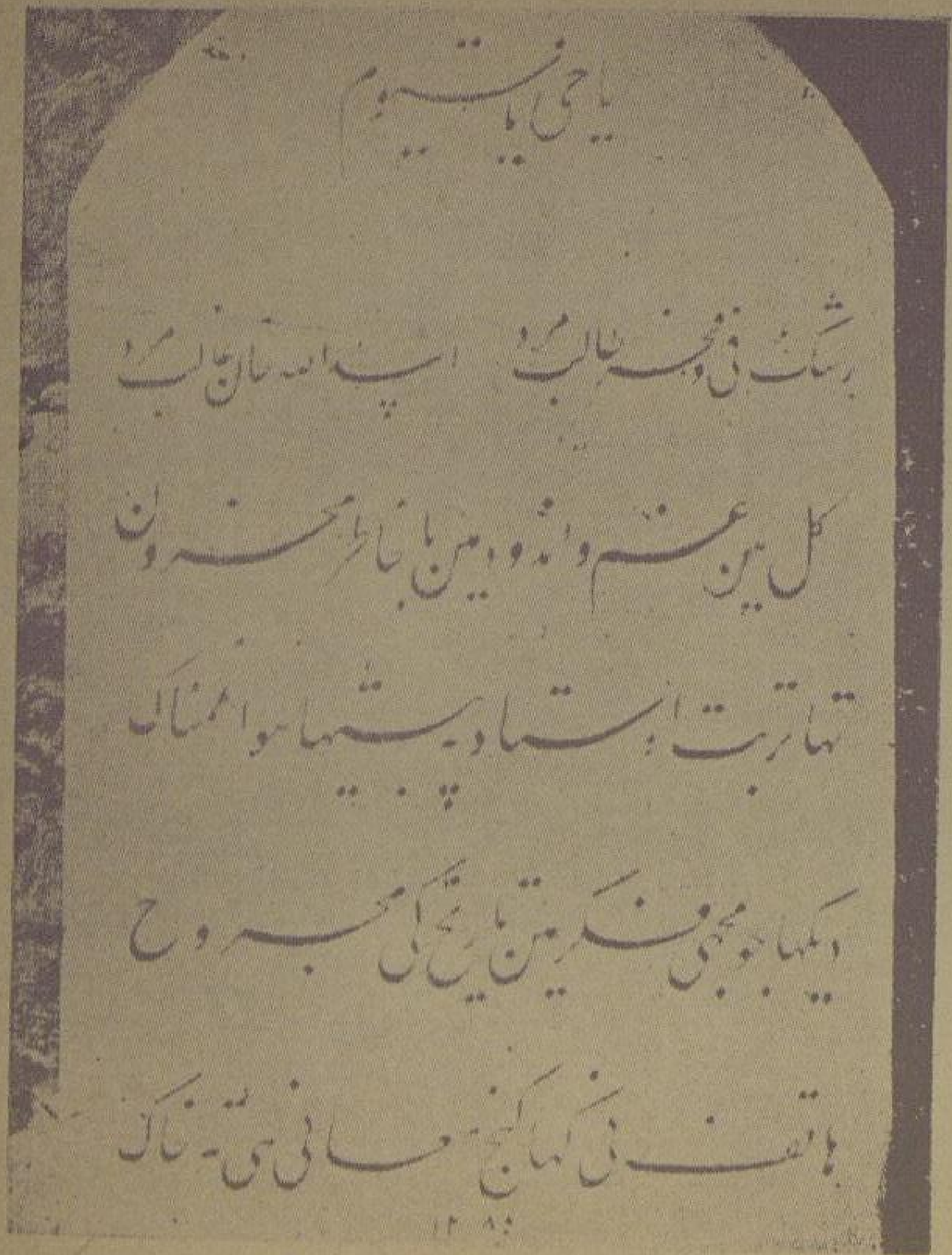
ایک نقاد کا قول ہے کہ شاعری تنقیدِ حیات ہے، مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ شاعری تنظیمِ حیات اور تعبیرِ کائنات بھی تو ہے۔ عظیم شاعر وہ ہے۔ جس کا شعر براہِ راست زندگی پر اثر انداز ہو۔ غالبؔ کے شعر کی یہی کیفیت ہے۔ جب تک پاک ہند تہذیب کا سانچہ نہیں بدلتا اور بنیادی خیالات نہیں بدلتے، غالبؔ کی شاعری ہمیں متاثر کرتی رہے گی۔ محسوس تو یہی ہوتا ہے کہ غالبؔ نے جدید و قدیم کو اس طرح یک جان کیا ہے کہ کلامِ غالبؔ کبھی پرانا نہیں ہو سکتا۔ یوں شاعروں کی مقبولیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ مدّو جزر کی سی کیفیت کہہ لیجیے۔ ایک تن آسانی کا دَور بھی آیا کرتا ہے،

پھر جانفشانی کا سورج اُبھرآتا ہے اور غالب جیسے شاعر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ غالب کو مستقبل میں بھی بھلایا نہ جاسکے گا۔

یوسف جمال انصاری
لاہور۔ ۵ ر اگست ۱۹۶۶ء



مزار غالب



کتبۂ مزار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیوانِ غالب

ردیف ا

(۱)

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا م کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

آتشیں پا ہوں، گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ — موئے آتش دیدہ ہے ہر حلقہ یاں زنجیر کا

شوخیٔ نیرنگ صیدِ وحشتِ طاؤس ہے — دام سبزہ میں ہے پروازِ چمن تسخیر کا

لذتِ ایجادِ ناز افسونِ عرضِ ذوقِ قتل — نعل آتش میں ہے، تیغِ یار سے نخچیر کا

کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ م صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

خشتِ پشتِ دستِ عجز و قالب آغوشِ وداع — پُر ہوا ہے سیل سے پیمانہ کس تعمیر کا

وحشتِ خوابِ عدم شورِ تماشا ہے اسدؔ — جو مژہ جوہر نہیں آئینۂ تعبیر کا

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیئے مطلع سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا

آگہی دامِ شنیدن جس قدر چاہے بچھائے — مدعا عنقا ہے اپنے عالمِ تقریر کا

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

جنوں گرمِ انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا — تمی — سویدا تا بلب زنجیر سے دودِ سپند آیا

مہِ[لہ] اختر فشاں کی بہرِ استقبال آنکھوں سے — تماشا کشورِ آئینہ میں آئینہ بند آیا

تغافل بدگمانی، بلکہ میری سخت جانی سے — نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیمِ گزند آیا

فضائے خندۂ گل تنگ و ذوقِ عیش بے پروا — م — فراغت گاہِ آغوشِ وداعِ دل پسند آیا

عدم ہے خیر خواہِ جلوہ کو زندانِ بیتابی — خرامِ ناز برقِ خرمنِ سعیِ پسند آیا

جراحت تحفہ، الماس، ارمغاں، نادیدنی دعوت
جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، خونِ جگر ہدیہ
— م — مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

شمارِ سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا — تمی — تماشائے بیک کف بُردنِ صد دل پسند آیا

بفیضِ بیدلی نومیدیٔ جاوید آساں ہے — م — کشائش کو ہمارا عقدۂ مشکل پسند آیا

حجابِ سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
ہوائے سیرِ گل آئینۂ بے مہریٔ قاتل
— م — کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

ہوئی جس کو بہارِ فرصتِ ہستی سے آگاہی — م — برنگِ لالہ جامِ بادہ بر محمل پسند آیا

سوادِ چشمِ بسمل انتخابِ نقطہ آرائی — م — خرامِ نازِ بے پروائیٔ قاتل پسند آیا

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہارِ ایجادیٔ بیدل پسند آیا

لہ پہلے یہ مصرع متن میں یوں تھا: "بہ استقبالِ تمثالِ زماہ اختر فشاں شوخی"۔ پھر اسے شکلِ بالا بدل دیا۔

ع متن میں اس شعر پر لا۔ لا لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غالباً اسے قابلِ حذف قرار دیا ہے اور اس کے بجائے حاشیہ پر یہ شعر بڑھایا گیا ہے:

روانی ہائے موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطفِ بے تحاشا رفتنِ قاتل پسند آیا

عالم جہاں بعرضِ بساطِ وجود تھا　قلمی　جوں صبح چاکِ جیب مجھے تار و پود تھا

جز قیس اور کو نہ ملا عرصۂ تپش
جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　م　صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا ہے عرض
آشفتگی نے نقشِ سویدا کیا درست　م　ظاہر ہوا کہ داغ کا سرمایہ دود تھا

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ　م　مژگاں جو وا ہوئی، نہ زیاں تھا. نہ سود تھا
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا

بازیِ خورِ فریب ہے اہلِ نظر کا ذوق　ہنگامہ گرمِ حیرتِ بود و نبود تھا
تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد　م　سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا
تنگی رفیقِ رہ تھی، عدم یا وجود تھا　میرا سفر بہ طالعِ چشمِ حسود تھا
تو یک جہاں قماشِ ہوس جمع کر کہ میں　حیرت متاعِ عالمِ نقصان و سود تھا
گردشِ محیطِ ظلم رہا جس قدر فلک　میں پائمالِ غمزۂ چشمِ کبود تھا
پوچھا تھا گرچہ یار نے احوالِ دل، مگر　کس کو دماغِ منتِ گفت و شنود تھا
ڈھانپا کفن نے داغِ عیوبِ برہنگی　م　میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا
لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز　م　لیکن یہی کہ 'رفت' گیا اور 'بود' تھا

خورشبنم آشنا نہ ہوا ورنہ میں اسد
سرتاقدم گزارشِ ذوقِ سجود تھا

کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا　م　دل کہاں کہ گم کیجے، ہم نے مدعا پایا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک باندھا
شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا　م　آپ سے کوئی پوچھے، تم نے کیا مزا پایا

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب — ہم نے دشتِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

بے دماغِ خجلت ہوں رشکِ امتحاں تا کے — ایک بیکسی تجھ کو عالم آشنا پایا

سادگی و پرکاری، بے خودی و ہشیاری م — حسن کو تغافل میں جرأت آزما پایا

خاکبازیِ امید۔ کارخانۂ طفلی — یاس کو دو عالم سے لب بخندہ وا پایا

کیوں نہ وحشتِ غالب باج خواہِ تسکیں ہو
کشتۂ تغافل کو۔ خصمِ خوں بہا پایا

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا م — درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

غنچہ پھر لگا کھلنے، آج ہم نے اپنا دل م — خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا

فکرِ نالہ میں گویا حلقہ ہوں ز سر تا پا — عضو عضو جوں زنجیر، یک دلِ صدا پایا

حالِ دل نہیں معلوم، لیکن اس قدر یعنی م — ہم نے بارہا ڈھونڈا، تم نے بارہا پایا

شب نظارہ پرور تھا، خواب میں خیال اس کا — صبح موجۂ گل کو نقشِ[1] بوریا پایا

جس قدر جگر خوں ہو، کوچہ دادنِ دل ہے — زخمِ تیغِ قاتل کو طرفہ دل کشا پایا

ہے مکیں کی پاداری، نامِ صاحبِ خانہ — ہم سے تیرے کوچے نے نقشِ مدعا پایا

دوست دارِ دشمن ہے، اعتمادِ دل معلوم — آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا

نے اسد جفا سائل نے ستمِ جنوں مائل
تجھ کو جس قدر ڈھونڈا، الفت آزما پایا

---

[1] متن میں "وقف" لکھا ہوا ہے۔ مگر اسے کاٹ کر حاشیے پر "نقش" بنایا ہے۔

[2] متن میں اوپر کا مصرع درج ہے لیکن اس پر "لا" لکھا ہے اور اس کے بجائے نیچے کا مشہور مصرع درج ہے جو اب مطبوعہ دواوین میں متداول ہے۔

کارخانہ سے جنوں کے بھی میں عریاں نکلا   قلمی   میری قسمت کا نہ ایک آدھ گریباں نکلا

ساغرِ جلوۂ سرشار ہے ہر ذرۂ خاک   شوقِ دیدار بلا آئنہ ساماں نکلا

عشرتِ ایجاد چہ بوئے گل و کو دودِ چراغ[لہ]
بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل   م   جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یارب   م   تیر بھی سینۂ بسمل سے پرافشاں نکلا

کچھ کھٹکتا تھا مرے سینہ میں لیکن آخر   جس کو دل کہتے تھے سو تیر کا پیکاں نکلا

کس قدر خاک ہوا ہے دلِ مجنوں یارب   نقشِ ہر ذرہ سویدائے بیاباں نکلا

دل میں پھر گریہ نے اک شور اُٹھایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

شوقِ ہر رنگ رقیبِ سروساماں نکلا   قلمی   قیس تصویر کے پردہ میں بھی عریاں نکلا

دلِ حسرت زدہ تھا مائدۂ لذتِ درد   م   کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا

شورِ رسوائیِ دل دیکھ کہ یک نالۂ شوق   لاکھ پردہ میں چھپا پھر وہی عریاں نکلا

شوخیِ رنگِ حنا، خونِ وفا سے کب تک   آخر اے عہد شکن! تو بھی پشیماں نکلا

جوہر ایجادِ خطِ سبز ہے خود بینیِ حسن   جو نہ دیکھا تھا سو آئینہ میں پنہاں نکلا

تھی نوآموزِ فنا ہمتِ دشوارئ شوق
تھی نوآموزِ فنا ہمتِ دشوار پسند   م   سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

میں بھی معذورِ جنوں ہوں اسدؔ اے خانہ خراب
پیشوا لینے مجھے گھر سے بیاباں نکلا

لہ متن میں اوپر کا مصرع درج ہے لیکن اس پر "لا" لکھا ہے اور اس کے بجائے نیچے کا مشہور مصرع لکھا ہوا ہے جو اب مطبوعہ دواوین میں متداول ہے۔

دہر میں نقشِ وفا وجہِ تسلی نہ ہوا   م   ہے یہ وہ لفظ کہ شرمندۂ معنی نہ ہوا

سبزۂ خط سے ترا کاکلِ سرکش نہ دبا   م   یہ زمرد بھی حریفِ دمِ افعی نہ ہوا

میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں   ا   وہ ستمگر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا

دل گزرگاہِ خیالِ مے و ساغر ہی سہی   م   گر نفس جادۂ سر منزلِ تقوی نہ ہوا

نہوئی ہم سے رقم حیرتِ خطِ رخِ یار   صفحہ آئینہ ہوا آئینہ طوطی نہ ہوا

ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پہ بھی راضی کہ کبھی   م   گوش منت کشِ گلبانگِ تسلی نہ ہوا

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجے   م   ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا

وسعتِ رحمتِ حق دیکھ کہ بخشا جاوے   مجھ سا کافر کہ جو ممنونِ معاصی نہ ہوا

مرگیا صدمۂ آوازسے تم کی غالب   م   ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسی نہ ہوا

مرگیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالب

شبِ اختر قدحِ عیش نے محمل باندھا   باریک قافلۂ آبلہ منزل باندھا

سبحہ واماندگیٔ شوق و تمنا منظور   جادہ پر زیورِ صد آئینہ منزل باندھا

ضبطِ گریہ گہرِ آبلہ لایا آخر   پائے صد موج بطوفاں کدۂ دل باندھا

حیف اے ننگِ تمنا کہ پئے عرضِ حیا[۱]   یک عرق آئینہ بر جبہۂ سائل باندھا

حسن آشفتگیِ جلوہ سے عرضِ اعجاز   دستِ موسے بہ سرِ دعویِ باطل باندھا

تپشِ آئینہ۔ پروازِ تمنا۔ لائی   نامۂ شوق بہ بالِ پرِ بسمل باندھا

دیدہ تا دل ہے یک آئینہ چراغاں کس نے   خلوتِ ناز پہ پیرایۂ محفل باندھا

---

۱ پہلے یہ مصرع یوں تھا "داغ اے حاجتِ بے درد کہ در عرضِ حیا"۔ پھر اسے کاٹ کر اس صورت میں تبدیل کر دیا ہے۔

نا اُمیدی نے بتقریبِ مضامینِ خمار — کوچۂ موج کو خمیازۂ ساحل باندھا

مطربِ دل نے مرے تارِ نفس سے **غالبؔ**
ساز پر رشتہ پئے نغمۂ بیدلؔ باندھا

جب بتقریبِ سفر یار نے محمل باندھا م تپشِ شوق نے ہر ذرّہ پہ اک دل باندھا
ناتوانی ہے تماشائیِ عُمرِ رفتہ — رنگ نے آئنہ آنکھوں کے مقابل باندھا
اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیِ ناز م جوہرِ آئینہ کو طوطیِ بسمل باندھا
اصطلاحاتِ اسیرانِ تغافل مت پوچھ — جو گرہ آپ نہ کھولی اُسے مشکل باندھا
یاس و اُمید نے یک عربدہ میداں مانگا م عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا
یار نے تشنگیِ شوق کے مضموں چاہے — ہم نے دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا
نوکِ ہر خار سے تھا بسکہ سرِ دزدیِ زخم — جوں نمد ہم نے کفِ پا پہ اسدؔ دل باندھا

نہ بندھے تشنگیِ ذوق کے مضموں **غالبؔ**
گرچہ دل کھول کے دریا کو بھی ساحل باندھا

شب[۱] کہ ذوقِ گفتگو سے تیری دل بیتاب تھا م شوخیِ وحشت سے افسانہ فسونِ خواب تھا
گرمیِ برقِ تپش سے زہرۂ دل آب تھا — شعلۂ جوّالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا
واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام م گریہ سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
واں خود آرائی کو تھا موتی پرونے کا خیال م یاں ہجومِ اشک سے تارِ نظر نایاب تھا

---

[۱] اس غزل کا مطلع اور مقطع دونوں دیوانِ غالب شائع کردہ مولانا حسرت موہانی اور دیوانِ غالب مطبوعہ مطبع نظامی بدایوں کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کے ضمن میں درج ہیں۔

لے زمیں سے آسماں تک فرش تھیں بیتابیاں ‏ شوخیِ بارش سے مہ فوارۂ سیلاب تھا

واں ہجومِ[1] نغمہ ہائے سازِ عشرت تھا اسدؔ ‏ م
ناخنِ غم یاں سرِ تارِ نفس مضراب تھا

نالۂ دل میں شب اندازِ اثر نایاب تھا ‏ قلمی ‏ تھا سپندِ بزمِ وصلِ غیر، گو بیتاب تھا
دیکھتے تھے ہم بچشمِ خود وہ طوفانِ بلا ‏ آسمانِ سفلہ جس میں یک کفِ سیلاب تھا
موج سے پیدا ہوئے پیراہنِ دریا میں خار ‏ گریہ وحشت بیقرارِ جلوۂ مہتاب تھا
جوشِ تکلیفِ تماشا محشر آبادِ نگاہ ‏ فتنۂ خوابیدہ کو آئینہ مشتِ آب تھا
بے خبر مت کہہ ہمیں بیدرد! خود بینی سے پوچھ ‏ قلزمِ ذوقِ نظر میں آئینہ پایاب تھا

بیدلی ہائے اسدؔ افسردگی آہنگ تر
یادِ ایامے کہ ذوقِ صحبتِ احباب تھا

شب کہ برقِ سوزِ دل سے زہرۂ ابر آب تھا ‏ مطلع ‏ شعلۂ جوّالہ ہر یک حلقۂ گرداب تھا
جلوۂ گل نے کیا تھا واں چراغاں آبجو ‏ م ‏ یاں رواں مژگانِ چشمِ تر سے خونِ ناب تھا
یاں سرِ پرشور بے خوابی سے تھا دیوار جو ‏ م ‏ واں وہ فرقِ ناز محوِ بالشِ کمخواب تھا
یاں نفس کرتا تھا روشن شمعِ بزمِ بیخودی ‏ م ‏ جلوۂ گل واں بساطِ صحبتِ احباب تھا
فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا ‏ م ‏ یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا

---

[1] یہ شعر متن میں پہلے یوں لکھا تھا ؎

جوشِ یادِ نغمہ و سازِ طرب سے اسدؔ ‏ ناخنِ غم بر سرِ تارِ نفس مضراب تھا

بعد میں اسے کاٹ کر یہ اصلاح کی گئی اور یہی شعر مشہور ہوا چنانچہ مذکورہ بالا دیوانوں میں بھی یہ شعر اسی طرح درج ہے۔

تا گماں اس رنگ سے خوں نابہ ٹپکانے لگا م دل کہ ذوقِ کاوشِ ناخن سے لذّت یاب تھا
مقدمِ سیلاب سے دل کیا نشاط آہنگ ہے م خانۂ عاشق مگر سازِ صدائے آب تھا
نازشِ ایامِ خاکستر نشینی کیا کہوں م پہلوئے اندیشہ وقفِ بسترِ سنجاب تھا
کچھ نہ کی اپنے جنونِ نارسا نے، ورنہ یاں م ذرّہ ذرّہ روکشِ خورشیدِ عالم تاب تھا
آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے؟ م کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا
یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا م انتظارِ صید میں اک دیدۂ بیخواب تھا

میں نے روکا رات غالبؔ کو، وگرنہ دیکھتے م
اُس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا

نہ بھولا اضطرابِ دم شماری انتظار اپنا قی کہ آخر شیشۂ ساعت کے کام آیا غبار اپنا
ز بس آتش نے فصلِ رنگ میں رنگِ دگر پایا چراغِ گل سے ڈھونڈے ہے چمن میں شمعِ خار اپنا
اسیرِ بے زباں ہوں کاشکے صیادِ بے پروا بہ دامِ جوہرِ آئینہ ہو جائے شکار اپنا
مگر ہو مانعِ دامن کشی ذوقِ خود آرائی ہوا ہے نقش بندِ آئینہ سنگِ مزار اپنا
دریغ اے ناتوانی ورنہ ہم ضبط آشنایاں نے طلسمِ رنگ میں باندھا تھا عہدِ استوار اپنا
اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ بیتابی نثارِ گردشِ پیمانۂ مے روزگار اپنا

اسدؔ ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا (م)

نہ ہوگا یک بیاباں ماندگی سے ذوقِ کم میرا حبابِ موجۂ رفتار ہے نقشِ قدم میرا
رہِ خوابیدہ تھی گردن کشِ یک درسِ آگاہی زمیں کو سیلیِ اُستاد ہے نقشِ قدم میرا
محبت تھی چمن سے، لیکن اب یہ بے دماغی ہے کہ موجِ بوئے گل سے ناک میں آتا ہے دم میرا

سراغِ آوارۂ عرضِ دو عالم شورِ محشر ہوں پرافشاں ہے غبار آں سوئے صحرائے عدم میرا
نہ ہو وحشت کشِ درسِ سرابِ سطرِ آگاہی میں گردِ راہ[۱] ہوں بے مدّعا ہے پیچ و خم میرا
ہوائے صبحِ یک عالم گریباں چاکیِ گل ہے دہانِ زخم پیدا کر، اگر کھاتا ہے غم میرا

اسدؔ وحشت پرستِ گوشۂ تنہائیِ دل ہے
برنگِ موجِ مے خمیازہ ساغر ہے رم میرا

پئے نذرِ کرم تحفہ ہے، شرمِ نارسائی کا م بخوں غلطیدۂ صد رنگ دعویٰ پارسائی کا
جہاں مٹ جائے سعیِ دید، خضرِ آبادِ آسائش بجیبِ ہر نگہ پنہاں ہے حاصل رہنمائی کا
بعجزِ آبادِ وہمِ مدعا تسلیمِ شوخی ہے تغافل کو نہ کر مصروف[۲] تمکیں آزمائی کا
زکوٰۃِ حسن دے، اے جلوۂ بینش کہ مہر آسا م چراغِ خانۂ درویش ہو کاسہ گدائی کا
نہ مارا جان کر بے جرم، غافل تیری گردن پر ، رہا مانندِ خونِ بے گنہ، حق آشنائی کا
دہانِ ہر بتِ پیغارہ جو۔ زنجیرِ رسوائی ، عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بیوفائی کا

اسدؔ کا قصہ طولانی ہے، لیکن مختصر یہ ہے
کہ حسرت کش رہا عرضِ ستم ہائے جدائی کا

نہ ہو حسنِ تماشا دوست رسوا بے وفائی کا م بہ مہرِ صد نظر ثابت ہے دعویٰ پارسائی کا
ہوس گستاخیِ آئینہ تکلیفِ نظر بازی بجیبِ آرزو پنہاں ہے حاصل دلربائی کا
نظر بازی طلسمِ وحشت آبادِ پرستاں ہے رہا بیگانۂ تاثیر افسوں آشنائی کا

۱؎ حاشیے پر "میں گردِ راہ ہوں" کی بجائے "غبارِ راہ ہوں" بنایا ہے۔

۲؎ حاشیے پر "مصروف" کی جگہ "معزول" لکھا ہے۔

نہ پایا دردمندِ دوریِ یارانِ یک دل نے
سوادِ خطِ پیشانی سے نسخہ مومیائی کا

تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے م
مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

اسد یہ عجز و بے سامانیِ فرعون توام ہے
جسے تو بندگی کہتا ہے دعویٰ ہے خدائی کا

وہی اک بات ہے جو یاں نفَس واں نکہتِ گل ہے معتبر
چمن کا جلوہ باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

نہ دے نامہ کو اتنا طول غالب مختصر لکھ دے
کہ حسرت سنج ہوں عرضِ ستم ہائے جدائی کا

شبِ خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا تم
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یک قدم وحشت سے درسِ دفترِ امکاں کھلا م
جادہ، اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

ہوں چراغانِ ہوس، جوں کاغذِ آتش زدہ
داغِ گرم کوششِ ایجادِ داغِ تازہ تھا

مانعِ وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے؟ م
خانۂ مجنونِ صحرا گرد بے دروازہ تھا

پوچھ مت۔ رسوائیِ اندازِ استغنائے حسن م
دست پابندِ حنا، رخسارِ رہنِ غازہ تھا
دست مرہونِ حنا، رخسار رہنِ غازہ تھا

دیدۂ تر نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ آب
نالۂ دل نے دیے اوراقِ لختِ دل بہ باد م
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

بے نوائی تر صدائے نغمۂ شہرت اسد
بوریا یک نیستاں عالم بلند آوازہ تھا

وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا تم
رازِ مکتوب بہ بے ربطیِ عنواں سمجھا

یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز "
چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا

شرحِ اسبابِ گرفتاریِ خاطر مت پوچھ
اس قدر تنگ ہوا دل کہ میں زنداں سمجھا

ہم نے وحشت کدۂ بزمِ جہاں میں جوں شمع — شعلۂ عشق کو اپنا سر و ساماں سمجھا

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل، تا دمِ مرگ م — دفعِ پیکانِ قضا اس قدر آساں سمجھا

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہوگا ،، — نبضِ خس سے تپشِ شعلۂ سوزاں سمجھا

سفرِ عشق میں کی ضعف نے راحت طلبی ،، — ہر قدم سایہ کو میں اپنے شبستاں سمجھا

بدگمانی نے نہ چاہا اسے سرگرمِ خرام ،، — رخ پہ ہر قطرہ عرق دیدۂ حیراں سمجھا

دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ
م غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگیٔ جا کا — گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا

یہ جانتا ہوں کہ تو اور جوابِ نامۂ شوق
یہ جانتا ہوں کہ تو اور پاسخِ مکتوب
م — مگر ستم زدہ ہوں ذوقِ خامہ فرسا کا

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ گل مت دو
غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
م — مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بیجا کا

نہ پائی[لہ] وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم نے — عدم کو لے گئے دل میں غبارِ صحرا کا

مرا شمول ہر اک دل کے پیچ و تاب میں ہے — میں مدعا ہوں تپش نامۂ تمنا کا

نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے م — مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

فلک کو دیکھ کے کرتا ہے تجھ کو یاد اسدؔ — اگرچہ گم شدہ ہے کاروبارِ دنیا کا

حنائے پائے خزاں ہے، بہار اگر ہے یہی مبۂ — دوامِ کلفتِ خاطر ہے عیشِ دنیا کا

ہنوز محرمیٔ عشق کو ترستا ہوں م — کرے ہے ہر بُنِ مو کام چشمِ بینا کا

لہ حاشیے پر اس مصرع کو یوں لکھا ہے: "ملی نہ وسعتِ جولانِ یک جنوں ہم کو"

فلک کو دیکھ کے کرتا ہوں اُس کو یاد اسدؔ
جفا میں اُس کی ہے انداز کارفرما کا

کس کا خیالِ آئینۂ انتظار تھا — طی — ہر برگِ گُل کے پردے میں دل بیقرار تھا
کس کا جنونِ دید تمنّا شکار تھا — آئینہ خانہ وادیِ جوہر غبار تھا
چُوں غنچہ و گل آفتِ فالِ نظر نہ پوچھ — پیکاں سے تیرے جلوۂ زخم آشکار تھا
اب میں ہوں اور خونِ دو عالم معاملہ
اب میں ہوں اور ماتمِ یک شہرِ آرزو — م — توڑا جو تُو نے آئینہ تمثال دار تھا
دیکھی وفائے فرصتِ رنج و نشاطِ دہر — خمیازہ یک درازیِ عمرِ خمار تھا
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا بیاں نہ پوچھ
موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال — م — ہر ذرّہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا
صبحِ قیامت ایک دُمِ گرگ تھی اسدؔ — جس دشت میں وہ شوخِ دو عالم شکار تھا
اک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب — مطبوعہ — خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا
گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو کہ میں — م — جاں دادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب
م — دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا

زبس خوں گشتۂ رشکِ وفا تھا وہمِ بسمل کا — طی — چرایا زخم ہائے دل نے پانی تیغِ قاتل کا
نگاہِ چشمِ حاسد وام لے اے ذوقِ خود بینی — تماشائی ہوں وحدت خانۂ آئینۂ دل کا
سراپا رہنِ عشق و ناگزیرِ اُلفتِ ہستی — م — عبادت برق کی کرتا ہوں اور افسوس حاصل کا
شررِ فرصت نگہ سامانِ یک عالم چراغاں ہے — بقدرِ رنگ یاں گردش میں ہے پیمانہ محفل کا

بقدرِ ظرف ہے ساقی خمارِ تشنہ کامی بھی — جو تو دریائے مے ہے تو میں خمیازہ ہوں ساحل کا
سراسر تاختن کو شش جہت یک عرصہ جولاں تھا — ہوا واماندگی سے رہرواں کی فرقِ منزل کا

[۱] مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

لبِ خشک در تشنگی مردگاں کا — قلمی — زیارت کدہ ہوں دل آزردگاں کا
شگفتن کمیں دارِ تقریب جوئی — تصور ہوں بے موجب آزردگاں کا
غریبِ بدر جستۂ باز گشتن — سخن ہوں سخن بر لب آوردگاں کا
سراپا یک آئینہ دارِ شکستن — ارادہ ہوں یک عالم افسردگاں کا
ہمہ نا امیدی، ہمہ بد گمانی — م — میں دل ہوں فریبِ وفا خوردگاں کا

بصورت تکلف، بمعنی تاسف
اسد میں تبسم ہوں پژمردگاں کا

ضعفِ جنوں کو وقتِ تپش در بھی دور تھا — قلمی — اک گھر میں مختصر سا بیاباں ضرور تھا
اے وائے غفلتِ نگہِ شوق، ورنہ یاں — ہر پارہ سنگ لختِ دلِ کوہِ طور تھا
درسِ تپش ہے برق کو اب اس کے نام سے — وہ دل ہے یہ کہ جس کا تخلص صبور تھا
شاید کہ مر گیا ترے رخسار دیکھ کر — پیمانہ رات ماہ کا لبریزِ نور تھا
آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے — م — صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا
قاصد کو اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے — م — { ہاں اس معاملے میں تو میرا قصور تھا
اس کی خطا نہیں ہے یہ میرا قصور تھا

---

[۱] پہلے متن میں یہ مصرع یوں لکھا تھا "مجھے اس قطع رہ میں" الخ اسے کاٹ کر یہ اصلاح کی گئی ہے۔

جنت[۱] ہے تیری تیغ کے کشتوں کی منتظر　　جوہر سوادِ جلوۂ مژگانِ حور تھا

ہر رنگ میں جلا **اسدِ** فتنہ انتظار
پروانۂ تجلّیِ شمعِ ظہور تھا

بہارِ رنگِ خونِ گل ہے ساماں اشکباری کا　قلمی　جنونِ برق نشتر ہے رگِ ابرِ بہاری کا
برائے حلِ مشکل ہوں، زپا افتادۂ حسرت　　بندھا ہے عقدۂ خاطر سے پیماں خاکساری کا
حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل　م　جہاں ساقی ہے تو، باطل ہے دعویٰ ہوشیاری کا
بوقتِ سرنگونی ہے تصور انتظارستاں　　نگہ کو، آبلوں سے شغل ہے اختر شماری کا
لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی　م　چمن زنگار ہے آئینۂ بادِ بہاری کا

اسد ساغر کشِ تسلیم ہو گردش سے گردوں کی
کہ ننگِ فہمِ مستاں ہے، گلہ بدروزگاری کا

طاؤس در رکاب ہے ہر ذرہ آہ کا　قلمی　یارب نفس غبار ہے کس جلوہ گاہ کا
عزلت گزینِ بزم ہیں واماندگانِ دید　　مینائے مے ہے آبلہ پائے نگاہ کا
ہر گام آبلے سے ہے دل در تہِ قدم　　کیا بیم اہلِ درد کو سختیِ راہ کا
غافل بوہمِ ناز خود آرا ہے ورنہ یاں　　بے شانۂ صبا نہیں طرّہ گیاہ کا
جیبِ نیازِ عشق نشاں دارِ ناز ہے　　آئینہ ہوں شکستنِ طرفِ کلاہ کا
بزمِ قدح سے عیشِ تمنا نہ رکھ کہ رنگ　م　صیدِ ز دام جستہ ہے اس دام گاہ کا
جاں در ہوائے یک نگہِ گرم ہے **اسد**
جاں در ہوائے یک نفسِ گرم ہے **اسد**　}　م　پروانہ ہے وکیل ترے دادخواہ کا

---

[۱] یہ شعر متن میں نہیں ہے حاشیے پر درج ہے۔ غالباً نظرِ ثانی کے وقت بڑھایا گیا ہے۔

رحمت اگر قبول کرے، کیا بعید ہے بڑ شرمندگی سے عذر نہ کرنا گناہ کا
مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں کہ ہے پُر گل، خیالِ زخم سے دامن نگاہ کا

خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا قلمی بے کسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا
آتشِ موئے دماغِ شوق ہے تیرا تپاک ورنہ ہم کس کے ہیں اے داغِ تمنا آشنا
بے دماغی شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہیں یار تیرا جامِ مے، خمیازہ میرا آشنا
جوہرِ آئینہ جز رمزِ سرِ مژگاں نہیں آشنا کی ہمدگر سمجھے ہے ایما آشنا
ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل نا آشنا
ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ نیرنگ ہے م گردشِ مجنوں بہ چشمک ہائے لیلیٰ آشنا
کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ م سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا
رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف مطبوعہ عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
ہیں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا تن یاں جادہ بھی فتیلہ ہے لالے کے داغ کا
بے مے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی م کھینچا ہے عجزِ حوصلہ نے خطِ ایاغ کا
تازہ نہیں ہے نشۂ فکرِ سخن مجھے م تریاکیِ قدیم ہوں دودِ چراغ کا
بے خونِ دل ہے چشمِ جنوں میں نگہ غبار
بے خونِ دل ہے چشم میں موجِ نگہ غبار م یہ میکدہ خراب ہے مے کے سراغ کا
باغِ شگفتہ تیرا بساطِ ہوائے دل ا م

باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل ۔۔۔ ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

جوشِ بہارِ کلفتِ نظارہ ہے اسدؔ ۔۔۔ ہے ابر پنبہ روزنِ دیوارِ باغ کا

بلبل[1] کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل ۔۔۔ کہتے ہیں جس کو عشق، خلل ہے دماغ کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے
پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا

بسکہ[2] دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۔۔۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی ۔۔۔ در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

وائے دیوانگیِ شوق، کہ ہر دم مجھ کو ۔۔۔ آپ جانا اُدھر اور آپ ہی حیراں ہونا

جلوہ از بسکہ تقاضائے نگہ کرتا ہے ۔۔۔ جوہرِ آئنہ بھی چاہے ہے مژگاں ہونا

عشرتِ قتل گہِ اہلِ تمنا مت پوچھ ۔۔۔ عیدِ نظارہ ہے شمشیر کا عریاں ہونا

لے گئے خاک میں ہم داغِ تمنائے نشاط ۔۔۔ تو ہو اور آپ بصد رنگ گلستاں ہونا

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا کھانا ۔۔۔ لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں ہونا

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ۔۔۔ ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ
جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

گر نہ احوالِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا
گر نہ اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہو جائے گا ۔۔۔ بے تکلف داغِ مہ مُہرِ دہاں ہو جائے گا

---

[1] یہ دونوں شعر قلمی دیوان کے حاشیے پر درج ہیں

[2] یہ غزل بلا ردوبدل بجنسہٖ قلمی اور مروجہ دیوان میں مشترک ہے۔ ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہے۔

زہرہ گر ایسا ہی شامِ ہجر میں ہوتا ہے آب م — پرتوِ مہتاب سیلِ خانماں ہو جائے گا

گر وہ مستِ ناز تمکیں دے صلائے عرضِ حال — خارِ گل، بہرِ دہانِ گل زباں ہو جائے گا

{ لے تو لوں سوتے میں اس کے بوسہائے پا مگر / لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر } م — ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

گر شہادت آرزو ہے، نشہ میں گستاخ ہو — بالِ شیشے کا رگِ سنگِ فساں ہو جائے گا

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط م — { شعلہ خس میں، جیسے خوں در رگ نہاں ہو جائے گا / شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہو جائے گا }

فائدہ کیا؟ سوچ، آخر تو بھی ہے دانا اسدؔ م
دوستی ناداں کی ہے، جی کا زیاں ہو جائے گا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے کیا معلوم تھا مطبوعہ — یعنی یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہو جائے گا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری جو تو راضی ہوا — مجھ پہ گویا اک زمانہ مہرباں ہو جائے گا

باغ میں مجھ کو نہ لے جا، ورنہ میرے حال پر — ہر گلِ تر ایک چشمِ خوں فشاں ہو جائے گا

وائے گر میرا ترا انصاف محشر میں نہ ہو
اب تلک تو یہ توقع ہے کہ واں ہو جائے گا

قطرۂ مے بسکہ حیرت سے نفس پرور ہوا م قلمی — { خطِ جامِ بادہ یکسر رشتۂ گوہر ہوا / خطِ جامِ مے سراسر رشتۂ گوہر ہوا }

گرمیِ دولت ہوئی آتش زنِ نامِ نکو — خانۂ خاتم میں یاقوتِ نگیں اختر ہوا

نشہ میں گم کردہ راہ آیا وہ مستِ فتنہ خو — آج رنگِ رفتہ دورِ گردشِ ساغر ہوا

درد سے در پردہ دی مژگاں سیاہاں نے شکست — ریزہ ریزہ استخواں کا پوست میں نشتر ہوا

زہد[1]، گردیدن ہے گردِ خانہ ہائے منعماں — دانۂ تسبیح سے میں مہرہ در ششدر ہوا

[1] متن میں اس شعر پر "لا" لکھا ہوا ہے اور حاشیے پر اس کی جگہ یہ متداول شعر لکھا ہے "اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا" الخ

اے بہ ضبطِ حالِ نا افسردگاں جوشِ جنوں
نشۂ مے ہے اگر یک پردہ نازک تر ہوا

اس چمن میں ریشہ داری جس نے سر کھینچا اسدؔ
تر زبانِ لطفِ عامِ ساقیِ کوثر ہوا

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا مطبوعہ

اُف نہ کی، گو سوزِ دل سے بے محابا جل گیا
دل مرا سوزِ نہاں سے بے محابا جل گیا } قلمی م
آتشِ خاموش کی مانند گویا جل گیا

دُود میرا سنبلستاں سے کرے ہے ہمسری
بسکہ شوقِ آتشِ گل سے سراپا جل گیا

شمع رویاں کی سرانگشتِ حنائی دیکھ کر
غنچۂ گل پرفشاں پروانہ آسا جل گیا

خانمانِ عاشقاں دوکانِ آتشباز ہے
شعلہ رویاں جب ہوئے گرمِ تماشا جل گیا

تا کُجا افسوسِ گرمی ہائے صحبت اے خیال
دل ز آتش خیزیِ[1] داغِ تمنا جل گیا

ہے اسدؔ بیگانۂ افسردگی اے بیکسی
دل ز اندازِ تپاکِ اہلِ دُنیا جل گیا

دل میں ذوقِ وصل و یادِ یار تک باقی نہیں
مطبوعہ آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

میں عدم سے بھی پرے ہوں، ورنہ غافل بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا

عرض کیجے جوہرِ اندیشہ کی گرمی کہاں
کچھ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

دل نہیں، تجھ کو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار
اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالبؔ کہ دل
دیکھ کر طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا جل گیا

---

[1] حاشیے پر "آتش خیزی" کی بجائے "سوزِ آتش" بنایا ہے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا ٭ دل جگر تشنۂ فریاد آیا

دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز ٭ پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا

عذرِ واماندگی، اے حسرتِ دل ٭ نالہ کرتا تھا، جگر یاد آیا

سادگی ہائے تمنا، یعنی ٭ پھر وہ نیرنگِ نظر یاد آیا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے ٭ دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

آہ وہ جراتِ فریاد کہاں ٭ { دل کے پردے میں جگر یاد آیا / دل سے تنگ آ کے جگر یاد آیا }

میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ ٭ سنگ اُٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ٭ کیوں ترا راہ گزر یاد آیا

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ٭ گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

[۱] پھر ترے کوچے کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا

تو دوست[۲] کسو کا بھی ستمگر نہ ہوا تھا ٭ اوروں پہ ہے وہ ظلم کہ مجھ پر نہ ہوا تھا

چھوڑا مہِ نخشب کی طرح دستِ قضا نے ٭ خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے ٭ آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ٭ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

---

۱ یہ شعر قلمی دیوان کے حاشیے پر درج ہے۔

۲ یہ پوری غزل دونوں دیوانوں میں بالکل مشترک ہے۔ البتہ مطلع میں مروّجہ دیوان میں "کسو" کی بجائے "کسی" ہے جس سے محاورۂ زبان کی تدریجی اصلاح کا پتہ لگتا ہے۔ غالب نے خود ایک خط میں بہ تصریح لکھ دیا ہے کہ قافیہ کی ضرورت کے سوا اس کے اشعار میں ہر جگہ "کسو" کی بجائے "کسی" پڑھنا چاہیئے (دیوانِ غالب، مرتبہ حسرت موہانی ص ۱۴۱)

میں سادہ دل آزادگیٔ یار سے خوش ہوں   یعنی سبقِ شوق مکرّر نہ ہوا تھا

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک   میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

جاری تھی اسدؔ داغِ جگر سے مرے تحصیل
آتشکدہ جاگیرِ سمندر نہ ہوا تھا

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا   م   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاں دادگاں کا حوصلہ فرصت گداز ہے   یاں عرصۂ طپیدنِ بسمل نہیں رہا

ہوں قطرہ زن بوادیٔ حسرت شبانہ روز   جز تارِ اشک جادۂ منزل نہیں رہا

بر روئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے   م   یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

اے آہ میری خاطرِ وابستہ کے سوا   دنیا میں کوئی عقدۂ مشکل نہیں رہا

ہر چند ہوں میں طوطیٔ شیریں سخن ولے   آئینہ، آہ میرے مقابل نہیں رہا

اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسدؔ   جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

جاتا ہوں داغِ حسرتِ ہستی لئے ہوئے   مطلع   ہوں شمعِ کشتہ، درخورِ محفل نہیں رہا

مرنے کی اے دل! اور ہی تدبیر کر کہ میں   شایانِ دست و بازوئے قاتل نہیں رہا

وا کر دئے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن   غیر از نگاہ، اب کوئی حائل نہیں رہا

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار   لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

دل سے ہوائے کشتِ وفا مٹ گئی کہ واں   حاصل، سوائے حسرتِ حاصل نہیں رہا

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا، مگر اسدؔ
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

خلوتِ آبلۂ پا میں ہے جولاں میرا   خوں ہے دل تنگیٔ وحشت سے بیاباں میرا

[۱] ذوقِ سرشار سے بے پردہ ہے طوفاں میرا — موجِ خمیازہ ہے ہر زخمِ نمایاں میرا
عیش بازی کدۂ حسرتِ جاوید رسا — خونِ آدینہ سے رنگیں ہے دبستاں میرا
حسرتِ نشۂ وحشت نہ بسعیِ دل ہے — عرضِ خمیازۂ مجنوں ہے گریباں میرا
سرمۂ مفتِ نظر ہوں، مری قیمت یہ ہے — کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا
عالمِ بے سر و سامانیِ فرصت مت پوچھ — لنگرِ وحشتِ مجنوں ہے بیاباں میرا
بے دماغِ تپشِ رشک ہوں، اے جلوۂ حسن — تشنۂ خونِ دل و دیدہ ہے پیماں میرا
فہم، زنجیریِ بے ربطیِ دل ہے یارب! — کس زباں میں ہے لقب خوابِ پریشاں میرا
بہ ہوس دردِ سرِ اہلِ سلامت تا چند — مشکلِ عشق ہوں، مطلب نہیں آساں میرا
بوئے یوسف مجھے گلزار سے آتی تھی اسدؔ — دَے نے برباد کیا پیرہنستاں میرا

رخصتِ نالہ مجھے دے کہ مبادا ظالم
مطبوعہ
تیرے چہرے سے ہو ظاہر غمِ پنہاں میرا

شب کہ وہ مجلس فروزِ خلوتِ ناموس تھا — [۲] رشتۂ ہر شمع خارِ کسوتِ فانوس تھا
حاصلِ الفت نہ دیکھا جز شکستِ آرزو م — دل بہ دل پیوستہ گویا یک لبِ افسوس تھا
بت پرستی ہے بہارِ نقش بندیہائے دہر — ہر صریرِ خامہ میں یک نالۂ ناقوس تھا
[۳] غنچۂ خاطر نے رنگِ صد گلستاں گل کیا — گردۂ تصویرِ گلشن بیضۂ طاؤس تھا

---

۱ یہ شعر قلمی دیوان میں حاشیے پر بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

۲ متن میں یہ مصرعہ پہلے یوں تھا۔ "شمع سے یک خار در پیراہنِ فانوس تھا" پھر اس کی اس صورت میں اصلاح کی گئی۔

۳ متن میں اس شعر پر لا۔ لا لکھا ہے اور حاشیے پر اس کا ہم قافیہ یہ شعر لکھا ہے ؎

طبع کے واشد نے رنگِ یک گلستاں گل کیا — یہ دلِ وابستہ گویا بیضۂ طاؤس تھا

پُوچھ مت بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں
کیا کہوں بیماریِ غم کی فراغت کا بیاں ۲ — جو کہ کھایا خونِ دل بے منّتِ کیموس تھا

کل اسدؔ کو ہم نے دیکھا، گوشۂ غم خانہ میں — دست بر سر، سر بر زانوئے دلِ مایوس تھا

مشہدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا
مطبوعہ کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا

۲

خود[۱] آرا وحشتِ چشمِ پری سے شب وہ بدخو تھا — کہ موم آئینۂ تمثال کو تعویذِ بازو تھا

بہ شیرینیِ خواب آلودہ مژگاں نشترِ زنبور — خود آرائی سے آئینہ طلسمِ مومِ جادو تھا

نہیں ہے بازگشتِ سیلِ غیر از جانبِ دریا — ہمیشہ دیدۂ گریاں کو آبِ رفتہ در جو تھا

رہا نظارہ وقتِ بے نقابی ہا بخود لرزاں — سرشک آگیں مژہ سے دست از جاں شیشۂ ابرو تھا

غمِ مجنوں عزا دارانِ لیلیٰ کا پرستش گر — خمِ رنگِ سیاہ از حلقہ ہائے چشمِ آہو تھا

دکھا غفلت نے دُور افتادۂ ذوقِ فنا ورنہ — اشارت فہم کو ہر ناخنِ بریدہ ابرو تھا

اسدؔ خاکِ درِ مے خانہ اب سر پر اُڑاتا ہوں
گئے وہ دن کہ پانی جامِ مے کا تا بہ زانو تھا

دمیدن کے کمیں جُوں ریشۂ زیرِ زمیں پایا — بگردِ سرمہ اندازِ نگاہِ شرمگیں پایا

اُگے اِک پنبۂ روزن سے بھی چشمِ سفید آخر — حیا کو انتظارِ جلوہ ریزی کے کمیں پایا

بحسرت گاہِ نازِ کشتۂ جاں بخشیِ خوباں — خضر کو چشمۂ آبِ بقا سے تر جبیں پایا

---

[۱] یہاں سے ردیف ا کی وہ غزلیں شروع ہوئی ہیں جن کا ہم طرح کوئی شعر مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں ہے۔

پریشانی سے مغزِ سر ہوا ہے پنبۂ بالش
خیالِ شوخیٔ خوباں کو راحت آفریں پایا

نفس حیرت پرستِ طرزِ ناگیرائیٔ مژگاں
مگر یک دستِ دامانِ نگاہِ واپسیں پایا

اسدؔ کو پیچ تابِ طبعِ برقِ آہنگِ مسکن سے
حصارِ شعلۂ جوالہ میں عزلت گزیں پایا

نزاکت سے فسونِ دعوئِ طاقت شکستن ہا
شرارِ سنگ اندازِ چراغ از جسم خستن ہا

سیہ مستیِ چشمِ شوخ سے ہیں جوہرِ مژگاں
شرار آسا زِ سنگِ سرمہ یکسر بارِ جستن ہا

ہوا نے ابر سے کی موسمِ گل میں نمد بافی
کہ تھا آئینۂ خور بے نقابِ رنگ بستن ہا

دلِ از اضطراب آسودہ طاعت گاہِ داغ آیا
برنگِ شعلہ ہے مُہرِ نماز از پا نشستن ہا

تکلف عافیت میں ہے دلا بندِ قبا وا کر
نفس ہا بعدِ وصلِ دوست تاوانِ گسستن ہا

اسدؔ ہر اشک ہے یک حلقہ بر زنجیر افزودن[1]
بہ بندِ گریہ ہے نقشِ بر آب امیدِ رستن ہا

بسانِ جوہرِ آئینہ از ویرانیٔ دلہا
غبارِ کوچہ ہائے موج ہے خاشاکِ ساحل ہا

نگہ کی ہم نے پیدا رشتۂ ربطِ علائق سے
ہوئے ہیں پردہ ہائے چشمِ عبرت جلوہ حائل ہا

نہیں ہے باوجودِ ضعف سیرِ بیخودی آساں
رہِ خوابیدہ میں افگندنی ہے طرحِ منزل ہا

غریبی بہرِ تسکینِ ہوس درکار ہے ورنہ
بوہمِ زر گرہ میں باندھتے ہیں برق حاصل ہا

تماشا کردنی ہے انتظارِ آبادِ حیرانی!
نہیں غیر از نگہ جوں نرگستاں فرشِ محفل ہا

اسدؔ تارِ نفس ہے ناگزیرِ عقدہ پیرائی
بنوکِ ناخنِ شمشیر کیجے حلِ مشکل ہا

---

[1] ان نشان زدہ اشعار کے ساتھ صفحہ ۲۹ کی دوسری غزل کا پانچواں، چھٹا اور ساتواں شعر بھی قابلِ ملاحظہ ہیں۔ غالباً وہ اس غزل کے بعد لکھی ہے۔

[1]بشغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا — سرِ تارِ نظر ہے رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا
کرے گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے دل گردوں — نہ نکلے خشت مثلِ استخواں بیرونِ قالب ہا
عیادت ہائے طعن آلودِ یاراں زہرِ قاتل ہے — رفوئے زخم کرتی ہے بہ نوکِ نیشِ عقرب ہا
کرے ہے حسنِ خوباں پردہ میں مشّاطگی اپنی — کہ ہے تہ بندئ خطِ سبزۂ خط درتہ لب ہا
فنا کو عشق ہے بے مقصداں حیرت پرستاراں — نہیں رفتارِ عمرِ تیز رو پابندِ مطلب ہا

اسدؔ کو بت پرستی سے غرض درد آشنائی ہے
نہاں ہیں نالۂ ناقوس میں در پردہ یارب ہا

---

[2]بہ رہنِ شرم ہے با وصفِ شہرت اہتمام اس کا — نگیں میں جوں شرارِ سنگ ناپیدا ہے نام اس کا
سروکارِ تواضع تا خمِ گیسو رسانیدن — بسانِ شانہ زینت ریز ہے دستِ سلام اس کا
مسی آلودہ ہے مہرِ نوازش نامہ پیدا ہے — کہ داغِ آرزوئے بوسہ لایا ہے پیام اس کا
بہ امیدِ نگاہِ خاص ہوں محمل کشِ حسرت — مبادا ہو عناں گیرِ تغافل لطفِ عام اس کا
لڑاوے گر وہ بزمِ مے کشی میں قہر و شفقت کو — بھرے پیمانۂ صد زندگانی ایک جام اس کا

---

[1] اس غزل کے پہلے، دوسرے اور چوتھے شعر کے ساتھ غالب کی ایک فارسی غزل کے تین شعر قابلِ دید ہیں۔ کہتے ہیں:

بہ شغلِ انتظارِ مہوشاں در خلوتِ شب ہا — سرِ تارِ نفس شد رشتۂ تسبیحِ کوکب ہا
کند گر فکرِ تعمیرِ خرابی ہائے ما گردوں — نیاید خشت مثلِ استخواں بیروں ز قالب ہا
ندارد حسن در ہر حال از مشّاطگی غفلت — بود تہ بندی خطِ سبزۂ خط در تہ لب ہا

معلوم ہوتا ہے کہ ان اشعار کو اردو دیوان میں سے خارج کر دینے کے بعد غالب نے ان کو بجنسہ اپنے فارسی دیوان میں داخل کر لیا۔

[2] یہ تینوں شعر مولانا حسرت موہانی اور مولانا نظامی بدایونی کے شائع کردہ دیوانوں کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کے ضمن میں درج ہیں۔ عام دیوانوں میں اس غزل کا کوئی شعر نہیں تھا۔

اسدؔ سودائے سرسبزی سے ہے تسلیم رنگیں تر
کہ کشتِ خشک اُس کا ابرِ بے پروا خرام اُس کا

یاد روزے کہ نفس در گرہِ[۱] یارب تھا — نالۂ دل بہ کمر دامنِ قطعِ شب تھا
بہ تحیر کدۂ فرصتِ آرائشِ وصل — دلِ شب آئینۂ وارِ تپشِ کوکب تھا
بہ تمنا کدۂ حسرتِ ذوقِ دیدار — دیدہ گو خوں ہو تماشائے چمن مطلب تھا
جوہرِ فکر پرافشانیٔ نیرنگِ خیال — حسن آئینہ و آئینہ چمن مشرب تھا
پردۂ دردِ دل آئینۂ صد رنگِ نشاط — بخیۂ زخمِ جگر خندۂ زیرِ لب تھا
نالہ ہا حاصلِ اندیشہ کہ جوں کشتِ سپند — دلِ ناسوختہ آتش کدۂ صد تب تھا
عشق میں[۲] ہم نے ہی ابرام سے پرہیز کیا — ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا سب تھا
آخرِ کار گرفتارِ سرِ زلف ہوا — دلِ دیوانہ کہ وارستۂ ہر مذہب تھا

شوق سامانِ فضولی ہے وگرنہ غالبؔ
ہم میں سرمایۂ ایجادِ تمنا کب تھا

رات دل گرمِ خیالِ جلوۂ جانانہ تھا — رنگِ روئے شمع برقِ خرمنِ پروانہ تھا
شب کہ تھی کیفیتِ محفل بیادِ روئے یار — ہر نظر داغِ مے خالی لبِ پیمانہ تھا

---

۱ حاشیے پر "در گرہ" کی جگہ "سلسلہ" بنایا ہے۔

۲ یہ آخری تین شعر بھی دیوان کے حاشیے پر درج ہیں اور غالباً نظرِ ثانی کے وقت شاعر نے بڑھائے ہیں۔ متن میں مقطع یوں تھا:

باب ابرام نہ تھا دل ہی ہمارا غالبؔ — ورنہ جو چاہیے اسبابِ تمنا سب تھا

مگر اس پر لا لکھ کر اس کی یہ اصلاح کی ہے۔

شب کہ باندھا خواب میں آنے کا غافل نے خیال
وہ فسونِ وعدہ میرے واسطے افسانہ تھا

دود[1] کو آج اس کے ماتم میں سیہ پوشی ہوئی
وہ دلِ سوزاں کہ کل تک شمعِ ماتم خانہ تھا

ساتھ جنبش کے بیک بر خاستن طے ہو گیا
تو کہے صحرا غبارِ دامنِ دیوانہ تھا

دیکھ اس کے ساعدِ سیمیں و دستِ پُر نگار
شاخِ گل جلتی تھی مثلِ شمع گل پروانہ تھا

اے اسد رویا جو دشتِ غم میں میں حیرت زدہ
آئنہ خانہ ہجومِ اشک سے ویرانہ تھا

بسکہ جوشِ گریہ سے زیر و زبر ویرانہ تھا
چاکِ موجِ سیل تا پیراہنِ دیوانہ تھا

داغِ مہرِ ضبطِ بے جا مستیِ ہستی پسند
دودِ مجمر لالہ ساں دُردِ تہِ پیمانہ تھا

وصل میں بختِ رسا نے سنبلستانِ گل کیا
رنگِ شب تہ بندیِ دودِ چراغِ خانہ تھا

شب تری تاثیرِ سحرِ شعلۂ آواز سے
تارِ شمع آہنگِ مضرابِ پرِ پروانہ تھا

موسمِ گل میں تھے گلگونِ حلالِ مے کشاں
عقدِ وصلِ دخترِ رز انگور کا ہر دانہ تھا

انتظارِ جلوۂ کاکل میں ہر شمشادِ باغ
صورتِ مژگانِ عاشق صرفِ عرضِ شانہ تھا

حیرت اپنی نالۂ بے درد سے غفلت بنی
دامِ خوابیدہ کو غوغا نے جرس افسانہ تھا

گو بوقتِ قتل حقِ آشنائی اے نگاہ
خنجرِ زہر آب دادہ سبزۂ بیگانہ تھا

---

[1] یہ شعر دیوانِ غالب مطبوعہ مطبع نظامی بدایونی کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کے ضمن میں درج ہے اور اس کے ساتھ ایک شعر یہ بھی لکھا ہوا ہے جو قلمی دیوان میں نہیں ہے۔

شکوۂ یاراں غبارِ دل میں پنہاں کر دیا
غالب ایسے گنج کو شایاں یہی ویرانہ تھا

[2] متن میں یہ شعر پہلے یوں لکھا گیا تھا۔

انتظارِ زلف میں شمشاد ہمہ سمت چار
نقش بندِ شکلِ مژگاں از نمودِ شانہ تھا

جوشِ بے کیفیتی ہے اضطراب آرا اسدؔ
ورنہ بسمل کا تڑپنا[1] لغزشِ مستانہ تھا

کرے گر حیرتِ نظارہ طوفاں نکتہ گوئی کا
حبابِ چشمۂ آئینہ ہووے بیضہ طوطی کا

بروئے قیس دستِ شرم ہے مژگانِ آہو سے
مگر ردِّ عروسی گم ہوا تھا شانہ لیلی کا

فسانِ تیغِ نازک قاتلاں سنگِ جراحت ہے
دلِ گرمِ تپش قاصد ہے پیغامِ تسلی کا

نہیں گرداب جز سرگشتگی ہائے طلب ہرگز
حبابِ بحر کے ہے آبلوں میں خارِ ماہی کا

نیازِ جلوہ ریزی طاقتِ بالیں شکستن ہا
تکلف کو خیال آیا ہو گر بیمار پرسی کا

نہ بخشی فرصتِ یک شبنمستاں جلوۂ خور نے
تصور نے کیا ساماں ہزار آئینہ بندی کا

اسدؔ تاثیرِ صافی ہائے حیرت جلوہ پرور ہو
گر آبِ چشمۂ آئینہ ہووے عکس زنگی کا

یک گام بے خودی سے لوٹیں بہارِ صحرا
آغوشِ نقشِ پا میں کیجے فشارِ صحرا

وحشت اگر رسا ہے، بے حاصلی ادا ہے
پیمانۂ ہوا ہے مشتِ غبارِ صحرا

اے آبلہ کرم کر، یاں رنجہ اک قدم کر
اے نورِ چشمِ وحشت، اے یادگارِ صحرا

دل در رکابِ صحرا، خانہ خرابِ صحرا
موجِ سرابِ صحرا، عرضِ خمارِ صحرا

ہر ذرہ یک دلِ پاک، آئینہ خانۂ خاک
تمثالِ شوقِ بیباک، صد جا دوچارِ صحرا

دیوانگی اسدؔ کی حسرت کشِ طرب ہے
در سر ہوائے گلشن، در دل غبارِ صحرا

---

[1] متن میں پہلے اس جگہ "طپیدن" تھا پھر اسے کاٹ کر "تڑپنا" بنایا گیا۔

وحشیِ بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا
رشتۂ چاکِ جیبِ دریدہ صرفِ قماشِ دام کیا

عکسِ رخِ افروختہ تھا تصویر بہ پشتِ آئینہ
شوخ نے وقتِ حسن طرازی تمکیں سے آرام کیا

ساقی نے از بہرِ گریباں چاکی موجِ بادۂ ناب
تارِ نگاہِ سوزنِ مینا رشتۂ خطِ جام کیا

مہر بجائے نامہ لگائی بر لبِ پیکِ نامہ رساں
قاتلِ تمکیں سنج نے یوں خاموشی کا پیغام کیا

شامِ فراقِ یار میں جوشِ خیرہ سری سے ہم نے اسدؔ
ماہ کو در تسبیحِ کواکب جائے نشینِ امام کیا

کیا کس شوخ نے ناز از سرِ تمکیں نشستن کا
کہ شاخِ گل کا خم انداز ہے بالیں شکستن کا

نہاں ہے مردمک میں شوقِ رخسارِ فروزاں سے
سپندِ شعلۂ نادیدہ صفت انداز جستن کا

گدازِ دل کو کرتی ہے کشودِ چشمِ شب بیما
نمک ہے شمع میں خوں موم جادۂ خواب بستن کا

نفس در سینہ ہائے ہم دگر رہتا ہے پیوستہ
نہیں ہے رشتۂ الفت کو اندیشہ گسستن کا

ہوا نے ابر سے کی موسمِ گل میں نمد بافی
کہ تھا آئینۂ خور پر تصور رنگ بستن کا

تکلف عافیت میں ہے دلا بندِ قبا وا کر
نفس بعد از وصالِ دوست تاواں ہے گسستن کا

ہر اشکِ چشم سے یک حلقۂ زنجیر بڑھتا ہے
بہ بندِ گریہ ہے نقشِ بر آب اندیشہ رفتن کا

عیادت سے اسدؔ میں بیشتر بیمار رہتا ہوں
سبب ہے ناخنِ دخلِ عزیزاں سینہ خستن کا

شب کہ دلِ زخمیِ عرضِ دو جہاں تیر آیا
نالہ بر خود غلطِ شوخیِ تاثیر آیا

وسعتِ جیبِ جنونِ تپشِ دل مت پوچھ
محملِ دشت بدوشِ رمِ نخچیر آیا

ہے گرفتاریِ نیرنگِ تماشا ہستی
پرِ طاؤس سے دل پائے بہ زنجیر آیا

ل یہ اور اس کے بعد کے دو شعر متن میں نہیں ہیں بلکہ بعد میں حاشیے پر بڑھائے گئے ہیں (ملاحظہ ہو حاشیہ ۲۴۲ و ۲۴۴)

دید حیرت کش و خورشید چراغانِ خیال — عرضِ شبنم سے چمن آئینہ تعمیر آیا
عشق تو سابچہ و نازِ شہادت مت پوچھ — کہ کلہ گوشہ بہ پروازِ پرِ تیر آیا

اے خوشا ذوقِ تمنائے شہادت کہ اسدؔ
بے تکلف بہ سجودِ خمِ شمشیر آیا

سیرِ آں سوئے تماشا ہے طلب گاروں کا — خضر مشتاق ہے اس دشت کے آواروں کا
سرخطِ بندہ ہوا نامہ گنہگاروں کا — خونِ ہدہد سے لکھا نقشِ گرفتاروں کا
فردِ آئینہ میں بخشیں شکنِ خندۂ گل — دلِ آزردہ پسند آئینہ رخساروں کا
دادخواہِ تپش و مُہرِ خموشی بر لب — کاغذِ سرمہ ہے جامہ ترے بیماروں کا
وحشتِ نالہ بہ واماندگیِ وحشت ہے — جرسِ قافلہ یاں دل ہے گرانباروں کا
پھر وہ سوئے چمن آتا ہے خدا خیر کرے — رنگ اُڑتا ہے گلستاں کے ہواداروں کا
جلوہ مایوس نہیں دل نگرانیِ غافل — چشمِ اُمید ہے روزن تری دیواروں کا

اسدؔ اے ہرزہ درا نالہ بہ غوغا تا چند
حوصلہ تنگ نہ کر بے سبب آزاروں کا

عیادت سے زبس ٹوٹا ہے دل یارانِ غمگیں کا — نظر آتا ہے موئے شیشہ رشتہ شمعِ بالیں کا
صدا ہے کوہ میں حشر آفریں اے غفلت اندیشاں — پئے سنجیدنِ یاراں ہو حاصل خوابِ سنگیں کا
بجائے غنچہ و گل ہے ہجومِ خار و خس یاں تک — کہ صرفِ بخیۂ دامن ہوا ہے خندہ گلچیں کا

؎ یہ شعر دیوانِ غالب شائع کردہ مولانا حسرت موہانی اور دیوانِ غالب مطبوعہ مطبع نظامی بدایونی کی طبعِ ثانی کے آخر میں غالب کے غیر مروجہ اشعار کی ضمن میں شائع کیا گیا ہے۔

نصیبِ آستیں ہے حاصلِ روئے عرق آگیں
چُنے ہے کہکشاں خرمن سے مہ کے خوشہ چیں کا

بوقتِ کعبہ جوئیہا جرس کرتا ہے ناقوسی
کہ صحرا فصلِ گل میں رشک ہے بت خانۂ چیں کا

تپیدن دل کو سوزِ عشق میں خوابِ فراش ہے
رکھا اسپند نے مجمر میں پہلو گرمِ تمکیں کا

اسدؔ اربابِ فطرت قدر دانِ لفظ و معنی ہیں
سخن کا بندہ ہوں لیکن نہیں مشتاق تحسیں کا

وردِ اسمِ حق سے دیدارِ صنم حاصل ہوا
رشتۂ تسبیح تارِ جادۂ منزل ہوا

محتسب سے تنگ ہے از بسکہ کارِ مے کشاں
رز میں جو انگور نکلا عقدۂ مشکل ہوا

قیس نے از بسکہ کی سیرِ گریبانِ نفس
یک وچیں دامانِ صحرا پردۂ محمل ہوا

وقتِ شب اُس شمع رو کے شعلۂ آواز پر
گوشِ نسریں عارضاں پروانۂ محفل ہوا

عیب کا دریافت کرنا ہے ہنرمندی اسدؔ
نقص پر اپنے ہوا جو مطلع کامل ہوا

ہے تنگ ز واماندہ شدن حوصلۂ پا
جو اشک گرا خاک میں ہے آبلۂ پا

سرمنزلِ ہستی سے ہے صحرائے طلب دور
جو خط ہے کفِ پا پہ سو ہے سلسلۂ پا

دیدار طلب ہے دلِ واماندہ کہ آخر
نوکِ سرِ مژگاں سے رقم ہو گلۂ پا

آیا نہ بیابانِ طلب کام زباں تک
تبخالۂ لب ہو نہ سکا آبلۂ پا

فریاد سے پیدا ہے اسدؔ گرمیِ وحشت
تبخالۂ لب ہے جرسِ آبلۂ پا

لہ متن میں یہ مصرع پہلے یوں لکھا تھا: "اسدؔ طرز آشنایاں قدر دانِ نکتہ سنجی ہیں" پھر اسے بہ طرزِ بالا بدل دیا

بسکہ عاجز نارسائی سے کبوتر ہو گیا — صفحۂ نامہ غلافِ بالشِ پر ہو گیا
صورتِ دیبا، تپش سے میری غرقِ خوں ہے آج — خارِ پیراہن رگِ بستر کو نشتر ہو گیا
بسکہ آئینے نے پایا گرمیِ رخ سے گداز — دامنِ تمثال مثلِ برگِ گل تر ہو گیا
شعلہ رخسارا تحیر سے تری رفتار کے — خارِ شمعِ آئینہ، آتش میں جوہر ہو گیا
بسکہ وقتِ گریہ نکلا تیرہ کاری کا غبار — دامنِ آلودۂ عصیاں گراں تر ہو گیا

حیرتِ اندازِ رہبر ہے عناں گیر اے اسد
نقشِ پائے خضر یاں سدِ سکندر ہو گیا

گرفتاری میں فرمانِ خطِ تقدیر ہے پیدا — کہ طوقِ قمری از ہر حلقۂ زنجیر ہے پیدا
زمیں کو صفحۂ گلشن بنایا خوں چکانی نے — چمن بالیدنی ہا از دمِ نخچیر ہے پیدا
نگر وہ شوخ ہے طوفاں طرازِ شوقِ خونریزی — کہ در بحرِ کماں بالیدہ موجِ تیر ہے پیدا
نہیں ہے کف، لبِ نازک پہ، فرطِ نشۂ مے سے — لطافت ہائے جوشِ حسن کا سرشیر ہے پیدا
عروجِ ناامیدی چشم زخمِ چرخ کیا جانے — بہارِ بے خزاں از آہِ بے تاثیر ہے پیدا

اسد جس شوق سے فرطِ تپش فرسا ہوں وزاں میں
جراحت ہائے دل سے جوہرِ شمشیر ہے پیدا

بہ مُہرِ نامہ جو بوسۂ گلِ پیام رہا — ہمارا کام ہوا اور تمھارا نام ہوا[1]
ہوا نہ مجھ سے بجز دردِ حاصلِ صیاد — بسانِ اشک گرفتارِ چشمِ دام رہا

---

[1] متن میں یہ مصرع یونہی درج ہے۔ لیکن اس غزل کی ردیف کی رعایت آخر میں 'رہا' کی متقاضی ہے اس لیے شاید یہ مصرع یوں ہو کہ: "ہمارا کام ہوا اور تمھارا نام رہا"۔

دل و جگر تفِ فرقت سے جل کے خاک ہوئے
ولے ہنوز خیالِ وصال خام رہا

شکستِ رنگ کی لائی سحر شبِ سنبل
پہ زلفِ یار کا افسانہ ناتمام رہا

وہانِ تنگ مجھے کس کا یاد آیا تھا
کہ شب خیال میں بوسوں کا ازدحام رہا

نہ پوچھ حال شب و روزِ ہجر کا غالب
خیالِ زلف و رُخِ دوست صبح و شام رہا

سحر گر باغ میں وہ حیرتِ گلزار ہو پیدا
اُڑے رنگِ گل اور آئینۂ دیوار ہو پیدا

بتاں! زہر آب اس شدت سے دو پیکانِ ناوک کو
کہ خطِ سبز تا پشتِ لبِ سوفار ہو پیدا

لگے گر سنگ سر پر یار کے دستِ نگاریں سے
بجائے زخم، گل بر گوشۂ دستار ہو پیدا

کروں گر عرضِ سنگینیِ کہسار اپنی بیتابی
رگِ ہر سنگ سے نبضِ دلِ بیمار ہو پیدا

بسنگِ تیشہ توڑوں ساقیا پیمانۂ پیماں
اگر ابرِ سیہ مست از سوئے کہسار ہو پیدا

اسد مایوس مت ہو، گرچہ رونے میں اثر کم ہے
کہ غالب ہے کہ بعد از زاریِ بسیار ہو پیدا

---

(۲۱)

دھمکی میں[1] مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اُڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

دل تا جگر کہ ساحلِ دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

---

[1] یہاں سے ردیف دال کی وہ غزلیں شروع ہوتی ہیں جن کا ہم طرح کوئی شعر قلمی دیوان میں موجود نہیں ہے۔

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہِ عشق کی؟ ‏ دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا
احباب چارہ سازیِ وحشت نہ کر سکے ‏ زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا ‏ وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاقِ نسیاں کا
بیاں کیا کیجیے بیدادِ کاوش ہائے مژگاں کا ‏ کہ ہر اک قطرۂ خوں دانہ ہے تسبیحِ مرجاں کا
نہ آئی سطوتِ قاتل بھی مانع میرے نالوں کو ‏ لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا
دکھاؤں گا تماشا، دی اگر فرصت زمانے نے ‏ مرا ہر داغِ دل، اک تخم ہے سروِ چراغاں کا
کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے ‏ کرے جو پرتوِ خورشید عالم شبنمستاں کا
مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ‏ ہیولیٰ برقِ خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا
اُگا ہے گھر میں ہر سُو سبزہ، ویرانی تماشا کر ‏ مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا
خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں ‏ چراغِ مردہ ہوں میں بے زباں گورِ غریباں کا
ہنوز اک پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے ‏ دلِ افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا
بغل میں غیر کے آج آپ سوتے ہیں کہیں ورنہ ‏ سبب کیا؟ خواب میں آکر تبسم ہائے پنہاں کا
نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہو گا ‏ قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا ‏ یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
رنگِ شکستہ صبحِ بہارِ نظارہ ہے ‏ یہ وقت ہے شگفتنِ گلہائے ناز کا

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز
میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

صرفہ ہے ضبطِ آہ میں میرا، وگرنہ میں
طعمہ ہوں، ایک ہی نفسِ جاں گداز کا

ہیں بسکہ جوشِ بادہ سے شیشے اچھل رہے
ہر گوشۂ بساط ہے سر شیشہ باز کا

کاوش کا دل کرے ہے تقاضا کہ ہے ہنوز
ناخن پہ قرض اس گرہِ نیم باز کا

تاراجِ کاوشِ غمِ ہجراں ہوا اسدؔ
سینہ کہ تھا دفینہ گہر ہائے راز کا

بزمِ شاہنشاہ میں اشعار کا دفتر کھلا
رکھیو یارب یہ درِ گنجینۂ گوہر کھلا

شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اِس تکلف سے کہ گویا بُت کدہ کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں خنجر کھلا

گو نہ سمجھوں اُس کی باتیں، گر نہ پاؤں اُس کا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا

ہے خیالِ حسن میں حُسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

مُنہ نہ کھلنے پر ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں
زُلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

در پہ رہنے کو کہا اور کہہ کے کیسا پھر گیا
جتنے عرصہ میں مرا لپٹا ہوا بستر کھلا

کیوں اندھیری ہے شبِ غم، ہے بلاؤں کا نزول
آج اُدھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا

کیا رہوں غربت میں خوش، جب ہو حوادث کا یہ حال
نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا

اُس کی اُمت میں ہوں میں، میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبدِ بے در کھلا

دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا؟
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا؟

بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک
ہم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرمائیں گے 'کیا'

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا؟
آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا؟
گر کیا ناصح نے ہم کو قید اچھا، یوں سہی
یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا؟
خانہ زادِ زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں؟
ہیں گرفتارِ بلا زنداں سے گھبرائیں گے کیا؟

ہے اب اس معمورہ میں قحطِ غمِ الفت اسدؔ
ہم نے یہ مانا کہ دہلی میں رہیں، کھائیں گے کیا؟

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا
اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا
ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا؟
تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تُو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا
کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو
یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا؟
یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح؟
کوئی چارہ ساز ہوتا، کوئی غمگسار ہوتا
رگِ سنگ سے ٹپکتا وہ لہو کہ پھر نہ تھمتا
جسے غم سمجھ رہے ہو، یہ اگر شرار ہوتا
غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غمِ عشق گر نہ ہوتا، غمِ روزگار ہوتا
کہوں کس سے میں کہ کیا ہے، شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا
ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرقِ دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا، نہ کہیں مزار ہوتا
اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

تجاہلِ پیشگی سے مدعا کیا؟
کہاں تک اے سراپا ناز" کیا کیا"

نوازش ہائے بے جا دیکھتا ہوں
شکایت ہائے رنگیں کا گِلا کیا؟

نگاہِ بے محابا چاہتا ہوں
تغافل ہائے تمکیں آزما کیا

فروغِ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاسِ ناموسِ وفا کیا

نفس موجِ محیطِ بے خودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گِلا کیا

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر
ہم اُس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

محابا کیا ہے؟ میں ضامن اِدھر دیکھ
شہیدانِ نگہ کا خوں بہا کیا

سُن اے غارت گرِ جنسِ وفا، سُن
شکستِ شیشۂ دل کی صدا کیا

کیا کِس نے جگرداری کا دعویٰ؟
شکیبِ خاطرِ عاشق بھلا کیا

یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں؟
یہ کافر فتنۂ طاقت رُبا کیا

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

درخورِ قہر و غضب، جب کوئی ہم سا نہ ہُوا
پھر غلط کیا ہے کہ ہم سا کوئی پیدا نہ ہُوا

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہُوا

سب کو مقبول ہے دعویٰ تری یکتائی کا
روبرو کوئی بُتِ آئینہ سیما نہ ہُوا

کم نہیں نازشِ ہمنامیِ چشمِ خوباں
تیرا بیمار، بُرا کیا ہے؟ گر اچھا نہ ہُوا

سینے کا داغ ہے وہ نالہ کہ لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہُوا

نام کا میرے ہے جو دُکھ کہ کسی کو نہ ملا
کام میں میرے ہے وہ فتنہ کہ برپا نہ ہُوا

ہر بُنِ مُو سے دمِ ذکر نہ ٹپکے خونناب
حمزہ کا قصہ ہُوا عشق کا چرچا نہ ہُوا

قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے اور جزو میں کُل　　کھیل لڑکوں کا ہوا دیدۂ بینا نہ ہوا

تھی خبر گرم کہ غالبؔ کے اُڑیں گے پُرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے پہ تماشا نہ ہوا

درد منت کشِ دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا، بُرا نہ ہوا
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو؟　　اک تماشا ہوا، گلا نہ ہوا
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں!　　تُو ہی جب خنجر آزما نہ ہوا
کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب　　گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
ہے خبر گرم اُن کے آنے کی　　آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی؟　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا
جان دی، دی ہوئی اُسی کی تھی　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
زخم گر دب گیا، لہو نہ تھما　　کام گر رک گیا روا نہ ہوا
رہزنی ہے کہ دلستانی ہے　　لے کے دل دلستاں روانہ ہوا

کچھ تو پڑھیے کہ لوگ کہتے ہیں
آج غالبؔ غزل سرا نہ ہوا

میں اور بزمِ مے سے، یوں تشنہ کام آؤں　　گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ہوا تھا!
ہے ایک تیر جس میں دونوں چھدے پڑے ہیں　　وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

درماندگی میں غالبؔ کچھ بن پڑے تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

گھر ہمارا، جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر، گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا
تنگیِ دل کا گلہ کیا، یہ وہ کافر دل ہے — کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا

بعد یک عمرِ وَرَع، بار تو دیتا بارے
کاش رضواں ہی درِ یار کا درباں ہوتا

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا — ڈبویا مجھ کو ہونے نے، نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا
ہوا جب غم سے یوں بے حس تو غم کیا سر کے کٹنے کا — نہ ہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ہوتا

ہوئی مدت کہ غالب مر گیا، پر یاد آتا ہے
وہ ہر اک بات پر کہنا کہ "یوں ہوتا تو کیا ہوتا"

ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا
تم سے بے جا ہے مجھے اپنی تباہی کا گلہ — اس میں کچھ شائبۂ خوبیِ تقدیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں — کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد — ہاں کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا — بات کرتے، کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی — گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا
دیکھ کر غیر کو ہو کیوں نہ کلیجہ ٹھنڈا — نالہ کرتا تھا، ولے طالبِ تاثیر بھی تھا
پیشے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام — ہم ہی آشفتہ سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی — آخر اُس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق — آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا
ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب — کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ذکر اُس پری وش کا، اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر، تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے، بزمِ غیر میں یارب
آج ہی ہُوا منظور، اُن کو امتحاں اپنا

منظر اک بلندی پر، اور ہم بنا سکتے
عرش سے پرے ہوتا، کاشکے مکاں اپنا

دے وہ جس قدر ذلّت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے
بارے آشنا نکلا اُن کا پاسباں اپنا

دردِ دل لکھوں کب تک، جاؤں اُن کو دکھلادوں
اُنگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا، آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا

تا کرے نہ غمّازی، کر لیا ہے دشمن کو
دوست کی شکایت میں، ہم نے ہم زباں اپنا

ہم کہاں کے دانا تھے، کس ہنر میں یکتا تھے
بے سبب ہُوا غالبؔ! دشمن آسماں اپنا

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا
کہتے ہیں: "ہم تجھ کو مُنہ دکھلائیں کیا"

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ
جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ؟
یا رب اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا؟

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا

عمر بھر دیکھا کیے مرنے کی راہ
مر گئے پر، دیکھیے دکھلائیں کیا

پُوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے؟
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

تجھ سے قسمت میں مری صورتِ قفلِ ابجد
تھا لکھا بات کے بنتے ہی جُدا ہو جانا

دل ہُوا کشمکشِ چارۂ زحمت میں تمام
مٹ گیا گھسنے میں، اِس عقدہ کا وا ہو جانا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم، اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

دِل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کُھلنا
روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

گر نہیں نکہتِ گُل کو ترے کُوچے کی ہوس؟
کیوں ہے گردِ رہِ جولانِ صبا ہو جانا

تا کہ تجھ پر کُھلے اعجازِ ہوائے صیقل
دیکھ برسات میں سبز آئینہ کا ہو جانا

بخشے ہے جلوۂ گُل ذوقِ تماشا غالبؔ
چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

ردیف "ب"[1]

بس کہ ہے میخانہ ویراں جوں بیابانِ خراب قلمی
عکسِ چشمِ آہوئے رمخوردہ ہے داغِ شراب

تیرگیِ ظاہری ہے طبعِ موزوں کا نشاں
غافلاں عکسِ سوادِ صفحہ ہے گردِ کتاب

یک نگاہِ صاف صد آئینۂ تاثیر ہے
ہے رگِ یاقوت عکسِ خطِ جامِ آفتاب

ہے عرق افشاں مِسّی سے ادہمِ مشکینِ یار
وقتِ شب اختر کنی ہے چشمِ بیدارِ رکاب

ہے شفق سوزِ جگر کی آگ کی بالیدگی
ہر یک اختر ہے فلک پر قطرۂ اشکِ کباب

بسکہ شرمِ عارضِ رنگیں سے حیرت جلوہ ہے
ہے شکستِ رنگِ گُل آئینہ پردازِ نقاب

---

[1] اس ردیف کی غزلوں میں قلمی اور مروّجہ دیوانوں میں بالکل اشتراک نہیں ہے۔ البتہ پوری مروجہ غزل "پھر ہوا وقت کہ ہو بال کُشا موجِ شراب" قلمی نسخے کے حاشیے پر غالباً غالبؔ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی موجود ہے۔

شب کہ تھا نظارگی روئے بتاں کا اے اسدؔ
گر گیا بامِ فلک سے صبح طشتِ ماہتاب

ہے بہاراں میں خزاں پرور خیالِ عندلیب
رنگِ گل آتشکدہ ہے زیرِ بالِ عندلیب

عشق کو ہر رنگ شانِ حُسن ہے مدِّ نظر
مصرعِ سروِ چمن ہے حسبِ حالِ عندلیب

حیرتِ حُسنِ چمن پیرا ہے تیرے رنگِ گل
بسملِ ذوقِ [1] پریدن ہے یہ بالِ عندلیب

عُمر میری ہو گئی صرفِ بہارِ حُسنِ یار
گردشِ رنگِ چمن ہے ماہ و سالِ عندلیب

منع مت کر حُسن کی ہم کو پرستش سے کہ ہے
بادۂ نظارۂ گلشن حلالِ عندلیب

ہے مگر موقوف بر وقتِ دگر کارِ اسدؔ
اے شبِ پروانہ و روزِ [2] وصالِ عندلیب

پھر ہُوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

پُوچھ مت ۔ وجہ سیہ مستیِ اربابِ چمن
سایۂ تاک میں ہوتی ہے ہوا موجِ شراب

جو ہوا غرقۂ مے بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی ہے بالِ ہما موجِ شراب

ہے یہ برسات وہ موسم کہ عجب کیا ہے اگر
موجِ ہستی کو کرے فیضِ ہوا موجِ شراب

چار موج اُٹھتی ہے طوفانِ طرب سے ہر سُو
موجِ گل، موجِ شفق، موجِ صبا، موجِ شراب

جس قدر رُوح بناتی ہے جگر تشنۂ ناز
دے ہے تسکیں بہ دمِ آبِ بقا موجِ شراب

بسکہ دوڑے ہے رگِ تاک میں خوں ہو ہو کر
شہپرِ رنگ سے ہے بال کشا موجِ شراب

---

[1] متن میں پہلے "آہنگ" تھا اسے کاٹ کر "ذوق" بنایا ہے۔

[2] متن میں پہلے 'صبح' تھا۔ اس کی جگہ 'روز' بنایا ہے۔

موجۂ گل سے چراغاں ہے گزرگاہِ خیال — ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب
نشّہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ — بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب
ایک عالم پہ ہے طوفانیِ کیفیتِ فصل — موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب
شرحِ ہنگامۂ ہستی ہے، زہے موسمِ گل — ہے تصوّر میں زبس جلوہ نما موجِ شراب

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوۂ گل دیکھ اسدؔ
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب

ردیف "ت"

جاتا ہوں[1] جدھر، سب کی اٹھی ہے اُدھر انگشت — الحق — یکدست جہاں مجھ سے پھرا ہے مگر انگشت
مژگاں کی محبت میں جو انگشت نما ہوں — م — لگتی ہے مجھے تیر کے مانند، ہر انگشت
ہر غنچۂ گل صورتِ یک قطرۂ خوں ہے — م — دیکھا ہے[2] کسی کا جو حنا بستہ سر انگشت
گرمی ہے زباں کی سببِ سوختنِ جاں — ہے شمع، شہادت کے لئے سربسر انگشت
خوں[3] دل میں جو میرے نہیں باقی تو عجب کیا — م — جوں ماہیِ بے آب تڑپتی ہے ہر انگشت
شوخی تری کہہ دیتی ہے احوال ہمارا — رازِ دلِ صد پارہ کی ہے پردہ در انگشت
کس رتبہ میں باریکی و نرمی ہے کہ جوں گل — آتی نہیں پنجے میں بس اس کے نظر انگشت

---

[1] یہ شعر مولانا حسرت موہانی کے شائع کردہ دیوانِ غالب کے آخر میں غیر مروّجہ اشعار کی ضمن میں لکھا ہوا ہے۔

[2] متن میں پہلے یہ مصرع یوں تھا: "خوباں کا جو دیکھا ہے حنا بستہ سر انگشت"

[3] مقطع سے پہلے یہ تین شعر متن میں نہیں تھے۔ حاشیے پر غالباً غالب کے قلم سے لکھے گئے ہیں اور انھیں کے ساتھ اس خط میں وہ دونوں شعر بھی درج ہیں جو عام طور پر دیوانوں میں پائے جاتے ہیں اور جن کو ہم نے مقطع کے بعد لکھا ہے

لکھتا ہوں اسدؔ سوزشِ دل سے سخنِ گرم
تا رکھ نہ سکے کوئی مرے حرف پر انگشت

افسوس کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے مطبوعہ جن لوگوں کے تھے درخورِ عقدِ گہر انگشت
کافی ہے نشانی تری، چھلّے کا نہ دینا
خالی مجھے دکھلا کے بوقتِ سفر انگشت

نیم رنگی جلوہ ہے بزمِ تجلّی زارِ دوست
آمدِ خط سے ہوا ہے سرد جو بازارِ دوست } قلمی دودِ شمعِ کشتہ تھا شاید خطِ رخسارِ دوست
چشمِ بندِ خلق جز تمثالِ خود بینی نہیں — آئینہ ہے قالبِ خشتِ در و دیوارِ دوست
برقِ خرمن زارِ گوہر ہے نگاہِ تیز یاں — اشک ہو جاتے ہیں خشک از گرمیِ رفتارِ دوست
ہے سوا نیزے پہ اس کے قامتِ نوخیز سے — آفتابِ صبحِ محشر ہے گلِ دستارِ دوست
اے عدوئے مصلحت چندے بہ ضبط افسردہ رہ — کردنی ہے جمع تابِ شوخیِ دیدارِ دوست
لغزشِ مستانہ و جوشِ تماشا ہے اسدؔ
آتشِ مے سے بہارِ گرمیِ بازارِ دوست

اے دلِ ناعاقبت اندیش ضبطِ شوق کر مطبوعہ کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست
خانہ ویراں سازیِ حیرت تماشا کیجیے — صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست
عشق میں بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے — کشتۂ دشمن ہوں آخر گرچہ تھا بیمارِ دوست
چشمِ ما روشن کہ اس بیدرد کا دل شاد ہے — دیدۂ پُرخوں ہمارا ساغرِ سرشارِ دوست
غیر یوں کرتا ہے پرسش مجھ سے اس کے ہجر میں — بے تکلف دوست ہو جیسے کوئی غمخوارِ دوست

تا کہ میں جانوں کہ ہے اُس کی رسائی واں تلک — مجھ کو دیتا ہے پیامِ وعدۂ دیدارِ دوست

جبکہ میں کرتا ہوں اپنا شکوۂ ضعفِ دماغ — سر کرے ہے وہ حدیثِ زلفِ عنبر بارِ دوست

چُپکے چُپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر — ہنس کے کرتا ہے بیانِ شوخیٔ گفتارِ دوست

مہربانی ہائے دشمن کی شکایت کیجیے؟ — یا بیاں کیجے سپاسِ لذّتِ آزارِ دوست

یہ غزل اپنی مجھے جی سے پسند آئی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں غالبؔ ز بس تکرارِ دوست

رہا گر کوئی تا قیامت سلامت — م قلمی — پھر اک روز مرنا ہے حضرت سلامت

جگر کو مرے عشقِ خوں نابہ مشرب — م — لکھے ہے خداوندِ نعمت سلامت

دو عالم کی ہستی پہ خطِ وفا کھینچ — دل و دستِ اربابِ ہمت سلامت

علی الرغمِ دشمن، شہیدِ وفا ہوں — م — مبارک مبارک سلامت سلامت

نہیں گر بہ کامِ دلِ خستہ گردوں — جگر خوایِ جوشِ حسرت سلامت

نہیں گر سر و برگِ سودائے معنی
نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی — م — تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

نہ اوروں کی سنتا، نہ کہتا ہوں اپنی — سرِ خستہ دُشوارِ وحشت سلامت

وفورِ بلا ہے، ہجومِ وفا ہے — سلامت ملامت، ملامت سلامت

نہ فکرِ سلامت، نہ بیمِ ملامت — ز خود رفتگی ہائے حیرت سلامت

رہے غالبِؔ خستہ مغلوبِ گردوں
یہ کیا بے نیازی ہے حضرت سلامت

لہ یہ پوری غزل جس کے چار شعر عام طور پر متداول ہیں، قلمی نسخے کے حاشیے پر غالباً غالبؔ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ متن میں نہیں ہے۔

مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالبؔ مطبوعہ[۱]
یار لائے مری بالیں پہ اُسے، پر کس وقت

ردیف "ث"

دودِ شمعِ کُشتۂ گُل بزمِ سامانی عبث — یک شبہ آشفتہ نازِ سنبلستانی عبث
ہے ہوس محمل بہ دوشِ شوخیِ ساقی مست — نشۂ مے کے تصوّر میں نگہبانی عبث
باز ماندن ہائے مژگاں ہے یک آغوشِ وداع — عید در حیرت سوادِ چشمِ قربانی عبث
جزو غبارِ کردہ سیر آہنگیِ پرواز کو؟ — بلبلِ تصویر و دعوائے پرافشانی عبث
سرنوشتِ خلق ہے طغرائے عجزِ اختیار — آرزوہا خار خارِ چینِ پیشانی عبث
جبکہ نقشِ مدّعا ہووے نہ جز موجِ سراب — وادیِ حسرت میں پھر آشفتہ جولانی عبث

دستِ برہم سودہ ہے مژگانِ خوابیدہ اسدؔ
اے دل از کف دادۂ غفلت، پشیمانی عبث

نالۂ لطفِ عشق با وصفِ توانائی عبث — رنگ ہے سنگِ محک دعوائے مینائی عبث
ناخنِ دخلِ عزیزاں یک قلم ہے نقب زن — پاسبانیِ طلسمِ گنجِ تنہائی عبث
محملِ پیمانۂ فرصت ہے بر دوشِ حباب — دعویٔ دریا کشی و نشۂ پیمائی عبث
طبعِ[۲] عاشق حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے — دل کو اے بیدادخو تعلیمِ خارائی عبث

---

[۱] یہ ایک ہی شعر مشہور ہے۔ قلمی نسخے میں اس کا ہم طرح کوئی شعر نہیں ہے۔

[۲] متن میں یہ شعر پہلے یوں لکھا ہے:

طبعِ نالاں حاملِ صد غلبۂ تاثیر ہے — دل کو اے عاشق کشاں تعلیمِ خارائی عبث

یک نگاہِ گرم ہے جوں شمع سر تا پا گداز | بہرِ از خود رفتگاں رنجِ خود آرائی عبث
قیس[1] بھاگا شہر سے شرمندہ ہو کر سوئے دشت | بن گیا تقلید سے میری یہ سودائی عبث

اے اسدؔ اب بے حیا ہے نازِ سجدہ عرضِ نیاز
عالمِ تسلیم میں یہ دعویِ آرائی عبث

ردیف "ج"

گلشن میں بندوبست بہ ضبطِ دگر ہے آج (قلمی)
گلشن میں بندوبست بہ رنگِ دگر ہے آج (م) | قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج
معزولیٔ[2] تپش ہوئی افراطِ انتظار | چشمِ کشادہ حلقۂ بیرونِ در ہے آج
حیرت فروشِ صد نگرانی ہے اضطرار | ہر رشتہ چاکِ جیب کا تارِ نظر ہے آج
آتا ہے[3] ایک پارۂ دل ہر فغاں کے ساتھ (م) | تارِ نفس کمندِ شکارِ اثر ہے آج
اے عافیت کنارہ کر، اے انتظار چل (م) | سیلابِ گریہ دشمنِ دیوار و در ہے آج
| سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
ہوں داغِ نیم رنگیِ شامِ وصالِ یار | نورِ چراغِ بزم سے جوشِ سحر ہے آج
کرتی ہے[4] عاجزیِ سفرِ سوختن تمام | پیراہنِ خسک میں غبارِ شرر ہے آج

---

[1] یہ شعر بھی حاشیے پر غالباً غالب کے قلم سے بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

[2] یہ شعر مولانا حسرت موہانی اور مولانا نظامی بدایونی کے شائع کردہ دیوانوں کے آخر میں غیر مردجہ اشعار کے ضمن میں درج ہے۔

[3] یہ معروف شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر غالباً غالب نے اپنے ہاتھ سے بڑھایا ہے۔

[4] متن میں پہلے اس کی بجائے یوں تھا۔ "بیتابی نے کیا سفرِ سوختن تمام"

تا صبح ہے بہ منزلِ مقصد رسیدنی — دودِ چراغِ خانہ غبارِ سفر ہے آج

دُور اوفتادۂ چمنِ فکر ہے اسدؔ
مُرغِ خیالِ بلبلِ بے بال و پر ہے آج

جنبشِ گلبرگ سے ہے گُل کے لب کو اختلاج (قلمی) — حبِّ شبنم سے صبا ہر صبح کرتی ہے علاج
شاخِ گُل جنبش میں ہے گہوارہ آسا ہر نفس — طفلِ شوخِ غنچۂ گُل بسکہ ہے وحشت مزاج
سیرِ مُلکِ حُسن کر، مے خانہ ہا نذرِ خمار — چشمِ مستِ یار سے ہے گردنِ مینا پہ باج
گریہ ہائے بیدلاں گنجِ شرر در آستیں — قہرمانِ عشق میں حسرت سے لیتے ہیں خراج
ہے سوادِ چشمِ قربانی میں یک عالم مقیم — حسرتِ فرصت نے بخشا بسکہ حیرت کو رواج

اے اسدؔ ہے مستعدِ شانہ گشتن بہرِ زلف
پنجۂ مژگاں، بخود بالیدنی رکھتا ہے آج

مطبوعہ
لو[۱] ہم مریضِ عشق کے تیمار دار ہیں
اچھا اگر نہ ہو تو مسیحا کا کیا علاج

ردیف ”چ“

نفس نہ انجمنِ آرزو سے باہر کھینچ (قلمی) — اگر شراب نہیں، انتظارِ ساغر کھینچ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ جلوہ نہ پوچھ
کمالِ گرمیِ سعیِ تلاشِ دید نہ پوچھ (م) — برنگِ خار، مرے آئینے سے جوہر کھینچ

---

[۱] اس مشہور شعر کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ملا۔

نہ کہہ کہ طاقتِ رسوائیِ وصال نہیں — اگر یہی عرقِ فتنہ ہے، مکرر کھینچ
تجھے بہانۂ راحت ہے انتظار اے دل — کیا ہے کس نے اشارہ کہ نازِ بستر کھینچ
جنونِ آئنہ مشتاقِ یک تماشا ہے — ہمارے صفحے پہ بالِ پری سے مسطر کھینچ
بہ نیمِ غمزہ ادا کر، حقِ ودیعتِ ناز — نیامِ پردۂ زخمِ جگر سے خنجر کھینچ
مرے قدح میں ہے صہبائے آتشِ پنہاں — بروئے سفرہ کبابِ دلِ سمندر کھینچ
تری طرف ہے بہ حسرت نظارۂ نرگس — بکوریِ دل و چشمِ رقیب ساغر کھینچ

خمارِ منتِ ساقی اگر یہی ہے اسدؔ
دلِ گداختہ کے میکدے میں ساغر کھینچ

بے دل نہ نازِ وحشتِ جیبِ دریدہ کھینچ — جوں بوئے غنچہ یک نفسِ آرمیدہ کھینچ
یک مشتِ خوں ہے پرتوِ خور سے تمام دشت — دردِ طلب بہ آبلۂ نادمیدہ کھینچ
پیچیدگی ہے حاملِ طومارِ انتظار — پائے نظر بہ دامنِ شوقِ دویدہ کھینچ
برقِ بہار سے ہوں میں پا در حنا ہنوز — اے خارِ دشت دامنِ شوقِ رمیدہ کھینچ
بے خود بہ لطفِ چشمکِ عبرت ہے چشمِ عید — یک داغِ حسرتِ نفسِ ناکشیدہ کھینچ
بزمِ نظر ہیں بیضۂ طاؤس خلوتاں — فرشِ طرب بہ گلشنِ ناآفریدہ کھینچ

دریا بساطِ دعوتِ سیلاب ہے اسدؔ
ساغر بہ بارگاہِ دماغِ رسیدہ کھینچ

قطعِ سفرِ ہستی و آرامِ فنا ہیچ — رفتار نہیں بیشتر از لغزشِ پا ہیچ
حیرت ہمہ اسرار پہ مجبورِ خموشی — ہستی نہیں جز بستنِ پیمانِ وفا ہیچ
تمثالِ گداز آئنہ ہے عبرتِ بینش — نظارہ تحیر چمنستانِ بقا ہیچ

گلزارِ دمیدن، شررستانِ رمیدن
فرصت تپش و حوصلۂ نشو و نما، ہیچ

آہنگِ عدم نالہ بہ کہسار گرو ہے
ہستی میں نہیں شوخیٔ ایجادِ صدا، ہیچ

کس بات پہ مغرور ہے اے عجزِ تمنّا
سامانِ دُعا وحشت و تاثیرِ دُعا، ہیچ

آہنگِ اسدؔ میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

ردیف "ح"

دعویٔ عشقِ بتاں سے، بہ گلستاں گل وصبح
ہیں رقیبانہ بہم دست، و گریباں گل و صبح

ساقِ گلرنگ سے، اور آئنۂ زانو سے
جامہ زیبوں کے سدا ہیں تہِ داماں گل و صبح

وصلِ آئینہ رُخاں ہم نفسِ یک دیگر
ہیں دعا ہائے سحر گاہ سے خواہاں گل و صبح

آئینہ خانہ ہے صحنِ چمنستاں یکسر
بسکہ ہیں بیخود و وارفتہ و حیراں گل و صبح

زندگانی نہیں بیش از نفسِ چند اسدؔ
غفلت آرامیٔ یاراں پہ ہیں خنداں گل و صبح

ردیف "د"

حُسن غمزے کی کشاکش سے چُھٹا میرے بعد
بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد[1]

---

[1] ردیف دال میں مروجہ دیوان میں فقط یہی ایک غزل ہے، اور اس کے بھی مقطع سے قبل کے دو شعر نہیں ملتے۔ باقی کی چاروں غزلیں قلمی نسخے کی ہیں۔

منصبِ شیفتگی کے کوئی قابل نہ رہا م ہوئی معزولیِ انداز و ادا میرے بعد
شمع بجھتی ہے تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے ″ شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد
خوں ہے دل خاک میں احوالِ بتاں پر یعنی ″ اُن کے ناخن ہوئے محتاجِ حنا میرے بعد
درخورِ عرض نہیں جوہرِ بیداد کو جا ″ نگہِ ناز ہے سُرمے سے خفا میرے بعد
ہے جنوں اہلِ جنوں کے لئے آغوشِ وداع ″ چاک ہوتا ہے گریباں سے جُدا میرے بعد
کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق ″ ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد
غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دُنیا میں کوئی ″ کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد
تھی[۱] نگہ میری نہاں خانۂ دل کی نقاب بے خطر جیتے ہیں اربابِ ریا میرے بعد
تھا میں گلدستۂ احباب کی بندش کی گیاہ متفرق ہوئے میرے رفقا میرے بعد

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ
م
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

بسکہ وہ پاکوباں در پردۂ وحشت ہیں یاد تلمی ہے غلافِ دفچۂ خورشید، ہر یک گردباد
طرفہ موزونی ہے صرفِ جنگجوئی ہائے یار ہے سرِ مصراعِ صافِ تیغ، خنجر مستزاد
ہاتھ آیا زخمِ تیغِ یار سا پہلو نشین کیوں نہ ہووے آج کے دن بیکسی کی روح شاد
کیجے آہو نے ختن کو خضرِ صحرائے طلب مُشک ہے سُنبلستانِ زلف میں گردِ سواد
ہم نے سوزِ زخمِ جگر پر بھی زباں پیدا نہ کی گل ہوا ہے ایک زخمِ سینہ پر خواہانِ داد
بسکہ ہیں در پردہ مصروفِ سیہ کاری تمام آستر ہے خرقۂ زہّاد کا صوفِ مداد

---

[۱] غالبؔ نے اس شعر کو گویا بجنسہٖ اٹھا کر اپنے ایک فارسی قصیدے میں رکھ لیا ہے۔ کہتا ہے:
نگہم نقب ہمی زد بہ نہانخانۂ دل مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیداں رفتم

تیغ در کف، کف بلب آتا ہے قاتل اس طرف
مژدہ باد اے آرزوئے مرگِ غالبؔ مژدہ باد

تو پست فطرت اور خیالِ بسا بلند (قلمی) اے طفلِ خود معاملہ! قد سے عصا بلند
ویرانیِ جُزو آمد و رفتِ نفس نہیں ہے کوچہائے نے میں غبارِ صدا بلند
رکھتا ہے انتظارِ تماشائے حُسنِ دوست مژگانِ بار ماندہ سے دستِ دُعا بلند
موقوف کیجیے یہ تکلّف نگاریاں ہوتا ہے ورنہ شعلۂ رنگِ حنا بلند
قربانِ اوجِ ریزیِ چشمِ حیا پرست یک آسماں ہے مرتبۂ پُشتِ پا بلند
ہے دلبری کمین گرِ ایجادِ یک نگاہ کارِ بہانہ جوئیِ چشمِ حیا بلند

بالیدگی نیازِ قدِ جانفزا اسدؔ
در ہر نفس، بقدرِ نفس، ہے قبا بلند

حسرتِ دستگہ و پائے تحمّل تا چند (قلمی) رگِ گردن، خطِ پیمانہ بے مُل تا چند
ہے گلیمِ سیہ بختِ پریشاں کاکل موئینہ بافتنِ ریشۂ سُنبل تا چند
کوکبِ بخت بجُز روزنِ پُر دود نہیں عینکِ چشمِ جنوں حلقۂ کاکل تا چند
چشم ہے خونِ دل و دل تہی از جوشِ نگاہ بزباں عرضِ فسونِ ہوسِ گُل تا چند
بزمِ داغِ طرب و باغ کشادِ پرِ رنگ شمع و گل تا کے و پروانہ و بلبل تا چند
نالہ دامِ ہوس و درد اسیری معلوم شرحِ بر خود غلطی ہائے تحمّل تا چند
جوہرِ آئنہ، فکرِ سخنِ موئے دماغ عرضِ حسرت، پسِ زانوئے تامُّل تا چند
سادگی ہے علمِ قدرتِ ایجادِ غنا ناکسی! آئینۂ نازِ توکّل تا چند
اسدِ خستہ گرفتارِ دو عالم اوہام مشکل آسانیِ کنِ یک خلق بتغافل تا چند

بہ کامِ دل کریں کس طرح گمرہاں فریاد — ہوئی ہے لغزشِ پا لکنتِ زباں فریاد
کمالِ بندگیِ گل ہے رہنِ آزادی — زدستِ کشتۂ پر و خارِ آشیاں فریاد
نوازشِ نفسِ آشنا کہاں، ورنہ — برنگِ نے ہے نہاں، در ہر استخواں فریاد
تغافل آئینہ دارِ خموشیِ دل ہے — ہوئی ہے محو، بہ تقریبِ امتحاں فریاد
ہلاکِ بے خبری، نغمۂ وجود و عدم — جہان و اہلِ جہاں سے جہاں جہاں فریاد
جوابِ سنگ دلی ہائے دشمناں، ہمت — زدستِ شیشۂ دلہائے دوستاں[1] فریاد

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسدؔ
خدا کے واسطے اے شاہِ بیکساں فریاد

ردیف "ر"

(۱)

{ بلا سے ہیں جو بہ پیشِ نظر در و دیوار
{ بلا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار
ہم — نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر در و دیوار

{ جنونِ عشق نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
{ وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
م — کہ ہو گئے مرے دیوار و در در و دیوار

نہیں ہے سایہ کہ سُن کر نویدِ مقدمِ یار
م — گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

م { کیا ہے تُو نے مۓ جلوہ کس قدر ارزاں
م { ہوئی ہے کس قدر ارزانیِ مۓ جلوہ
کہ مست ہے ترے کوچے میں ہر در و دیوار

---

[1] متن میں یہ مصرع پہلے یوں لکھا تھا:- زدستِ شیشگیِ طبعِ دوستاں فریاد

جو ہے تجھے سرِ سودائے انتظار تو آ م کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے م کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں پر در و دیوار

وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں تو سایہ سے م ہوئے فدا در و دیوار پر در و دیوار

نہ پوچھ بیخودیِ عیشِ مقدمِ سیلاب م کہ ناچتے ہیں پڑے سر بسر در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے بِن تیرے گھر کی آبادی م ہمیشہ روتے ہیں ہم دیکھ کر در و دیوار

نہ کہہ کسی سے کہ غالبؔ نہیں زمانے میں م

حریفِ رازِ محبت مگر در و دیوار

نہیں بندِ زلیخا بے تکلف ماہِ کنعاں پر قلمی

نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی م سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر م میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر

دلِ خونیں جگر بے صبر و فیضِ عشق مستغنی الٰہی ایک قیامت خاور آ ٹوٹے بدخشاں پر

فنا تعلیمِ درسِ بیخودی ہوں اُس زمانے سے م کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر

فراغت کس قدر رہتی مجھے تشویشِ مرہم سے م بہم گر صلح کرتے پارہ ہائے دل نمکداں پر

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا م کہ پشتِ چشم سے جس کے نہ ہووے مہرِ عنواں پر

مجھے اب دیکھ کر ابرِ شفق آلودہ یاد آیا م کہ فرقت میں تری آتش برستی تھی گلستاں پر

بجز پروازِ شوقِ ناز کیا باقی رہا ہوگا م قیامت اک ہوائے تند ہے خاکِ شہیداں پر

اسدؔ! اے بے تحمل عربدہ بیجا ہے ناصح سے کہ آخر بیکسوں کا زور چلتا ہے گریباں پر

نہ لڑ ناصح سے غالبؔ کیا ہوا گر اُس نے شدت کی

مطبوعہ

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر

صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگِ آخر   قلمی م   تغیرِ آبِ برجا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
خطِ نوخیز نیلِ چشمِ زخمِ صافیِ عارض   لیا آئینہ نے حرزِ پرِ طوطی بچنگ آخر
ہلال آسا تہی رہ، گر کشادن ہائے دل چاہے   ہوا مہ کثرتِ سرمایہ اندوزی سے تنگ آخر
تڑپ کر مر گیا وہ صیدِ بال افشاں کہ مضطر تھا   ہوا ناسورِ چشمِ تعزیت چشمِ خدنگ آخر
لکھی یاروں کی بدمستی نے میخانے کی پامالی   ہوئی قطرہ فشانی ہائے مے بارانِ سنگ آخر
اسدؔ پردے میں بھی آہنگِ شوقِ یار قائم ہے   نہیں ہے نغمے سے خالی خمیدن ہائے چنگ آخر

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
مطبوعہ
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

دیا یاروں نے بےہوشی میں درماں کا فریب آخر   قلمی   ہوا سکتے سے میں آئینۂ دستِ طبیب آخر
ستم کش مصلحت سے ہوں کہ خوباں تجھ پہ عاشق ہیں   م   تکلف برطرف، مل جائے گا تجھ سا رقیب آخر
رگِ گل جادۂ تارِ نگہ سے حد موافق ہے   ملیں گے منزلِ الفت میں ہم اور عندلیب آخر
غرورِ ضبط وقتِ نزع ٹوٹا بے قرارانہ   نیازِ بال افشانی ہوا صبر و شکیب آخر

اسدؔ کی طرح میری بھی بغیر از صبحِ رخساراں
ہوئی شامِ جوانی اے دلِ حسرت نصیب آخر

فسونِ یک دلی ہے لذتِ بیدادِ دشمن پر   قلمی   کہ وجدِ برق جوں پروانہ بال افشاں ہے خرمن پر
تکلف خار خارِ التماسِ بیقراری ہے   کہ رشتہ باندھتا ہے پیرہن انگشتِ سوزن پر
برنگِ کاغذِ آتش زدہ، نیرنگِ بیتابی   م   ہزار آئینہ دل باندھا ہے بالِ یک تپیدن پر
ہیں اور وہ بے سبب رنج آشنا دشمن کہ رکھتا ہے   م   شعاعِ مہر سے تہمت نگہ کی چشمِ روزن پر
یہ کیا وحشت ہے؟ اے دیوانہ! پیش از مرگ واویلا   رکھی بیجا بنائے خانۂ زنجیر شیون پر

اسد بسمل ہے کس انداز کا، قاتل سے کہتا ہے | کہ "مشقِ ناز کر، خونِ دو عالم میری گردن پر"
(کہ "مشقِ ناز کر، خونِ تمنّا میری گردن پر")

جنوں کی دستگیری کس سے ہو گر ہو نہ عُریانی | گریباں چاک کا حق ہو گیا ہے میری گردن پر (مطبوعہ)
فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے | متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

فنا کو سونپ، گر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا
فروغِ طالعِ خاشاک ہے موقوف گلخن پر

---

(۲)

شیشۂ[1] آتشیں، رُخِ پُر نور | عرق از خط چکیدہ، روغنِ مور
بسکہ ہوں بعدِ مرگ بھی نگراں | مردمک سے ہے خال بر لبِ گور
بار لاتی ہے دانہائے سرشک | مژہ سے ریشۂ رزِ انگور
ظُلم کرنا گدائے عاشق پر | نہیں شاہانِ حُسن کا دستور
دوستو! مجھ ستم رسیدہ سے | دشمنی ہے وصال کا مذکور
زندگانی پہ اعتماد غلط | ہے کہاں قیصر اور کہاں فغفور

کیجے جوں اشک اور قطرہ زنی
اے اسدؔ ہے ہنوز دِلّی دُور

بسکہ مائل ہے وہ رشکِ ماہتاب آئینہ پر | ہے نفس تارِ شعاعِ آفتاب آئینہ پر
بازگشتِ جادہ پیمائے رہِ حیرت کہاں | غافلاں غش جان کر چھڑکے ہیں آب آئینہ پر

---

[1] یہ قلمی دیوان کی وہ غزلیں ہیں جن کا کوئی شعر متداول نہیں ہے۔

بدگماں کرتی ہے عاشق کو خود آرائی تری — بیدلوں کو ہے براتِ اضطراب آئینہ پر
نازِ خود بینی کے باعث خونیِ صد بے گناہ — جوہرِ شمشیر کو ہے پیچ و تاب آئینہ پر
مدعی[1] میرے صفائے دل سے ہوتا ہے خجل — ہے تماشا زشت رویوں کا عتاب آئینہ پر
سدِ اسکندر ہوا از بہرِ نگاہِ گل رخاں — گر کرے یوں ابرِ نہیِ بو تراب آئینہ پر

دل کو توڑا جوشِ بیتابی سے غالبؔ کیا کیا؟
رکھ دیا پہلو بوقتِ اضطراب آئینہ پر

بینش بسعیِ ضبطِ جنوں نو بہار تر — دل در گداز نالہ بہ گاہ آبیار تر
قاتل بعزمِ ناز و دل از زخم در گداز — شمشیر آب دار و نگاہ آب دار تر
ہے کسوتِ عروجِ تغافل کمالِ حسن — چشمِ سیہ بہ برگِ نگہ سوگوار تر
سعیِ خرامِ کاوشِ ایجاد جلوہ ہے — جوشِ چکیدنِ عرق آئینہ کار تر
ہر گرد بادہ حلقۂ فتراکِ بیخودی — مجنونِ دشتِ عشق تحیر شکار تر
اے چرخ! خاک بر سرِ تعمیرِ کائنات — لیکن بنائے عہدِ وفا استوار تر

آئینہ داغِ حیرت و حیرت شکنجِ یاس
سیماب بے قرار و اسدؔ بے قرار تر

---

(۳۱)

گھر جب بنا لیا ترے در پر کہے بغیر[2] — جانے گا اب بھی تو نہ مرا گھر؟ کہے بغیر
کہتے ہیں، جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن — جانوں کسی کے دل کی میں کیونکر کہے بغیر

---

[1] یہ شعر حاشیے پر بعد میں غالباً بخطِ غالب بڑھایا گیا ہے۔
[2] یہ وہ غزلیں جن کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ہے۔

کام اُس سے آ پڑا ہے کہ جس کا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ستمگر کہے بغیر

جی میں ہی کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

چھوڑوں گا میں نہ اُس بُتِ کافر کو پُوجنا
چھوڑے نہ خلق گو مجھے کافر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دُونا ہو التفات
سُنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

غالبؔ نہ کر حضور میں تو بار بار عرض
ظاہر ہے تیرا حال سب اُن پہ کہے بغیر

کیوں جل گیا نہ تابِ رُخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

آتا ہے میرے قتل کو، پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خُونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذّتِ آزار دیکھ کر

بِک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زُنّار باندھ، سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں
جی خوش ہوا ہے راہ کو پُر خار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینہ میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلّی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ہے بسکہ ہر اک اُن کے اشارے میں نشاں اور — کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور
یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور
ابرو سے ہے کیا اُس نگہِ ناز کو پیوند — ہے تیر مقرر مگر اس کی ہے کماں اور
تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اُٹھیں گے — لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور
ہر چند سبک دست ہوئے بُت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگِ گراں اور
ہے خونِ جگر جوش میں، دل کھول کے روتا — ہوتے جو کئی دیدۂ خوں نابہ فشاں اور
مرتا ہوں اس آواز پہ، ہر چند سر اُڑ جائے — جلّاد کو لیکن وہ کہے جائیں کہ "ہاں اور"
لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا — ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور
لیتا، نہ اگر دل تمھیں دیتا، کوئی دم چین — کرتا، جو نہ مرتا، کوئی دن آہ و فغاں اور
پاتے نہیں جب راہ تو رُک جاتے ہیں نالے — رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ "غالب کا ہے اندازِ بیاں اور"

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
مٹ جائے گا سر، گر ترا پتھر نہ گھسے گا — ہوں در پہ ترے ناصیہ فرسا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ "جاؤں" — مانا کہ نہیں آج سے اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو "قیامت کو ملیں گے" — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی عارف — کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے — پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور
تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے — کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور
مجھ سے تمھیں نفرت سہی، نیر سے لڑائی — بچوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہرحال یہ مدت خوش و ناخوش؛ کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ "کیوں جیتے ہیں غالبؔ"
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

ردیف "ز"

بیگانۂ وفا ہے ہوائے چمن ہنوز قلمی وہ سبزہ سنگ پر نہ اُگا کوہکن ہنوز
یارب! یہ درد مند ہے کس کی نگاہ کا ہے ربطِ مشک و داغِ سوادِ ختن ہنوز
جوں جادہ، سر بکوئے تمنائے بیدلی زنجیرِ پا ہے رشتۂ حب الوطن ہنوز
ہے نازِ مفلساں زرِ از دست رفتہ پر م ہوں گلفروشِ شوخیِ داغِ کہن ہنوز
میں دُور گردِ قربِ بساطِ نگاہ تھا بیرونِ دل نہ تھی تپشِ انجمن ہنوز

تھا مجھکو خار خارِ جنونِ وفا اسدؔ
سوزن میں تھا نہفتہ گلِ پیرہن ہنوز

میں ہوں سرابِ یک تپش آموختن ہنوز قلمی زخمِ جگر ہے تشنہ لب دوختن ہنوز
اے شعلہ! فرصتے کہ سویدائے دل سے ہوں کشتِ سپندِ صد جگر اندوختن ہنوز
فانوسِ شمع ہے کفنِ کشتگانِ شوق در پردہ ہے معاملۂ سوختن ہنوز
مجنوں! فسونِ شعلہ خرامی فسانہ ہے ہے شمعِ جادہ داغِ نیفروختن ہنوز
فارغ مجھے نہ جان کہ مانندِ صبح و مہر م ہے داغِ عشق زینتِ جیبِ کفن ہنوز
میخانۂ جگر میں یہاں خاک بھی نہیں م خمیازہ کھینچے ہے بتِ بیدادفن ہنوز

لہ یہ دونوں متداول شعر بھی قلمی نسخے کے حاشیے پر بعد میں لکھ دیئے گئے ہیں

کو یک شرر؟ کہ سازِ چراغاں کروں اسدؔ
بزمِ طرب ہے پردگیِ سوختن ہنوز

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز ۔ تم ۔ دعا قبول ہو یارب! کہ عمرِ خضر دراز
نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود ۔ م ۔ ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز
فریبِ صنعتِ ایجاد کا تماشا دیکھ ۔ نگاہ عکس فروش و خیال آئینہ ساز
وصالِ جلوہ تماشا ہے، پر دماغ کہاں ۔ م ۔ کہ دیجے آئینۂ انتظار کو پرداز
ہنوز اے اثرِ دیدِ ننگِ رسوائی ۔ نگاہ فتنہ خرام و درِ دو عالم باز
زبس کہ جلوۂ صیّاد حیرت آرا ہے ۔ اُڑی ہے صفحۂ خاطر سے صورتِ پرواز
ہجومِ فکر سے دل مثلِ موج لرزے ہے ۔ کہ شیشہ نازک و صہبائے آبگینہ گداز
اسدؔ سے ترکِ وفا کا گماں وہ معنی ہے ۔ کہ کھینچیے پرِ طائر سے صورتِ پرواز
ہر ایک ذرۂ عاشق ہے آفتاب پرست ۔ مطبوعہ ۔ گئی نہ خاک ہوئے پر ہوائے جلوۂ ناز

نہ پوچھ وسعتِ میخانۂ جنوں غالبؔ
جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

نہ گلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز ۔ م ۔ میں ہوں اپنی شکست کی آواز
تو، اور آرائشِ خمِ کاکل ۔ م ۔ میں، اور اندیشہ ہائے دور و دراز
لافِ تمکیں فریبِ سادہ دلی ۔ م ۔ ہم ہیں، اور راز ہائے سینہ گداز

۱؎ قلمی نسخے کے حاشیے پر یہ چاروں شعر درج ہیں جن میں سے آخری دو عام طور پر مطبوعہ دیوان میں پائے جاتے ہیں۔

۲؎ متن میں مقطع پر "لا" لکھ کر اس کی جگہ وہ مقطع بڑھایا ہے جو مطبوعہ دیوانوں میں ملتا ہے۔
"نہ پوچھ وسعتِ" الخ

ہوں گرفتارِ الفتِ صیاد   م   ورنہ باقی ہے طاقتِ پرواز
وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے   م   ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز
نہیں دل میں مرے وہ قطرۂ خون   م   جس سے مژگاں ہوئی نہ ہو گلباز
اے ترا غمزہ یک قلم انگیز
اے ترا جلوہ یک قلم انگیز   م   اے ترا ظلم سربسر انداز
تو ہوا جلوہ گر مبارک ہو   م   ریزشِ سجدۂ جبینِ نیاز
نگہِ[1] التفات سوئے اسد
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا   م   میں غریب اور تو غریب نواز
اسد اللہ خاں تمام ہوا
مطبوعہ
اے دریغا وہ رندِ شاہد باز

داغِ اطفال ہے دیوانہ بہ کہسار ہنوز   قلمی   خلوتِ سنگ میں ہے نالہ طلب گار ہنوز
خانہ ہے سیل سے خو کردۂ دیدار ہنوز   دوربیں در زدہ ہے رخنۂ دیوار ہنوز
وسعتِ سعیِ کرم دیکھ کہ سرتاسرِ خاک   گزرے ہے آبلہ پا ابرِ گہربار ہنوز
یک قلم کاغذِ آتش زدہ ہے صفحۂ دشت   م   نقشِ پا میں ہے تپِ گرمیِ رفتار ہنوز
آئی یک عمر سے معذورِ تماشا نرگس   چشمِ شبنم میں نہ ٹوٹا مژۂ خار ہنوز
کیوں ہوا تھا طرفِ آبلۂ پا یارب!   جادہ ہے واشدنِ پیچشِ طومار ہنوز

---

[1] متن میں پہلے یہ مصرع یوں تھا: "یا علی! ایک نگاہ سوئے اسد" پھر اسے اس صورت میں بدلا لیکن بدستور مقطع رہنے دیا۔ پھر اس کے بعد غالباً سہ بارہ نظر کرتے وقت اس میں سے تخلص بھی نکال ڈالا اور شعر کی صورت ہی بدل دی اور ایک نیا مقطع بڑھا دیا جو عام طور پر مشہور ہے۔

ہوں خموشی چمنِ حسرتِ دیدار اسدؔ
مژہ ہے شانہ کشِ طرۂ گفتار ہنوز

(۲)

حُسنِ[1] خود آرا کو ہے مشقِ تغافل ہنوز
ہے کفِ مشّاطہ میں، آئینۂ گل ہنوز
سادگیِ یک خیال، شوخیِ صد رنگِ نقش
حیرتِ آئینہ ہے جیبِ تامّل ہنوز
سادہ و پُرکار تر، غافل و ہشیار تر
مانگے ہے شمشاد سے شانۂ سُنبل ہنوز
ساقی و تعلیمِ رنج، محفل و مت کیس گراں
سیلیِ اُستاد ہے ساغرِ بے مُل ہنوز
شغلِ ہوس در نظر، لیک حیا بے خبر
شاخِ گُلِ نغمہ ہے نالۂ بُلبل ہنوز
دل کی صدائے شکست، سازِ طرب ہے اسدؔ
شیشۂ بے بادہ سے چاہے ہے قلقل ہنوز

چاکِ گریباں کو ہے ربطِ تامّل ہنوز
غنچہ میں دل تنگ ہے حوصلۂ گل ہنوز
دل میں ہے سودائے زُلف مستِ تغافل ہنوز
ہے مژۂ خوابناک ریشۂ سُنبل ہنوز
پرورشِ نالہ ہے وحشتِ پرواز سے
ہے تہِ بالِ پری بیضۂ بلبل ہنوز
عشق کمیں گاہِ درد، وحشتِ دل دور گرد
دامِ تہِ سبزہ ہے حلقۂ کاکل ہنوز
لذّتِ تقریرِ عشق، پردگیِ گوشِ دل
جوہرِ افسانہ ہے عرضِ تحمّل ہنوز
آئینۂ امتحاں نذرِ تغافل اسدؔ
شش جہت اسباب ہے وہمِ توکّل ہنوز

کو بیابانِ تمنا و کجا جولانِ عجز
آبلے پا کے ہیں یاں رفتار کو دندانِ عجز

---

[1] یہ وہ غزلیں ہیں جن کا ہم طرح کوئی شعر مطبوعہ دیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔

ہو قبولِ کم نگاہی تحفۂ اہلِ نیاز — اے دل، وائے جانِ ناز، اے دیں، وائے ایمانِ عجز
بوسۂ پا انتخابِ بدگمانی ہائے حسن — یاں ہجومِ عجز سے تا سجدہ ہے جولانِ عجز
حسن کو غنچوں سے ہے پوشیدہ چشمکہائے ناز — عشق نے وا کی ہے ہر یک خار سے مژگانِ عجز
اضطرابِ نارسائی مایۂ شرمندگی — ہے عرق ریزیِ خجلت جوششِ طوفانِ عجز
وہ جہاں مسند نشینِ بارگاہِ ناز ہو — قامتِ خوباں ہو محرابِ نیاز ستانِ عجز

بسکہ بے پایاں ہے صحرائے محبت اے اسد
گردباد اس راہ کا ہے عقدۂ پیمانِ عجز

نہ بندھا تھا بہ عدم نقشِ دلِ مور ہنوز — تب سے ہے یاں دہنِ یار کا مذکور ہنوز
سبزہ ہے نوکِ زبانِ دہنِ گور ہنوز — حسرتِ عرضِ تمنا میں ہوں رنجور ہنوز
صد تجلی کدہ ہے صرفِ جبینِ غربت — پیرہن میں ہے غبارِ شررِ طور ہنوز
زخمِ دل میں ہے نہاں غنچۂ پیکانِ نگار — جلوۂ باغ ہے در پردۂ ناسور ہنوز
پا، پُر از آبلہ، راہِ طلبِ مے میں ہوا — ہاتھ آیا نہیں یک دانۂ انگور ہنوز
گُل کھلے، غنچے چٹکنے لگے اور صبح ہوئی — سرخوشِ خواب ہے وہ نرگسِ مخمور ہنوز

اے اسد! تیرگیِ بختِ سیہ ظاہر ہے
نظر آتی نہیں صبحِ شبِ دیجور ہنوز

(۳)

کیونکر[۱] اس بت سے رکھوں جان عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز
دل سے نکلا، پہ نہ نکلا دل سے — ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

تاب لاتے ہی بنے گی غالب
واقعہ سخت ہے اور جان عزیز

---

[۱] مروجہ دیوانوں میں اس ردیف کے فقط یہی تین شعر ایسے ہیں جن کی ہم طرح غزل قلمی نسخے میں موجود نہیں ہے۔

ردیف "س"

کب فقیروں کو رسائی بتِ مے خوار کے پاس — قلمی — تونبے بو دیجیے میخانے کی دیوار کے پاس
مژدہ اے ذوقِ اسیری کہ نظر آتا ہے — م — دامِ خالی قفسِ مرغِ گرفتار کے پاس
جگرِ تشنۂ آزار، تسلی نہ ہوا — م — جوئے خوں ہم نے بہائی بنِ ہر خار کے پاس
مُند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں، ہے ہے — م — خوب وقت آئے تم اس عاشقِ بیمار کے پاس
میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے — م — دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس
دہنِ شیر میں جا بیٹھیے، لیکن اے دل! — م — نہ کھڑے ہوجیے خوبانِ دل آزار کے پاس
دیکھ کر تجھ کو چمن، بسکہ نمو کرتا ہے — م — خود بخود پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس

مر گیا پھوڑ کے سر غالبِ وحشی، ہے ہے
م
بیٹھنا اُس کا وہ آکر تری دیوار کے پاس

---

(۲)

حاصلِ دل بستگی ہے عمرِ کوتاہ اور بس — وقفِ عرضِ عقدہ ہائے مُتصل، تارِ نفس
کیوں نہ طوطیِ طبیعت نغمہ پیرائی کرے — باندھتا ہے رنگِ گل، آئینہ بر چاکِ قفس
اے ادا فہماں! صدا ہے تنگیِ فرصت سے خوں — ہے بصحرائے تحیر، چشمِ قربانی جرس
تیز تر ہوتا ہے خشمِ تُند خویاں عجز سے — ہے رگِ سنگِ فسانِ تیغ، شعلہ خار و خس
سختیِ راہِ محبت منعِ دخلِ غیر ہے — پیچ و تابِ جادہ، ہے یاں جوہرِ تیغِ عسس

اے اسد خود ہم اسیرِ رنگ و بوئے باغ ہیں
ظاہرا صیادِ ناداں ہے گرفتارِ ہوس

۱؎ یہ غزل جو مروجہ دیوانوں میں چھپی ہوئی ہے قلمی دیوان کے حاشیے پر بعد میں بڑھائی گئی ہے اور اس میں مطلع بھی موجود ہے جو مروجہ دیوانوں میں نہیں

دشتِ الفت میں ہے خاکِ کشتگاں محبوس و بس
پیچ و تابِ جادہ ہے خطِ کفِ افسوس و بس

نیم رنگی ہائے شمعِ محفلِ خوباں سے ہے
پیچکِ مہ صرفِ چاکِ پردۂ فانوس و بس

ہے تصور میں نہاں سرمایۂ صد گلستاں
کاسۂ زانو ہے مجھ کو بیضۂ طاؤس و بس

کفر ہے غیر از وفورِ شوق[۱] رہبر جستن
بانگِ صحرائے حرم میں ہے جرس ناقوس و بس

یک[۲] جہاں گل تختۂ مشقِ شگفتن ہے اسد
غنچۂ خاطر رہا افسردگی مانوس و بس

کرتا ہے بہ یادِ بتِ رنگیں دلِ مایوس
رنگینیِ نظر رفتہ حنائے کفِ افسوس

تھا خواب میں کیا جلوہ نظر جوشِ زلیخا
ہے بالشِ دل سوختگاں میں پرِ طاؤس

حیرت سے رخِ دوست کے از بسکہ ہیں بیکار
نم، قطرۂ شبنم میں ہے جوں شمع بہ فانوس

دریافتنِ صحبتِ اغیار غرض ہے
اے نامہ رساں! نامہ رساں چاہیے جاسوس

ہے مشق اسد دستگہِ وصل کی منظور
ہوں خاک نشیں از پئے ادراکِ قدم بوس

ردیف "ش"

ہوئی[۳] ہے بسکہ صرفِ مشقِ تمکینِ بہار آتش
بہ اندازِ حنا ہے رونقِ دستِ چنار آتش
قطعہ

نہ لیوے گر خسِ جوہر طراوت سبزۂ خط سے
لگا دے خانۂ آئینہ میں روئے نگار آتش

---

۱ پہلے "دوز" کی جگہ "گداز" تھا۔

۲ یہ مصرع پہلے یوں تھا "اے اسد گل تختۂ مشقِ شگفتن ہو گئے"

۳ پہلے یہ مصرع یوں تھا۔ "ز جوشِ اعتدالِ فصل تمکینِ بہار آتش"

فروغِ حسن سے ہوتی ہے حلِ مشکلِ عاشق
نہ نکلے شمع کے پا سے نکالے گر نہ خار آتش[۱]

شرر ہے رنگ بعد اظہارِ تابِ جلوۂ تمکیں
کرے ہے سنگ پہ خورشید آبِ روئے کارِ آتش

نہ پاوے ہے گدازِ موم ربطِ پیکر آرائی
نکالے کیا نہالِ شمع بے تخمِ شرارِ آتش

خیالِ دود تھا سر جوشِ سودائے غلط فہمی
اگر رکھتی نہ خاکستر نشینی کا غبار آتش

ہوائے پرفشانی برقِ خرمن ہائے خاطر ہے
ببالِ شعلۂ بیتاب ہے پروانہ زارِ آتش

نہیں برق و شرر جز وحشت و ضبطِ تپیدن ہا
بلا گرداں ہے بے پروا خرامی ہائے یارِ آتش

دھوئیں سے آگ کے اک ابر دریا بار ہو پیدا
اسدؔ حیدر پرستوں سے اگر ہووے دوچار آتش

بہ اقلیمِ سخن ہے جلوۂ گردِ سوادِ آتش
کہ ہے دودِ چراغاں سے ہیولائے مدادِ آتش

اگر مضمونِ خاکستر کرے دیباچہ آرائی
نہ باندھے شعلۂ جوالہ غیر از گردبادِ آتش

کرے ہے لطفِ اندازِ برہنہ گوئی خوباں
بہ تقریبِ نگارش ہائے سطرِ شعلہ بادِ آتش

دیا داغِ جگر کو آہ نے رنگِ ادائے شگفتن کا
نہ ہو بالیدہ غیر از جنبشِ دامانِ بادِ آتش

اسدؔ قدرت سے حیدر کی ہوئے ہر گبر و ترسا کو
شرارِ سنگِ بت ہی پر بنائے اعتقادِ آتش

---

[۱] پہلے یہ مصرع اس طرح تھا: "نکالے ہے ز پائے شمع بر جا ماندہ خارِ آتش" پھر حاشیے پر اس کو یوں بدل دیا اور اب مروجہ دیوانوں میں یہ اسی طرح درج ہے۔

ردیف "ع"

جادۂ رہ، خور کو وقتِ شام، ہے تارِ شعاع ۔ قمی[1] ۔ چرخ وا کرتا ہے ماہِ نو سے آغوشِ وداع
شمع سے ہے بزم انگشتِ تحیّر در دہن ۔ شعلۂ آوازِ خوباں پر، بہ ہنگامِ سماع
جوں پرِ طاؤس جوہر تختۂ مشقِ رنگ ہے ۔ بس کہ ہے وہ قبلۂ آئینہ محوِ اختراع
رنجشِ حیرت سرشتاں سینہ صافی پیش کش ۔ جوہرِ آئینہ ہے یاں گردِ میدانِ نزاع
چار سوئے دہر میں بازارِ غفلت گرم ہے ۔ عقل کے نقصاں سے اٹھتا ہے خیالِ انتفاع

آشنا، غالبؔ نہیں ہیں دردِ دل کے آشنا
ورنہ کس کو میرے افسانے کی تابِ استماع

رخِ نگار سے ہے سوزِ جاودانیِ شمع ۔ قمی ۔ ہوئی ہے آتشِ گل آبِ زندگانیِ شمع
زبانِ اہلِ زباں میں، ہے مرگ خاموشی ۔ م ۔ یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
کرے ہے صرف بہ ایمائے شعلہ قصہ تمام ۔ م ۔ بہ طرزِ اہلِ فنا ہے فسانہ خوانیِ شمع
غم اس کو حسرتِ پرواز کا ہے اے شعلہ ۔ م ۔ ترے لرزنے سے ظاہر ہے ناتوانیِ شمع
ترے خیال سے روح اہتزاز کرتی ہے ۔ م ۔ بہ جلوہ ریزیِ باد و بہ پر فشانیِ شمع
نشاطِ داغِ غمِ عشق کی بہار۔ نہ پوچھ ۔ م ۔ شگفتگی ہے شہیدِ گلِ خزانیِ شمع

جلے ہے۔ دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو ۔ { اسدؔ ہے دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع }

---

[1] یہ غزل قمی نسخے اور مطبوعہ دیوانوں میں بالکل مشترک ہے۔ صرف مقطع میں کچھ خفیف سا فرق ہے جو ناظرین کے پیشِ نظر ہے۔

ردیف "غ"[1]

عشاقِ اشکِ چشم سے دھوویں ہزار داغ
دیتا ہے اور جُوں گل و شبنم بہار داغ

جُوں چشمِ باز نازہ ہے ہر یک بسوئے دل
رکھتا ہے داغ تازہ کا یاں انتظار داغ

بے لالہ عارضاں مجھے گلگشتِ باغ میں
دیتی ہے، گرمیٔ گل و بلبل، ہزار داغ

جُوں اعتمادِ نامہ و خط کا ہو مہر سے
یوں عاشقوں میں ہے سببِ اعتبار داغ

ہوتے ہیں نیست جلوۂ خور سے ستارگاں
دیکھ اُس کو دل سے مٹ گئے بے اختیار داغ

وقتِ خیالِ جلوۂ حُسنِ بُتاں اسدؔ
دکھلائے ہے مجھے دو جہاں لالہ زار داغ

بُلبلوں کو دُور سے کرتا ہے منع بارِ باغ
ہے زبانِ پاسباں خارِ سرِ دیوارِ باغ

کون آیا جو چمن بیتابِ استقبال ہے
جُنبشِ موجِ صبا ہے شوخیٔ رفتارِ باغ

ہیں ہمہ حیرت، جوں بیتاب دورانِ خمار
مردمِ چشمِ تماشا نقطۂ پرکارِ باغ

آتشِ رنگِ رُخِ ہر گل کو بخشے ہے فروغ
ہے دمِ سردِ صبا سے گرمیٔ بازارِ باغ

کون گل سے ضعفِ خاموشیٔ بُلبل کہہ سکے
نَے زبانِ غنچہ گویا، نے زبانِ خارِ باغ

جوشِ گل کرتا ہے استقبالِ تحریرِ اسدؔ
زیرِ مشقِ شعر ہے نقش از پئے اشعارِ باغ

---

[1] اس ردیف کا کوئی شعر مروّجہ دیوانوں میں نظر سے نہیں گزرا۔

ردیف "ف"

نامہ بھی لکھتے ہو تو بخطِ غبار، حیف ط رکھتے ہو مجھ سے اتنی کدورت ہزار حیف
بیمِ رقیب سے نہیں کرتے وداعِ ہوش م مجبور یاں تلک ہوئے اے اختیار حیف
بیش از نفس بتاں کے کرم نے وفا نہ کی تھا محملِ نگاہ بدوشِ شرار حیف
تھی میرے ہی جلانے کو اے آہ شعلہ ریز گھر پر پڑا نہ غیر کے کوئی شرار حیف
گل ۱؎ چہرہ ہے کسی خفقانی مزاج کا گھبرا رہی ہے بیمِ خزاں سے بہار حیف
جلتا ۱؎ ہے دل کہ کیوں نہ ہم اک بار جل گئے م اے ناتمامیِ نفسِ شعلہ بار حیف
ہیں میری مشتِ خاک سے اُس کو کدورتیں پائی جگہ بھی دل میں تو ہو کر غبار حیف
بنتا اسدؔ میں سرمۂ چشمِ رکابِ یار
آیا نہ میری خاک پہ وہ شہسوار حیف

عیسیٰ مہرباں ہے شفا ریز یک طرف ط دردِ آفریں ہے طبعِ الم خیز یک طرف
سنجیدگی ہے ایک طرف رنجِ کوہکن خوابِ گرانِ خسروِ پرویز یک طرف
خرمن بباد دادۂ دعوے ہیں، بوالہوس ہم اک طرف ہیں برقِ شرر ریز یک طرف
مُفتِ ۲؎ دل و جگر، خلشِ غمزہ ہائے ناز کاوش فروشیِ مژۂ تیز یک طرف
ہر مو بدن پہ شہپرِ پرواز ہے مجھے بیتابیِ دلِ تپش انگیز یک طرف
یک جانب اے اسدؔ شبِ فرقت کا بیم ہے
دامِ ہوس ہے زلفِ دلآویز یک طرف

۱؎ یہ دونوں شعر بھی نسخے کے حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔ ان میں سے ؎ عام طور پر متداول ہے۔
۲؎ یہ شعر بھی حاشیے پر بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

ردیف "ک"

زخم پر باندھے ہیں کب طفلانِ بے پروا نمک (قلمی)
زخم پر چھڑکیں کہاں طفلانِ بے پروا نمک (م)
کیا مزہ ہوتا اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک

گردِ راہِ یار ہے سامانِ نازِ زخمِ دل (م) ورنہ ہوتا ہے جہاں میں کس قدر پیدا نمک

یاد ہیں اے ہم نشیں وہ دن کہ وجدِ ذوق میں زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

شورِ جولاں تھا کنارِ بحر پر کس کا کہ آج (م) گردِ ساحل ہے بہ زخمِ موجۂ دریا نمک

مجھ کو ارزانی رہے، تجھ کو مبارک ہو جیو (م) نالۂ بلبل کا درد اور خندۂ گل کا نمک

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ واہ (م) یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

چھوڑ کر جانا تنِ مجروحِ عاشق حیف ہے (م) دل طلب کرتا ہے زخم اور مانگے ہیں اعضا نمک

غیر کی منت[1] نہ چھوڑوں گا پئے توقیرِ درد زخمِ دل جوں خندۂ خوباں ہیں سرتا پا نمک

اس عمل میں عیش کی لذت نہیں ملتی اسد زور نسبت مے سے رکھتا ہے نصارا کا نمک

غیر کی منت نہ کھینچوں گا پئے توفیرِ درد (مطبوعہ) زخم مثلِ خندۂ قاتل ہے سرتا پا نمک

یاد ہیں غالب تجھے وہ دن کہ فرطِ ذوق میں
زخم سے گرتا تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک (م قلمی) کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ (م) دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

---

[1] یہ شعر قلمی نسخے کے متن میں نہیں تھا۔ بعد میں حاشیے پر بڑھایا گیا ہے اور پھر تھوڑی سی ترمیم کے بعد مروّجہ دیوانوں میں شائع ہوا ہے۔

عاشقی صبر طلب اور تمنا بیتاب — دل کا کیا رنگ کروں خونِ جگر ہونے تک
تا قیامت شبِ فرقت میں گزر جائے گی عمر — سات دن ہم پہ بھی بھاری ہیں سحر ہونے تک
ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک
پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم — میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک
یک نظر بیش نہیں فرصتِ ہستی غافل — گرمیِ بزم ہے اک رقصِ شرر ہونے تک

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

آئے ہیں پارہ ہائے جگر درمیانِ اشک — مطلع — لایا ہے لعلِ بیش بہا کاروانِ اشک
ظاہر کرے ہے جنبشِ مژگاں سے مدعا — طفلانہ ہاتھ کا ہے اشارہ زبانِ اشک
میں وادیِ طلب میں ہوا جلوہ تنِ عرق — از بسکہ صرفِ قطرہ زنی تھا بسانِ اشک
دل خستگاں کو ہے طربِ صد چمن بہار — باغِ بخوں تپیدن و آبِ روانِ اشک
رونے[1] نے طاقت اتنی نہ چھوڑی کہ ایک بار — مژگاں کو دوں فشار پئے امتحانِ اشک
سیلِ[1] بنائے ہستیِ شبنم ہے آفتاب — چھوڑے نہ چشم میں تپشِ دل نشانِ اشک

ہنگامِ انتظارِ قدومِ بتاں اسدؔ
ہے بر سرِ مژہ نگراں دیدبانِ اشک

---

[1] یہ دونوں شعر متن میں نہیں تھے۔ حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔

ردیف "گ"

گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت، دعا نہ مانگ — قلمی — یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ
اے آرزو شہیدِ وفا خوں بہا نہ مانگ — جز بہرِ دست و بازوئے قاتل دعا نہ مانگ
گستاخیِ وصال ہے مشاطۂ نیاز — یعنی دعا بجز خمِ زلفِ دوتا نہ مانگ
برہم ہے بزمِ غنچہ، بہ یک جنبشِ نشاط — کاشانہ بسکہ تنگ ہے، غافل ہوا نہ مانگ
عیسیٰ! طلسمِ حسن تغافل ہے، زینہار — جز پشتِ چشم، نسخۂ عرضِ دوا نہ مانگ
میں دور گردِ عرضِ رسومِ نیاز ہوں — دشمن سمجھ، و لے نگہِ آشنا نہ مانگ
نظارہ دیگر و دلِ خونیں نفس دگر — آئینہ دیکھ، جوہرِ برگِ حنا نہ مانگ
مجھ سے حسابِ بے گنہی اے خدا نہ مانگ
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد — م — مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

یک بختِ اوج نذرِ سبکباریِ اسدؔ
سر پر وبالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ

ردیف "ل"

ہے کس قدر ہلاکِ فریبِ وفائے گل![1] — قلمی — بلبل کے کاروبار پہ ہیں خندہ ہائے گل
آزادیِ نسیم مبارک کہ ہر طرف — م — ٹوٹے پڑے ہیں حلقۂ دامِ ہوائے گل
جو تھا سو موجِ رنگ کے دھوکے میں مر گیا — د — اے وائے نالۂ لبِ خونیں نوائے گل

---

[1] یہ غزل قلمی نسخے کے حاشیے پر بعد میں بڑھائی گئی ہے اور چوتھے اور ساتویں شعر کے سوا باقی تمام شعر بجنسہٖ مروجہ دیوانوں میں موجود ہیں۔

دیوانگاں کا چارہ فروغِ بہار ہے — ہے شاخِ گل میں پنجۂ خوباں بجائے گل
خوش حال اُس حریفِ سیہ مست کا کہ جو — رکھتا ہو مثلِ سایۂ گل سر بپائے گل
ایجاد کرتی ہے اُسے تیرے لئے بہار — میرا رقیب ہے نفسِ عطر سائے گل
مژگاں تلک رسائیِ لختِ جگر کہاں — اے وائے گر نگاہ نہ ہو آشنائے گل
شرمندہ رکھتے ہیں مجھے بادِ بہار سے — مینائے بے شراب و دلِ بے ہوائے گل
سطوت سے تیرے جلوۂ حسنِ غیور کی — خوں ہے مری نگاہ میں رنگِ ادائے گل
تیرے ہی جلوے کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک — بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل

غالبؔ مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو
جس کا خیال ہے گلِ جیبِ قبائے گل

بدر ہے آئینۂ طاقِ ہلال — غافلاں! نقصاں سے پیدا ہے کمال
ہے بہ یادِ زلفِ مشکیں سال و ماہ — روزِ روشن شامِ آنسوئے خیال
بسکہ ہے اصلِ دمیدن ہا غبار — ہے نہالِ شکوۂ ریحاں سفال
صافیِ رخسار سے ہنگامِ شب — عکسِ داغِ شب ہوا عارض پہ خال
نور سے تیرے ہے اُس کی روشنی — ذرہ ہے خورشید یک دستِ سوال
شورِ محشر اُس فتنہ قامت کے حضور — سایہ آسا ہو گیا ہے پائمال

ہو جو بلبل پیرۂ فکرِ اسدؔ
غنچۂ منقارِ گل ہو زیرِ بال

ہر عضو غم سے ہے شکن آسا شکستہ دل — جُوں زلفِ یار ہوں میں سراپا شکستہ دل
ہے سرنوشت میں رقمِ واشکستگی — ہوں جُوں خطِ شکستہ بہر جا شکستہ دل

امواج کی جو یہ شکنیں آشکار ہیں ہے چشمِ اشک ریز سے دریا شکستہ دل
ناسازیِ نصیب و درشتیِ غم سے ہے آئینہ نا امید و تمنا شکستہ دل

ہے سنگِ ظلمِ چرخ سے میخانہ میں اسدؔ
صہبا فتادہ خاطرِ مینا شکستہ دل

ہم دل بہ وحشت انتظار آوارۂ دشتِ خیال قلمی اک سفیدی مارتی ہے دور سے چشمِ غزال
ہے نفس پروردۂ گلشن کس ہوائے بام کا طوقِ قمری میں ہے سروِ باغ ریحانِ سفال
ہم غلط سمجھے تھے لیکن زخمِ دل پر رحم کر آخر اس پردے میں تو ہنستی تھی اے صبحِ وصال
بیکسی افسردہ ہوں، اے ناتوانی کیا کروں؟ جلوۂ خورشید سے ہے گرم پہلوئے ہلال
شکوۂ دردِ دیدہ داغ، اے بیوفا معذور رکھ خوں بہائے یک جہاں امید ہے تیرا خیال
عرضِ دردِ بیوفائی وحشتِ اندیشہ ہے خوں ہوا دل تا جگر یا رب زبانِ شکوہ لال

اس جفا مشرب پہ عاشق ہوں کہ سمجھے ہے اسدؔ
مالِ سستی کو مباح اور خونِ صوفی کو حلال

بہرِ عرضِ حالِ شبنم ہے رقم ایجادِ گل ظاہر ہے اس چمن میں لالِ مادر زادِ گل
گر کرے انجام کو آغاز ہی میں یادِ گل غنچہ ہے خمیازۂ بلبل وار ہو فریادِ گل
گر بہ جرمِ باغ کھینچے نقشِ روئے یار کو شمع ساں ہو جائے قطِ خامۂ بہزادِ گل
دستِ رنگیں سے جو صبح پردہ گیرئے نقاب سا شاخِ گل ساقی ہو تہاں جوں شاہد و شمشادِ گل
سعیِ عاشق ہے فروغ افزائے آبِ رنگ کا ہے غبارِ تیشہ بہرِ تربتِ فرہادِ گل
ہے تصورِ صافیِ قطعِ نظر از غیرِ یار تختۂ دل سے ملا دے شمعِ خیال آبادِ گل
گلشن آبادِ دلِ مجروح میں ہو جائے ہے غنچۂ پیکانِ شاخِ ناوکِ صیادِ گل

برقِ سامانِ نظر ہے جلوۂ بیباکِ حسن
شمعِ خلوت خانہ کیجے ہر چہ بادا باد گل

خاک ہے عرضِ بہارِ صد نگارستاں اسدؔ
حسرتیں کرتی ہیں میری خاطرِ آزاد گل

گرچہ ہے یک بیضۂ طاؤس آسا تنگ دل
ہے چمن سرمایۂ بالیدنِ صد رنگ دل

بیدلوں سے ہے تپش جوں خواہشِ آب از سراب
ہے شرر موہوم[1] اگر رکھتا نہ ہوتے سنگ دل

رشتۂ فہمیدِ ممسک ہے بہ بندِ کوتہی
عقدہ ساں ہے کیسۂ زر پر خیال تنگ دل

ہوں زپا افتادۂ اندازِ یادِ حسنِ سبز
کس قدر ہے نشۂ فرسائے خمارِ بنگ دل

شوقِ بے پروا کے ہاتھوں شکلِ سازِ نادرست
کھینچتا ہے آج نالے خارجِ آہنگ دل

اے اسدؔ خامش! ہے طوطیٔ شکر گفتار طبع
ظاہرا رکھتا ہے آئینہ اسیرِ زنگ دل

ردیف "م"

اثر کمندیٔ فریادِ نارسا معلوم
تھی غبارِ نالہ کمیں گاہِ مدعا معلوم

بقدرِ حوصلۂ عشق جلوہ ریزی ہے
وگرنہ خانۂ آئینہ کی فضا معلوم

بہ نالہ حاصلِ دل بستگی فراہم کر
متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

بہار در گروِ غنچہ شہر جولاں ہے
طلسمِ ناز بجز تنگیٔ قبا معلوم

طلسمِ خاک کمیں گاہِ یک جہاں سودا
بہ مرگ تکیۂ آسائشِ فنا معلوم

---

[1] نسخے میں "معلوم" تھا۔ حاشیے پر اسے "موہوم" بنایا ہے۔

تکلف آئینۂ دو جہاں مدارا ہے — سراغِ یک نگہِ قہر آشنا معلوم

اسدؔ فریفتۂ انتخابِ طرزِ جفا
وگرنہ دلبریِ وعدۂ وفا معلوم

بسکہ ہیں بدمستِ بشکنِ بشکنِ میخانہ ہم — موئے شیشہ کو سمجھتے ہیں خطِ پیمانہ ہم
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس — برق سے کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم خانہ ہم
بسکہ ہر یک موئے زلف افشاں سے ہے تارِ شعاع — پنجۂ خورشید کو سمجھے ہیں دستِ شانہ ہم
ہے فروغِ ماہ سے[1] ہر موج یک تصویرِ خاک — سیل سے فرشِ کتاں کرتے ہیں تا ویرانہ ہم
مشقِ از خود رفتگی سے ہیں بہ گلزارِ خیال — آشنا تعبیرِ خوابِ سبزۂ بیگانہ ہم
فرطِ بیخوابی سے ہیں شب ہائے ہجرِ یار میں — جوں زبانِ شمع داغِ گرمیِ افسانہ ہم
جانتے ہیں جوششِ سودائے زلفِ یار میں — سنبلِ بالیدہ کو موئے سرِ دیوانہ ہم
بسکہ وہ چشم و چراغِ محفلِ اغیار ہے — چپکے چپکے جلتے ہیں جوں شمعِ ماتم خانہ ہم
شامِ غم میں سوزِ عشقِ[2] آتشِ رخسار سے — پر فشانِ سوختن ہیں صورتِ پروانہ ہم

دائم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں اسدؔ
جانتے ہیں سینۂ پرخوں کو زنداں خانہ ہم

رہتے ہیں افسردگی سے سخت بیدردانہ ہم — شعلہا نذرِ سمندر بلکہ آتش خانہ ہم
حسرتِ عرضِ تمنا یاں سے سمجھا چاہیے — دو جہاں حشرِ زبانِ خشک ہیں جوں شانہ ہم

---

[1] یہ مصرع پہلے یوں تھا: "نقشبندِ خاک ہے موج از فروغِ ماہتاب" مگر اس پر "لا لا" لکھ کر حاشیے پر اسے اس طرح بدل دیا۔

[2] پہلے یہی مقطع تھا اور یہ مصرع اس طرح تھا۔ "شامِ غم میں سوزِ عشقِ شمع رویاں سے اسدؔ" پھر اسے بطرزِ بالا بدل دیا گیا اور دوسرا مقطع حاشیے پر درج کر دیا۔

کشتیِ عالم بہ طوفانِ تغافل دے کہ ہیں
عالمِ آبِ گدازِ جوہرِ افسانہ ہم

وحشتِ بے ربطیِ پیچ و خمِ ہستی نہ پوچھ
ننگِ بالیدن ہیں جوں موئے سرِ دیوانہ ہم

باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پر موہوم ہیں
باوجودِ یک جہاں ہنگامہ پیدائی نہیں
م ہیں چراغانِ شبستانِ دلِ پروانہ ہم

محفلیں برہم کرے ہے گنجفہ بازِ خیال
م ہیں ورق گردانیِ نیرنگِ یک بت خانہ ہم

ضعف نے باندھا ہے پیمانِ گراں خوابی اسدؔ
ضعف سے ہے نے قناعت سے یہ ترکِ جستجو
م ہیں وبالِ تکیہ گاہِ ہمتِ مردانہ ہم

ازانجا کہ حسرت کشِ یار ہیں ہم
[1] رقیبِ تمنائے دیدار ہیں ہم

رسیدن گُلِ باغِ واماندگی ہے
عبث محفل آرائے رفتار ہیں ہم

نفس ہو نہ معزولِ شعلہ دُرودن
کہ ضبطِ تپش سے شرر کار ہیں ہم

تغافل کمیں گاہِ وحشت شناسی
نگہبانِ دل ہائے اغیار ہیں ہم

تماشائے گلشن، تمنائے چیدن
بہار آفرینا! گنہگار ہیں ہم

نہ ذوقِ گریباں، نہ پروائے داماں
نگاہ آشنائے گل و خار ہیں ہم

اسدؔ شکوہ کفرِ دعا ناسپاسی
ہجومِ تمنا سے لاچار ہیں ہم

جس دم کہ جادہ وارِ ہو تارِ نفس تمام
پیمائشِ زمینِ رہِ عمر بس تمام

کیا دے صدا کہ الغوثِ گم گشتگاں سو آہ
ہے سرمہ گردِ رہ بگلوئے جرس تمام

---

[1] مرتبہ دیوانوں میں اس مصرع میں سے تخلص نکال کر بصورتِ مذکور بدل دیا ہے اور دونوں غزلوں میں سے پانچ شعر انتخاب کرکے پہلی غزل کے مقطع کو آخر میں ڈال دیا ہے۔

ڈرتا ہوں کوچہ گردیٔ بازارِ عشق سے
ہیں خارِ راہ ۔ جوہرِ تیغِ عسس تمام

اے بالِ اضطراب کہاں تک فسردگی
یک پر زدن تپش میں ہے کارِ قفس تمام

گزرا جو آشیاں کا تصور بوقتِ بند
مژگانِ چشمِ دام ہوئے خار و خس تمام

کرئیے نہ پلٹے غفلت سے شورِ جنوں اسدؔ
اب کی بہار کا یُونہی گزرا برس تمام

مجھ کو دیارِ غیر میں مارا وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بیکسی کی شرم [ٹ]

وہ حلقہ ہائے زُلف کمیں میں ہیں اے خُدا
رکھ لیجو میرے دعوئے وارستگی کی شرم

ردیف "ن"

(۱)

خوش وحشتے کہ عرضِ جنونِ فنا کروں
جُوں گردِ راہ جامۂ ہستی قبا کروں

گر بعدِ مرگ وحشتِ دل کا گلہ کروں
موجِ غبار سے پرِ یک وحشت وا کروں

آ اے بہارِ ناز کہ تیرے خرام سے
دستار گردِ شاخِ گلِ نقشِ پا کروں

خوش افتادگی کہ بہ صحرائے انتظار
جوں جادہ گردِ رہ سے نگہ سرمہ سا کروں

صبر اور یہ ادا کہ دل آوے اسیرِ چاک
درد اور یہ کمیں کہ رہِ نالہ وا کروں

وہ بے دماغِ منتِ اقبال ہوں کہ میں
وحشت بہ داغِ سایۂ بالِ ہما کروں

ٹ قلمی دیوان میں اس طرح کے کوئی شعر نہیں ملتے۔

وہ التماسِ لذتِ بیداد ہوں کہ میں — تیغِ ستم کو پشتِ خمِ التجا کروں

وہ رازِ نالہ ہوں کہ بشرحِ نگاہِ عجز — افشاں غبارِ سرمہ سے فردِ صدا کروں

لوں[1] وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش اسدؔ — لیکن یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں

مطبوعہ

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش ولے
غالبؔ یہ بیم ہے کہ کہاں سے ادا کروں

وہ[2] فراق اور وہ وصال کہاں — تم — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصتِ کاروبارِ شوق کسے — م — ذوقِ نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل، وہ دماغ بھی نہ رہا — م — شورِ سودائے خط و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے — م — اب وہ رعنائیِ خیال کہاں

ایسا آساں نہیں لہو رونا — م — دل میں طاقت، جگر میں حال کہاں

ہم سے چھوٹا قمار خانۂ عشق — م — واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

فکرِ دنیا میں سر کھپاتا ہوں — م — میں کہاں اور یہ وبال کہاں

فلکِ سفلہ بے محابا ہے — اس ستم گر کو انفعال کہاں

بوسہ میں وہ مضائقہ نہ کرے — پر مجھے طاقتِ سوال کہاں

مضمحل ہو گئے قویٰ غالبؔ
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

---

[1] مروجہ دیوانوں میں اس غزل کا فقط مقطع ملتا ہے اور اس میں بھی یہ فرق ہے کہ تخلص "اسد" کو بدل کر "غالب" کیا ہے۔

[2] یہ غزل قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہے۔ مطبوعہ دیوانوں میں اس کے مقطع سے پہلے کے دو شعر نہیں ملتے۔

غنچۂ[ل] ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں قلمی بوسے کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں
پرسشِ طرزِ دلبری کیجیے کیا کہ بن کہے م اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں
رات کے وقت مے پیے، ساتھ رقیب کو لیے م آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں
بزم میں اس کے روبرو کیوں نہ خموش بیٹھیے م اس کی تو خامشی میں بھی ہے یہی مدعا کہ یوں
میں نے کہا کہ "بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی" م سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ "یوں"
جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکہ ہو رشکِ فارسی م { شعرِ اسدؔ کے ایک دو پڑھ کے اسے سنا کہ یوں
گفتۂ غالبؔ ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں }

غیر سے رات کیا بنی، یہ جو کہا، تو دیکھیے مطبو سامنے آن بیٹھنا اور یہ دیکھنا کہ یوں
مجھ سے کہا جو یار نے "جاتے ہیں ہوش کس طرح" دیکھ کے میری بیخودی چلنے لگی ہوا، کہ یوں
کب مجھے کوئے یار میں رہنے کی وضع یاد تھی؟ آئینہ دار بن گئی، حیرتِ نقشِ پا کہ یوں

گر ترے دل میں ہو خیال، وصل میں شوق کا زوال
موجِ محیطِ آب میں، مارے ہے دست و پا کہ یوں

آنسو کہوں کہ آہ، سوارِ ہوا کہوں ایسا عناں گسیختہ آیا کہ کیا کہوں
اقبالِ کلفتِ دلِ بے مدعا رسا اختر کو داغِ سایۂ بالِ ہما کہوں
مضمونِ وصل ہاتھ نہ آیا، مگر اسے اب طائرِ پریدۂ رنگِ حنا کہوں
حلقے ہیں چشمہائے کشادہ بسوئے دل م ہر تارِ زلف کو نگہِ سرمہ سا کہوں
دزدیدنِ دلِ ستم آمادہ ہے محال مژگاں کہوں کہ جوہرِ تیغِ قضا کہوں

ل قلمی نسخے کے متن میں اس غزل کے چھ شعر درج ہیں، مروجہ غزل کے باقی چار شعر حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔

طرزِ آفرینِ نکتہ سرائیِ طبع ہے ۔ آئینۂ خیال کو طوطی نما کہوں
غالب ہے رتبۂ فہم تصور سے کچھ پرے ۔ ہے عجزِ بندگی جو علی کو خدا کہوں
منہ سے مدحِ ناز کے باہر نہ آسکا ۔ جلوہ گر اک ادا ہو تو اُسے اپنی قضا کہوں
میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش ۔ تو اور ایک وہ نشنیدن کہ کیا کہوں
ظالم مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ
ہے ہے خدا نہ کردہ، تجھے بیوفا کہوں!

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن ۔ ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن
قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں ۔ رنگ لاوے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن
غرۂ رفعت بنائے عالمِ امکاں نہ ہو
غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ ہو ۔ اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن
نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے ۔ بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن
دھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں ۔ خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں
کسو کو ز خود رستہ کم دیکھتے ہیں ۔ کہ آہو کو پابندِ رم دیکھتے ہیں
خطِ لختِ دل یک قلم دیکھتے ہیں ۔ مژہ کو جواہر رقم دیکھتے ہیں
دل آشفتگاں خالِ کنجِ دہن کے ۔ سویدا میں سیرِ عدم دیکھتے ہیں
ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم ۔ قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں
تماشا کر اے محوِ آئینہ داری ۔ تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

سراغِ تفِ نالہ لے داغِ دل سے — کہ شب رَو کا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

م

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

مانعِ دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں — م — ایک چکّر ہے مرے پاؤں میں زنجیر نہیں

شوق اس دشت میں دوڑائے ہے مجھ کو کہ جہاں — م — جادہ غیر از نگہِ دیدۂ تصویر نہیں

حسرتِ لذّتِ آزار رہی جاتی ہے — م — جادۂ راہِ وفا جز دمِ شمشیر نہیں

رنجِ نومیدیٔ جاوید گوارا رہیو — م — خوش ہوں گر نالہ زبونی کشِ تاثیر نہیں

سر کھجاتا ہے جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے — م — لذتِ سنگ بہ اندازۂ تقریر نہیں

آئینہ دام کو پردے میں چھپاتا ہے عبث — کہ پری زادِ نظر قابلِ تسخیر نہیں

مثلِ گل زخم ہے میرا بھی سناں سے توام — تیرا ترکش ہی کچھ آبستنیِ تیر نہیں

جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے — م — کوئی تقصیر بجز خجلتِ تقصیر نہیں

میرؔ کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ — جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

ریختہ کا وہ ظہوری ہے بقولِ ناسخ }
غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخ } — آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

جانیکہ پائے سیلِ بلا درمیاں نہیں[۱] — ذی — دیوانگاں کو واں ہوسِ خانماں نہیں

---

۱ یہ شعر مولانا حسرت اور مولانا نظامی کے شائع کردہ دیوان کے آخر میں درج ہے۔

۲ یہ دونوں ہم طرح غزلیں میرزا غالبؔ کی ابتدائی مشق اور انتہائی پختگی کے نمونے پیش کرتی ہیں۔ پہلی غزل نسخے کی ہے اور دوسری غزل اور قطعہ مروجہ دیوان میں متداول ہے۔

کس جرم سے ہے چشم تجھے حسرتِ قبول — برگِ حنا مگر مژۂ خونِ فشاں نہیں

ہر رنگِ گردش آئنہ ایجادِ درد ہے — اشکِ سحاب جز بوداعِ خزاں نہیں

جز عجز کیا کروں بہ تمنائے بیخودی — طاقت حریفِ سختیٔ خوابِ گراں نہیں

عبرت سے پوچھ دردِ پریشانیٔ نگاہ — یہ گردِ وہم جز بسرِ امتحاں نہیں

گل غنچگی میں غرقۂ دریائے رنگ ہے — اے آگہی! فریبِ تماشا کہاں نہیں

برق بجانِ حوصلہ آتش فگن اسدؔ
اے دل فسردہ طاقتِ ضبطِ فغاں نہیں

ہم پر جفا سے ترکِ وفا کا گماں نہیں — اک چھیڑ ہے وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا — پرسش ہے اور پائے سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز — نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں نہ دیجیے دشنام ہی سہی — آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

ہر چند جاں گدازیٔ قہر و عتاب ہے — ہر چند پشتِ گرمیٔ تاب و تواں نہیں

جاں مطربِ ترانۂ ہل من مزید ہے — ق — لب پردہ سنجِ زمزمۂ الاماں نہیں

خنجر سے چیر سینہ اگر دل نہ ہو دو نیم — دل میں چھری چبھو مژہ گر خونچکاں نہیں

ہے ننگِ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو — ہے عارِ دل نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب — سو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں — گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

پاتا ہوں اس سے داد کچھ اپنے سخن کی میں — روح القدس اگرچہ مرا ہم زباں نہیں

جاں ہے بہائے بوسہ ولے کیوں کہے ابھی
غالبؔ کو جانتا ہے کہ وہ نیم جاں نہیں

ہے ترحّم آفریں آرائشِ بیداد یاں قمی اشکِ چشمِ دام ہے پروانۂ صیاد یاں

ہے گدازِ مومِ اندازِ چکیدن ہائے خوں نیشِ زنبورِ عسل ہے نشترِ فصاد یاں

ناگوارا ہے ہمیں احسانِ صاحب دولتاں ہے زرِ گُل بھی نظر میں جوہرِ فولاد یاں

دل[1] لگا کر لگ گیا اُن کو بھی تنہا بیٹھنا م بارے اپنے دردِ دل کی ہم نے پائی داد یاں

جُنبشِ دل سے ہوئے ہیں عقدہ ہائے کار وا کمتریں مزدورِ سنگیں دست ہے فرہاد یاں

ہے مری وحشت عدوئے اعتباراتِ جہاں
ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام م مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

قطرہ ہائے خونِ بسمل زیبِ داماں ہیں اسدؔ
ہے تماشا کردنی گلچینیِ جلاد یاں

سرشکِ آشفتہ سر تھا قطرہ زن مژگاں سے جانے میں قمی رہے یاں شوخیِ رفتار سے پا آستانے میں

ہجومِ مژدۂ دیدار و پروازِ تماشا ہا گُلِ اقبالِ خس ہے چشمِ بلبل آشیانے میں

ہوئی یہ بے خودی چشم و زباں کو تیرے جلوے سے کہ طوطی قفلِ زنگ آلودہ ہے آئینہ خانے میں

ترے کوچے میں ہے مشاطۂ واماندگی قاصد پرِ پروازِ زلفِ باز ہے ہدہد کے شانے میں

کُجا معزولیِ آئینہ، کو ترکیبِ خود آرائی نمد در آب ہے اے سادہ پُرکار اس بہانے میں

بحکمِ عجز ابروئے سرِ تو حیرت ایما ہے کہ یاں گم کر جبینِ سجدہ فرسا آستانے میں

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا م تعجب سے وہ بولا "یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں"

دلِ نازک پہ اُس کے رحم آتا ہے مجھے غالبؔ م
نہ کر بیباک اس کافر کو اُلفت آزمانے میں
نہ کر سرگرم اس کافر کو اُلفت آزمانے میں

---

[1] یہ اور اس کے بعد کا شعر دونوں قلمی نسخے کے حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔

فزوں کی دوستوں نے حرصِ قاتل ذوقِ کشتن میں
ہوئے ہیں بخیہ ہائے زخم، جوہر تیغِ دشمن میں

تماشا کردنی ہے لطفِ زخمِ انتظار اے دل
سویدا داغِ مرہم، مردمک ہے چشمِ سوزن میں

دل و دین و خرد تاراجِ نازِ جلوہ پیرائی
ہوا ہے جوہرِ آئینہ خیلِ مور خرمن میں

ہوئی تقریبِ منعِ شوقِ دیدن خانہ ویرانی
ہوئی ہے مانعِ ذوقِ تماشا خانہ ویرانی
کفِ سیلاب باقی ہے برنگِ پنبہ روزن میں

نکوہش مانعِ دیوانگی ہائے جنوں آئی
لگایا خندۂ ناصح نے بخیہ جیب و دامن میں

اسد زندانیِ تاثیرِ الفت ہائے خوباں ہیں
خمِ دستِ نوازش ہو گیا ہے طوقِ گردن میں

نہیں ہے زخم کوئی بخیے کے درخور مرے تن میں مطلع
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں

وہ وحشت خانۂ بیدادِ کاوش ہائے مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرا ہر قطرہ خوں تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی
شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

نکوہش، مانعِ بے ربطیِ شورِ جنوں آئی
ہوا ہے خندۂ احباب بخیہ جیب و دامن میں

ہوئے اُس مہر وش کے جلوۂ تمثال کے آگے
پر افشاں جوہر آئینے میں مثلِ ذرہ روزن میں

نہ جانوں نیک ہوں یا بد ہوں، پر صحبت مخالف ہے
جو گل ہوں تو ہوں گلخن میں، جو خس ہوں تو ہوں گلشن میں

ہزاروں دل دیے جوشِ جنونِ عشق نے مجھ کو
سیہ ہو کر سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں
میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں

آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے
ہم بھی اک اپنی ہوا باندھتے ہیں

حسنِ افسردہ دلی ہا رنگیں
شوق کو پا بہ حنا باندھتے ہیں

تیرے بیمار پہ ہیں فریادی
وہ جو کاغذ میں دوا باندھتے ہیں

قید میں بھی ہے اسیری آزاد
چشمِ زنجیر کو وا باندھتے ہیں

شیخ جی کعبہ کا جانا معلوم
آپ مسجد میں گدھا باندھتے ہیں

کس کا دل زلف سے بھاگا کہ اسدؔ
دستِ شانہ بہ قفا باندھتے ہیں

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
قلمی — ہم بھی مضموں کی ہوا باندھتے ہیں

تیری فرصت کے مقابل اے عمر!
م — برق کو پابحنا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم
م — اشک کو بے سروپا باندھتے ہیں

نشۂ رنگ سے ہے واشدِ گل
م — مست کب بندِ قبا باندھتے ہیں

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
م — لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی وا ماندگیاں
م — آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

سادہ پُرکار ہیں خوباں کہ اسدؔ
سادہ پُرکار ہیں خوباں غالبؔ
م — ہم سے پیمانِ وفا باندھتے ہیں

صاف ہے از بسکہ عکسِ گل سے گلزارِ چمن
قلمی — جانشینِ جوہرِ آئینہ ہے خارِ چمن

ہے نزاکت بسکہ فصلِ گل میں معمارِ چمن
قالبِ گل میں ڈھلی ہے خشتِ دیوارِ چمن

تیری آرائش کا استقبال کرتی ہے بہار
جوہرِ آئینہ ہے یاں نقشِ احضارِ چمن

برشگالِ دیدۂ عاشق ہے دیکھا چاہیے
م — کھل گئی مانندِ گل سو جا سے دیوارِ چمن

۱؎ یہ شعر مولانا حسرت موہانی اور مولانا نظامی بدایونی کے مطبوعہ دیوانوں کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کی ذیل میں موجود ہے

بسکہ پائی یار کی رنگیں ادائی سے شکست
ہے کُلاہِ نازِ گُل برطاقِ دیوارِ چمن

اُلفتِ گُل سے غلط ہے دعویٔ وارستگی
سرو ہے با وصفِ آزادی گرفتارِ چمن

وقت ہے گر بلبلِ مسکیں زلیخائی کرے
یُوسفِ گُل جلوہ فرما ہے بہ بازارِ چمن

وحشت افزا گریہ ہا موقوفِ فصلِ گُل اسدؔ
چشمِ دریا ریز ہے میزابِ سرکارِ چمن

جُوں مردمکِ چشم سے ہوں جمع نگاہیں قطعہ
خوابیدہ بہ حیرت کدۂ داغ ہیں آہیں

پھر حلقۂ کاکل میں پڑیں دید کی راہیں
جوں دود فراہم ہوئیں روزن میں نگاہیں

پایا سرِ ہر ذرہ جگر گوشۂ وحشت
ہیں داغ سے معمور شقائق کی کلاہیں

کس دل پہ ہے عزمِ صفِ مژگانِ خود آرا
آئینہ کی پایاب سے اُتری ہیں سپاہیں

دیر و حرم آئینۂ تکرارِ تمنا
واماندگیِ شوق تراشے ہے پناہیں

یہ مطلع اسدؔ جوہرِ افسونِ سخن ہو
گر عرضِ تپاکِ جگرِ سوختہ چاہیں

حیرت کشِ یک جلوۂ معنی ہیں نگاہیں مطلع
کھینچوں ہوں سویدائے دلِ چشم سے آہیں

مت مردمکِ دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع سویدائے دلِ چشم میں آہیں

تن بہ بندِ ہوس در نہ دادہ رکھتے ہیں قطعہ
دل زکارِ جہاں اوفتادہ رکھتے ہیں

تمیزِ زشتی و نیکی میں لاکھ باتیں ہیں
بہ عکسِ آئنہ یک فردِ سادہ رکھتے ہیں

برنگِ سایہ ہمیں بندگی میں ہے تسلیم
کہ داغِ دل بہ جبینِ کُشادہ رکھتے ہیں

بہ زاہداں رگِ گردن ہے رشتۂ زنّار
سرے بپائے بتے نانہادہ رکھتے ہیں

ساحتِ بیہدہ گوئی ہیں ناصحانِ عزیز
دلے بہ دستِ نگارے نہ دادہ رکھتے ہیں

برنگِ سبزہ عزیزانِ بد زباں یک دست
ہزار تیغ بزہر آب دادہ رکھتے ہیں

م زمانہ سخت کم آزار ہے بجانِ اسد
وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

---

(۲)

طاؤس نمط داغ کے گر رنگ نکالوں
یک فرد نسب نامۂ نیرنگ نکالوں

کو تیزیِ رفتار کہ صحرا سے زمیں کو
جوں قمریِ بسمل تپش آہنگ نکالوں

دامانِ شفق طرفِ نقابِ مہِ نو سے
ناخن کو جگر کاوی میں بیرنگ نکالوں

کیفیتِ دیگر ہے فشارِ دلِ خوں میں
یک غنچہ سے صد خُمِ مے گلرنگ نکالوں

پیمانۂ وسعت کدۂ شوق ہوں اے رشک!
محفل سے مگر شمع کو دل تنگ نکالوں

گر ہو بلدِ شوق مری خاک کو وحشت
صحرا کو بھی گھر سے کئی فرسنگ نکالوں

فریادِ اسد غفلتِ رسوائیِ دل سے
کس پردے میں فریاد کی آہنگ نکالوں

کس ضعف میں امید کو دل تنگ نکالوں
میں خار ہوں آتش میں چھپوں رنگ نکالوں

نے کوچۂ رسوائی و زنجیر پریشاں
اے نالہ میں کس پردے میں آہنگ نکالوں

یک نشو و نما جا نہیں جولانِ ہوس کو
ہر چند بمقدارِ دلِ تنگ نکالوں

یک جلوۂ خورشید خریدارِ وفا ہے
جوں ذرہ صد آئینہ بیرنگ نکالوں

افسردۂ تمکیں ہے نفس گرمیِ احباب
پھر شیشے سے عطرِ شررِ سنگ نکالوں

ضعف آئینہ پردازیِ دستِ دگراں ہے
تصویر کے پردے میں مگر رنگ نکالوں

ہے غیرتِ اُلفت کہ اسدؔ اُس کی ادا پر
گر دیدہ و دل صلح کریں جنگ نکالوں

سودائے عشق سے دمِ سردِ کشیدہ ہوں ۔۔۔ شامِ خیالِ زُلف سے صبحِ دمیدہ ہوں
دورانِ سر سے گردشِ ساغر ہے متّصل ۔۔۔ خُمخانۂ جنوں میں دماغِ رسیدہ ہوں
کی متّصل ستارہ شماری میں عمر صرف ۔۔۔ تسبیحِ اشک ہائے زِمژگاں چکیدہ ہوں
ظاہر ہیں میری شکل سے افسوس کے نشاں ۔۔۔ چُوں شانہ پُشتِ دستِ بدنداں گزیدہ ہوں
ہوں گرمیٔ نشاطِ تصوّر سے نغمہ سنج ۔۔۔ میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں
دیتا ہوں کشتگاں کو سخن سے سرِ تپش ۔۔۔ مضرابِ تارہائے گلوئے بُریدہ ہوں
ہے جنبشِ زباں بہ دہن سخت ناگوار ۔۔۔ خوں نابۂ ہلاہلِ حسرت چشیدہ ہوں

جوں بوئے گل ہوں گرچہ گرانبارِ منّتِ زر
لیکن اسدؔ بوقتِ گزشتن جریدہ ہوں

خوں در جگر نہفتہ، بہ زردی رسیدہ ہوں ۔۔۔ خود آشیانِ طائرِ رنگِ پریدہ ہوں
ہے دستِ رو بسیرِ جہاں بستنِ نظر ۔۔۔ پائے ہوس بدامنِ مژگاں کشیدہ ہوں
میں چشمِ واکشادہ و گلشن نظر فریب ۔۔۔ لیکن عبث کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں
تسلیم سے یہ نالۂ موزوں ہوا حصول ۔۔۔ اے بے خبر! میں نغمۂ چنگِ خمیدہ ہوں
پیدا نہیں ہے اصلِ تگ و تازِ جستجو ۔۔۔ مانندِ موجِ آب زبانِ بریدہ ہوں

ے یہ دونوں شعر مولانا حسرت موہانی اور مولانا نظامی کے مطبوعہ دیوانوں کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کے ضمن میں درج ہیں۔ ان میں سے دوسرا شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر لکھا ہوا ہے، متن میں نہیں ہے۔

سر پر مرے وبالِ ہزار آرزو رہا
یارب میں کس غریب کا بختِ رمیدہ ہوں

میں بے ہنر کہ جوہرِ آئینہ تھا عبث
پائے نگاہِ خلق میں خارِ خلیدہ ہوں

میرا نیاز و عجز ہے مُفتِ بتاں اسدؔ
یعنی کہ بندۂ بدرمِ ناخریدہ ہوں

بقدرِ لفظ و معنی فکرت احرامِ گریباں ہیں
وگرنہ کیجیے جو ذرّہ عریاں ہم نمایاں ہیں

عروجِ نشّۂ واماندگی پیمانۂ محمل تر
برنگِ ریشۂ تاک آبلے جادے میں پنہاں ہیں

بوحشت گاہِ امکاں اتفاقِ چشم مشکل ہے
مہ و خورشید باہم سازِ یک خوابِ پریشاں ہیں

نہ انشا معنیِ مشغول نہ املا صورتِ موزوں
عنایت نامہ ہائے اہلِ دنیا ہرزہ عنواں ہیں

طلسمِ آفرینش حلقۂ یک بزمِ ماتم ہے
زمانے کی شبِ یلدا سے موئے سر پریشاں ہیں

یہ کس ناہید کی تمثال کا ہے جلوہ سیمابی
کہ مثلِ ذرّہ ہائے خاک آئینے پرافشاں ہیں

مگر آتش ہمارا کوکبِ اقبال چمکا دے
وگرنہ مثلِ خارِ خشک۔ مردودِ گلستاں ہیں

اسدؔ بزمِ تماشا میں تغافل پردہ داری ہے
اگر ڈھانپے تو آنکھیں ڈھانپ ہم تصویرِ عریاں ہیں

مرگِ شیریں ہو گئی تھی کوہکن کی فکر میں
تھا حریرِ سنگ سے قطعِ کفن کی فکر میں

فرصتِ یک چشمِ حیرت شش جہت آغوش ہے
ہوں سپند آسا وداعِ انجمن کی فکر میں

وہ غریبِ وحشت آبادِ تسلّی ہوں جسے
کوچہ دے ہے زخمِ دل صبحِ وطن کی فکر میں

سایۂ گل داغ و جوشِ نکہتِ گل موجِ درد
رنگ کی گرمی ہے تاراجِ چمن کی فکر میں

فالِ ہستی خار خارِ وحشتِ اندیشہ ہے
شوخیِ سوزن ہے ساماں پیرہن کی فکر میں

غفلتِ دیوانہ جز تمہیدِ آگاہی نہیں
مغزِ سر خوابِ پریشاں ہے سخن کی فکر میں

مجھ میں اور مجنوں میں وحشت ساز دعویٰ ہے اسد
برگِ برگِ بید ہے ناخن زدن کی فکر میں

اے نوا سازِ تماشا سر بکف جلتا ہوں میں
اک طرف جلتا ہے دل اور اک طرف جلتا ہوں میں

شمع ہوں لیکن بہ پا در رفتہ خارِ جستجو
مدّعا گم کردہ ہر سو ہر طرف جلتا ہوں میں

ہے مساسِ دستِ افسوس آتش انگیزِ تپش
بے تکلف آپ پیدا کر کے تف جلتا ہوں میں

ہے تماشا گاہِ سوزِ تازہ ہر یک عضوِ تن
جُوں چراغانِ دوالی صف بصف جلتا ہوں میں

شمع ہوں تو بزم میں جا پاؤں غالب کی طرح
بے محل اے مجلس آرائے نجف جلتا ہوں میں

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں
برنگِ جادہ سرِ کوئے یار رکھتے ہیں

برہنہ مستیِ صبحِ بہار رکھتے ہیں
جنونِ حسرتِ یک جامہ وار رکھتے ہیں

طلسمِ مستیِ دل آنسوئے ہجومِ سرشک
ہم ایک میکدہ دریا کے پار رکھتے ہیں

ہمیں حریرِ شرر بافِ سنگ خلعت ہے
یہ ایک پیرہنِ زرنگار رکھتے ہیں

نگاہِ دیدۂ نقشِ قدم ہے جادۂ راہ
گزشتگاں اثرِ انتظار رکھتے ہیں

ہُوا ہے گریۂ بیباک ضبط سے تسبیح
ہزار دل پہ ہم اک اختیار رکھتے ہیں

بساطِ ہیچ کسی ہیں برنگِ ریگِ رواں
ہزار دل بہ وداعِ قرار رکھتے ہیں

جنونِ فرقتِ یارانِ رفتہ ہے غالب
بسانِ دشت دلِ پُر غبار رکھتے ہیں

بغفلت عطرِ گل ہم آگہی مخمور ملتے ہیں
چراغانِ تماشا چشمِ صد ناسور رکھتے ہیں

رہا کس جرم سے میں بیقرارِ داغ ہم طرحی
سمندر کو پرِ پروانہ سے کافور ملتے ہیں

چمن نامحرمِ آگاہیِ دیدارِ خوباں ہے
سحر گلہائے نرگس چند چشمِ کور ملتے ہیں

کجا جوہر چہ عکسِ خطِ بتاں وقتِ خود آرائی
دلِ آئینہ زیرِ پائے خیلِ مور ملتے ہیں

تماشائے بہارِ آئینہ پردازِ تسکیں ہے
کفِ گلبرگ سے پائے دلِ رنجور ملتے ہیں

گرانجانی سبک سار و تماشا بے دماغ آیا
کفِ افسوسِ فرصت سنگِ کوہِ طور ملتے ہیں

اسدؔ حیرت کشِ یک داغِ مشک اندود ہے یارب
لباسِ شمع پر عطرِ شبِ دیجور ملتے ہیں

ہوئی ہیں آبِ شرمِ کوششِ بے جا سے تدبیریں
عرق ریزِ تپش ہیں موج کی مانند زنجیریں

خیالِ سادگی ہائے تصورِ نقشِ حیرت ہے
پرِ عنقا پہ رنگِ رفتہ سے کھینچی ہیں تصویریں

زبس ہر شمع یاں آئینۂ حیرت پرستی ہے
کرے ہیں غنچۂ منقارِ طوطی نقشِ گل گیریں

سپند آہنگیِ ہستی و سعیِ نالہ فرسائی
غبار آلودہ ہیں جوں دودِ شمعِ کشتہ تقریریں

درشتیِ تاملِ پنبۂ گوشِ حریفاں ہے
وگرنہ خواب کی مضمر ہیں افسانے میں تعبیریں

بتانِ شوخ کی تمکینِ بعد از قتل کی حیرت
بیاضِ دیدۂ نخچیر پہ کھینچے ہے تصویریں

اسدؔ طرزِ عروجِ اضطرابِ دل کو کیا کہئے
سمجھتا ہوں تپش کو الفتِ قاتل کی تاثیریں

بے دماغی حیلہ جوئے ترکِ تنہائی نہیں
ورنہ کیا موجِ نفس زنجیرِ رسوائی نہیں

وحشیِ خوکردۂ نظارہ ہے حیرت جسے
حلقۂ زنجیر جز چشمِ تماشائی نہیں

قطرہ کو جوشِ عرق کرتا ہے دریا دستگاہ
عجزِ حیا پہ کارِ سعیِ بے سر و پائی نہیں

چشمِ نرگس میں نمک بھرتی ہے شبنم سے بہار
فرصتِ نشو و نما سازِ شکیبائی نہیں

کس کو دوں یارب حسابِ سوزناکیہائے دل
آمد و رفتِ نفس جز شعلہ پیمائی نہیں

مت رکھ اے انجام غافل سازِ ہستی پر غرور
مو کے پر ہیں سر و برگِ خود آرائی نہیں

سایۂ افتادگی بالین و بستر ہوں اسدؔ
جوں صنوبر دل سراپا قامت آرائی نہیں

ظاہرا سرپنجۂ افتادگاں گیرا نہیں
ورنہ کیا دامن کشِ حسرت پۂ نقشِ پا نہیں

آنکھیں پتھرائی ہیں نامحسوس ہے تارِ نگاہ
ہے زمیں از بسکہ سنگیں جادہ بھی پیدا نہیں

ہو چکے ہم جادہ ساں صد بار قطع و تاہنوز
زینتِ یک پیرہن جوں دامنِ صحرا نہیں

ہو سکے ہے پردۂ جوشیدنِ خونِ جگر
اشک بعد ضبطِ غیر از پنبۂ مینا نہیں

ہو سکے کب کلفتِ دل مانعِ طوفانِ اشک
گردِ ساحل سنگِ راہِ جوششِ دریا نہیں

ہے طلسمِ دہر میں صد حشر پاداشِ عمل
آگہی غافل کہ یک امروز بے فردا نہیں

بسمل اس تیغِ دو دستی کا نہیں بچتا اسدؔ
عافیت بیزار باشغلِ کجبتین اچھا نہیں

ضبط سے مطلب بجز وارستگی دیگر نہیں
دامنِ تمثال آبِ آئینہ سے تر نہیں

ہے[۱] وطن سے باہر اہلِ دل کی قدر و منزلت
عزلت آبادِ صدف میں قیمتِ گوہر نہیں

باعثِ ایذا ہے برہم خوردنِ بزمِ سرور
لختِ لختِ شیشۂ بشکستہ جز نشتر نہیں

واں سیاہی مردمک ہے اور یہاں داغِ شراب
مہ حریفِ نازشِ ہم چشمیٔ ساغر نہیں

ہے فلک بالانشینِ فیضِ خم گردیدنی
عاجزی سے ظاہرا رتبہ کوئی برتر نہیں

۱؎ یہ مصرع متن میں یوں تھا: "ہوتے ہیں بے قدر در کنجِ وطن صاحب دلاں"

دل کو اظہارِ سخن اندازِ فتح الباب ہے
یاں صریرِ خامہ غیر از اصطکاکِ در نہیں

کب تلک پھیرے اسدؔ لب ہائے تفتہ پر زباں
طاقتِ لب تشنگی اے ساقیِ کوثر نہیں

دیکھئے مت چشمِ کم سے سوئے ضبطِ افسردگاں
جوں صدف پُر دُر ہیں دنداں در جگر افشردگاں

گر غمِ تکلیفِ دل رنجیدہ ہے از بسکہ چرخ
قرصِ کافوری ہے بہرِ جانِ سرما خوردگاں

رنجشِ دل یک جہاں ویراں کرے گی اے فلک
دشت ساماں ہے غبارِ خاطرِ افسردگاں

ہاتھ پہ ہو ہاتھ تو درسِ تاسف ہی سہی
شوقِ مفتِ زندگی ہے اے بہ غفلت مردگاں

خار سے گل سینہ افگارِ جفا ہے اے اسدؔ
برگ ریزی ہے پر افشانیِ ناوک خوردگاں

---

(۳)

کی وفا[۵] ہم سے تو غیر اُس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو بُرا کہتے ہیں

آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، اُنھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

دل میں آجائے ہے، ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود
قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

پائے افگار پہ جب سے تجھے رحم آیا ہے
خارِ رہ کو ترے ہم مہر گیا کہتے ہیں

اک شرر دل میں ہے اس سے کوئی گھبرائے گا کیا
آگ مطلوب ہے ہم کو جو ہوا کہتے ہیں

دیکھئے لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ
اُس کی ہر بات پہ ہم "نامِ خدا" کہتے ہیں

---

۵ یہاں سے ردیفِ 'ن' کی وہ غزلیں شروع ہوتی ہیں جن کا ہم طرح کوئی شعر قلمی دیوان میں نہیں ہے۔

وحشت و شیفتہ اب مرثیہ کہویں شاید
مر گیا غالبؔ آشفتہ نوا کہتے ہیں

آبرو کیا خاک اُس گُل کی جو گلشن میں نہیں
ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں

ضعف سے اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع اجزائے نگاہِ آفتاب
ذرّے اس کے گھر کی دیواروں کے روزن میں نہیں

کیا کہوں، تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ، نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

زخم سلوانے سے مجھ پر چارہ جوئی کا ہے طعن
غیر سمجھا ہے کہ لذّت زخمِ سوزن میں نہیں

بس کہ ہیں ہم اک بہارِ ناز کے مارے ہوئے
جلوۂ گل کے سوا گرد اپنے مدفن میں نہیں

قطرہ قطرہ اک ہیولیٰ ہے نئے ناسور کا
خوں بھی ذوقِ درد سے فارغ مرے تن میں نہیں

لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری
مَوجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا ناتوانی کی نمو
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

تھی وطن میں شان کیا غالبؔ کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلّف ہوں، وہ مشتِ خس کہ گلخن میں نہیں

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف سے طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے
بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجھ کو ستم گر! ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

عشق تاثیر سے نومید نہیں — جاں سپاری شجرِ بید نہیں
سلطنت دست بدست آئی ہے — جامِ مے خاتمِ جمشید نہیں
ہے تجلی تری سامانِ وجود — ذرہ بے پرتوِ خورشید نہیں
رازِ معشوق نہ رسوا ہو جائے — ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں
گردشِ رنگِ طرب سے ڈر ہے — غمِ محرومیِ جاوید نہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں اُمید پہ لوگ
ہم کو جینے کی بھی اُمید نہیں

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں — کافر ہوں، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
کب سے ہوں، کیا بتاؤں جہانِ خراب میں — شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں
تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر — آنے کا عہد کر گئے آئے جو خواب میں
قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں
مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام؟ — ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں
جو مُنکرِ وفا ہو، فریب اُس پہ کیا چلے — کیوں بدگُماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں؟
میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے — ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں؟
میں اور حظِّ وصل، خدا ساز بات ہے — جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں
ہے تیوری چڑھی ہوئی اندر نقاب کے — ہے اک شکن پڑی ہوئی طرفِ نقاب میں
لاکھوں لگاؤ، ایک چرانا نگاہ کا — لاکھوں بناؤ، ایک بگڑنا عتاب میں
وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے؟ — جس نالہ سے شگاف پڑے آفتاب میں
وہ سحر مدعا طلبی میں نہ کام آئے؟ — جس سحر سے سفینہ رواں ہو سراب میں
غالب چھٹی شراب، پر اب بھی کبھی کبھی — پیتا ہوں روزِ ابر و شبِ ماہتاب میں

کل کے لیے کر آج نہ خسّت شراب میں
یہ سوءِ ظن ہے ساقیِ کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل؟ کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دمِ سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رَو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود، ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم، اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئنہ دائم نقاب میں

ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیمِ دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں، بندگیِ بوتراب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش جانتا نہ ترے رہگزر کو میں

ہے کیا؟ جو کس کے باندھیے میری بلا ڈرے
کیا جانتا نہیں ہوں تمہاری کمر کو میں

لو، وہ بھی کہتے ہیں کہ 'یہ بے ننگ نام ہے'
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیداد گر کو میں

پھر بے خودی میں بھول گیا راہِ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

اپنے پہ کر رہا ہوں قیاس اہلِ دہر کا — سمجھا ہوں دل پذیر متاعِ ہنر کو میں

غالبؔ خدا کرے کہ سوارِ سمندِ ناز
دیکھوں علی بہادرِ عالی گہر کو میں

ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں — غیر کی بات بگڑ جائے تو کچھ دُور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق — مژدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم — لوگ کہتے ہیں کہ "ہے" پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

حسرت اے ذوقِ خرابی کہ وہ طاقت نہ رہی — عشقِ پُر عربدہ کی گوں تنِ رنجور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ ہم لیں گے قیامت میں تمہیں — کس رعونت سے وہ کہتے ہیں کہ "ہم حور نہیں"

ظلم کر ظلم، اگر لطف دریغ آتا ہو — تو تغافل میں کسی رنگ سے معذور نہیں

صاف دُردی کشِ پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ — وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

نالہ جز حسنِ طلب اے ستم ایجاد نہیں — ہے تقاضائے جفا، شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو، کیا خوب! — ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں، پہ وسعت معلوم! — دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب — لطمۂ موج کم از سیلیِ استاد نہیں

وائے محرومیِ تسلیم و بدا حالِ وفا — جانتا ہے کہ ہمیں طاقتِ فریاد نہیں

رنگِ تمکینِ گل و لالہ پریشاں کیوں ہے؟ — گر چراغانِ سرِ رہگذرِ باد نہیں؟

سبزۂ گُل کے تلے بند کرے ہے گلچیں
مژدہ اے مُرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش گویا
دی ہے جائے دہن اُس کو دمِ ایجاد "نہیں"
کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں
کرتے کس مُنہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ
تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں؟

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں
تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ بزم میں؟
ہو غم ہی جاں گداز تو غمخوار کیا کریں

ہو گئی ہے غیر کی شیریں زبانی کارگر
عشق کا اُس کو گماں ہم بے زبانوں پر نہیں

یہ ہم جو ہجر میں دیوار و در کو دیکھتے ہیں
کبھی صبا کو کبھی نامہ بر کو دیکھتے ہیں
وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں
نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں
ترے جواہرِ طرفِ کلہ کو کیا دیکھیں
ہم اوجِ طالعِ لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شبِ فراق سے روزِ جزا زیاد نہیں

کوئی کہے کہ "شبِ مہ میں کیا برائی ہے"
بلا سے آج اگر دن کو ابر و باد نہیں

جو آؤں سامنے اُن کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں
کہ "آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں"

علاوہ عید کے ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدائے کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم، ہمیں کیا کام؟
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُن کے وعدے کا ذکر اُن سے کیوں کرو غالبؔ
یہ کیا؟ کہ تم کہو اور وہ کہیں کہ "یاد نہیں"

دائم پڑا ہُوا ترے در پر نہیں ہوں میں؟
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل؟
انسان ہوں، پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

یا رب! زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں عقوبت کے واسطے
آخر گناہ گار ہوں، کافر نہیں ہوں میں

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے؟
لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ؟
رتبے میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

کرتے ہو مجھ کو منعِ قدمبوس کس لیے؟
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا
وہ دن گئے کہ کہتے تھے "نوکر نہیں ہوں میں"

سب کہاں، کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں؟
شب کو ان کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوبؑ نے لی گو نہ یوسفؑ کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش، پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش، کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا، گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیِ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیۂ چاکِ گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو اُن کی گالیوں کا کیا جواب؟
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں، ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

دل کو نیازِ حسرتِ دیدار کر چکے
دیکھا تو ہم میں طاقتِ دیدار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

بے عشق عمر کٹ نہیں سکتی ہے اور یاں
طاقت بقدرِ لذتِ آزار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے سر ہے وبالِ دوش
صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

گنجائشِ عداوتِ اغیار اک طرف
یاں دل میں ضعف سے ہوسِ یار بھی نہیں

ڈر نالہ ہائے زار سے میرے، خدا کو مان
آخر نوائے مُرغِ گرفتار بھی نہیں؟

دل میں ہے یار کی صفِ مژگاں سے رُوکشی
حالانکہ طاقتِ خلشِ خار بھی نہیں

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

دیکھا اسدؔ کو خلوت و جلوت میں بارہا
دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں
سوائے خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں

مگر غبار ہوئے پر، ہوا اُڑا لے جائے
وگرنہ تابِ و تواں بال و پر میں خاک نہیں

یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے
کہ غیر جلوۂ گُل رہگذر میں خاک نہیں

بھلا اسے نہ سہی، کچھ مجھی کو رحم آتا
اثر مرے نفسِ بے اثر میں خاک نہیں

خیالِ جلوۂ گُل سے خراب ہیں میکش
شراب خانہ کے دیوار و در میں خاک نہیں

ہوا ہوں عشق کی غارت گری سے شرمندہ
سوائے حسرتِ تعمیر گھر میں خاک نہیں

ہمارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسدؔ
کھُلا کہ فائدہ عرضِ ہُنر میں خاک نہیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار، کوئی ہمیں ستائے کیوں؟

دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم، غیر ہمیں اُٹھائے کیوں؟

جب وہ جمالِ دل فروز، صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز، پردے میں مُنہ چھپائے کیوں؟

دشنۂ غمزہ جاں ستاں، ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رُخ سہی، سامنے تیرے آئے کیوں؟

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

حُسن اور اس پہ حُسنِ ظن، رہ گئی بوالہوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ہے، غیر کو آزمائے کیوں؟

واں وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع؛ — راہ میں ہم ملیں کہاں؟ بزم میں وہ بُلائے کیوں؟
ہاں وہ نہیں خدا پرست، جاؤ وہ بے وفا سہی — جس کو ہو جان و دل عزیز اُس کی گلی میں جائے کیوں؟

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا؟ کیجئے ہائے ہائے کیوں

ردیف "و"

(۱)

حسد[1] پیمانہ سے دل عالمِ آبِ تماشا ہو } قلمی
حسد سے دل اگر افسردہ ہے، گرمِ تماشا ہو } م — کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو
بہ بالیدنِ سنگ و گلِ صحرا یہ چاہے ہے — کہ تارِ جادہ بھی کہسار کو زنّارِ مینا ہو
حریفِ وحشتِ نازِ نسیمِ عشق جب آؤں — کہ مثلِ غنچہ، سازِ یک گلستاں دل مہیا ہو
بجائے دانہ خرمن یک بیاباں بیضۂ قمری — مرا حاصل وہ نسخہ ہے کہ جس سے خاک پیدا ہو
کرے کیا سازِ بینش وہ شہیدِ[2] دردِ آگاہی — جسے موئے دماغِ بے خودی خوابِ زلیخا ہو
بقدرِ حسرتِ دل چاہیے ذوقِ[3] معاصی بھی — م بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو
دلِ چوں شمع، بہرِ دعوتِ نظارہ، لا یعنی — نگہ لبریزِ اشک و سینہ معمورِ تمنّا ہو

---

[1] اس ردیف میں صرف یہی ایک غزل ہے جس کے تین شعر بہ اختلافِ خفیف قلمی اور مطبوعہ دیوان میں مشترک ہیں۔ باقی کی غزلیں دونوں میں بالکل الگ الگ ہیں۔

[2] متن میں پہلے "شہیدِ درد" کی جگہ "تماشا رنج" تھا۔

[3] پہلے "ذوق" کی جگہ "عیش" تھا۔

اگر وہ سرو جاں بخشِ خرامِ اہتزاز آوے
اگر وہ سرو قدر گرمِ خرامِ ناز آجاوے } ۲ کفِ ہر خاکِ گلشن شکلِ قمری نالہ فرسا ہو

نہ دیکھیں روئے یک دل سرد غیر از شمعِ کافوری
خدایا اس قدر بزمِ اسدؔ گرمِ تماشا ہو

(۲)

اگر وہ آفتِ نظارہ جلوہ گستر ہو ہلال ناخنکِ دیدہ ہائے اختر ہو
بپیادِ قامت اگر ہو بلند آتشِ غم ہر ایک داغِ جگر، آفتابِ محشر ہو
ستم کشی کا کیا دل نے حوصلہ پیدا اب اس سے ربط کروں جو بہت ستمگر ہو
عجب نہیں ہے تحریرِ حالِ گریۂ چشم برُوئے آب جو ہر موج نقش مسطر ہو
امیدوار ہوں تاثیرِ تلخ کامی سے کہ قندِ بوسۂ شیریں لباں مکرر ہو

صدف کی ہے ترے نقشِ قدم میں کیفیت
سرشکِ چشمِ اسدؔ کیوں نہ اس میں گوہر ہو

بے دردِ سرِ بسجدۂ الفت فرو نہ ہو جوں شمع، غوطہ داغ میں کھا، گر وضو نہ ہو
دل دے کفِ تغافلِ ابروئے یار میں آئینہ ایسے طاق پہ گم کر، کہ تو نہ ہو
زلفِ خیالِ نازک و اظہار بے قرار یارب! بیان شانہ کشِ گفتگو نہ ہو
تمثالِ ناز جلوۂ نیرنگِ اعتبار ہستی عدم ہے آئینہ گر روبرو نہ ہو
مژگاں بخلیدۂ رگِ ابرِ بہار ہے نشتر بہ مغزِ پنبۂ مینا فرو نہ ہو

ٍ یہاں سے ردیف 'و' کی وہ غزلیں شروع ہوئی ہیں جن کا ہم طرح کوئی شعر مطبوعہ دیوانوں میں موجود نہیں۔

عرضِ نشاطِ دیدہ ہے مژگانِ انتظار
یارب! کہ خارِ پیرہنِ آرزو نہ ہو

واں پر فشانِ دامِ نظر ہوں جہاں اسدؔ
صبحِ بہار بھی قفسِ رنگ و بُو نہ ہو

مبادا بے تکلّف فصل کا برگِ نوا گم ہو
مگر طوفانِ مے میں جنبشِ موجِ صبا گم ہو

سبب وارستگاں کو تنگ ہمتی ہے، خداوندا!
اثر سرمے سے اور لب تارِ عاشق سے صدا گم ہو

نہیں جز وردِ تسکینِ نگاہش ہائے بیدرداں
کہ موجِ گریہ میں صد خندۂ دنداں نما گم ہو

ہوئی ہے ناتوانی بے دماغِ شوخیِ مطلب
جبیں میں، در لباسِ سجدہ، اے درت دُعا گم ہو

تجھے ہم منت دیویں یک جہاں چینِ جبیں لیکن
مبادا اے پیچ تابِ طبع بہ نقشِ مدعا گم ہو

بلا گردانِ تمکینِ بتاں، صد موجۂ گوہر
عرق بھی جن کے عارض پر بہ تکلیفِ حیا گم ہو

اُٹھائے کب وہ جانِ شرم تہمت قتلِ عاشق کی
کہ جن کے ہاتھ میں، مانندِ خوں رنگِ حنا گم ہو

کریں خوباں جو سیرِ حُسن اسدؔ یک پردہ نازک تر
دمِ صبحِ قیامت در گریبانِ قبا گم ہو

نشہ ہائے مے نے تلف کی میکدے کی آبرو
کاسۂ دریوزہ ہے پیمانۂ دستِ سبو

بہرِ جاں پروردنِ یعقوب، بالِ خاک ہے
دام لیتے ہیں پرِ پروانۂ پیراہن کی بُو

گہ ساحل ہے یمِ شرمِ جبینِ آشنا
گر نہ باندھے قلزمِ اُلفت میں ہر جائے کدو

گرمیِ شوقِ طلب ہے عینِ نایابیِ وصال
غافلاں! آئینہ داں ہے نقش پائے جستجو

رہنِ خاموشی ہیں سب آرائشِ بزمِ وصال
ہے پرِ پروانہ رنگِ رفتۂ خوں گفتگو

ہے تماشا حیرت آبادِ تغافل ہائے شوق
یک رگِ خوابِ سراسر جوشِ خوبیِ آرزو

غنچۂ شرمِ سرو بازاری ہے سیلِ خانماں
ہے اسدؔ نقصاں میں منفعت اور صفا حسبِ مدعا تو

رنگِ طرب ہے صورتِ عہدِ وفا گرو — تھا کس قدر شکستہ کہ ہے جا بجا گرو
پرواز نقدِ دامِ تمنّائے جلوہ تھا — طاؤس نے اک آئینہ خانہ رکھا گرو
عرضِ بساطِ انجمنِ رنگ مفت ہے — موجِ بہار رکھتی ہے اک بوریا گرو
ہر ذرّہ خاکِ عرضِ تمنائے رفتگاں — آئینہ ہا شکستہ و تمثالہا گرو
ہے تاک میں سلّمِ ہوسِ صد قدح شراب — تسبیحِ زاہداں بہ کفِ مدّعا گرو
برقِ آبیارِ فرصتِ رنگِ دمیدہ ہوں — جوں نخلِ شمع ریشہ میں نشو و نما گرو
طاقت بساطِ دست گہِ یک قدم نہیں — جوں اشک جیبِ ملک رکھوں سعیِ دو پا گرو
ہے وحشتِ جنونِ بہار اس قدر کہ ہے — بالِ پری بہ شوخیِ موجِ صبا گرو
بیتابِ سیرِ دل ہے ہمہ ناخنِ نگار — یاں نعل ہے بہ آتشِ رنگِ حنا گرو

ہوں سختِ جانِ کاوشِ فکرِ سخن اسد
تیشہ کے کوہسار میں ہے یک صدا گرو

---

(۴۳)

کعبے[۱] میں جا رہا تو نہ دو طعنہ، کیا کہیں — بھولا ہوں حقِ صحبتِ اہلِ کنشت کو
طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو
ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے؟ — ٹیڑھا لگا ہے قطِ قلم سرنوشت کو

غالب کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو

وارستہ[۲] اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو — کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہ ہو

۱؎ یہ دو غزلیں ہیں کہ جن کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ہے۔ ۲؎ یہ غزل بجنسہٖ قلمی نسخے کے حاشیے پر تحریر ہے۔

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہ ہو

ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

پیدا ہوئی ہے کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
یُوں ہو تو چارۂ غمِ اُلفت ہی کیوں نہ ہو

ڈالا نہ بیکسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

ہنگامۂ زبونیِ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

وارستگی، بہانۂ بیگانگی نہیں
اپنے سے کر، نہ غیر سے وحشت ہی کیوں نہ ہو

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی؟
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

اُس فتنہ خُو کے در سے اب اُٹھتے نہیں اسدؔ
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

قفس میں ہوں، اگر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا بُرا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن کو

نہیں گر ہمدمی آساں، نہ ہو، یہ رشک کیا کم ہے
نہ دی ہوتی خدایا! آرزوئے دوست دشمن کو

نہ نکلا آنکھ سے تیری اک آنسو اُس جراحت پہ
کیا سینے میں جس نے خونچکاں مژگانِ سوزن کو

خُدا شرمائے ہاتھوں کو، کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو

ابھی ہم قتل گہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں
نہیں دیکھا شناور جوئے خوں میں تیرے توسن کو

ہوا چرچا جو میرے پاؤں کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب کاں میں جُنبشِ جوہر نے آہن کو

خُوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈے ہے ابھی سے برق خرمن کو

وفاداری بہ شرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بُت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

شہادت تھی مری قسمت میں جو دی تھی یہ خُو مجھ کو
جہاں تلوار کو دیکھا جُھکا دیتا تھا گردن کو

نہ لُٹتا دن کو تو کب رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا، دُعا دیتا ہوں رہزن کو

سخن کیا کہہ نہیں سکتے، کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو
مرے شاہِ سلیماں جاہ سے نسبت نہیں غالبؔ
فریدون و جم و کیخسرو و داراب و بہمن کو

دھوتا ہوں جب میں پینے کو اس سیم تن کے پاؤں*
رکھتا ہے ضد سے کھینچ کے باہر لگن کے پاؤں
دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پاؤں
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پاؤں
بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہزن کے پاؤں
مرہم کی جستجو میں پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پاؤں
اللہ رے ذوقِ دشت نوردی کہ بعدِ مرگ
ہلتے ہیں خود بخود مرے اندر کفن کے پاؤں
ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اڑتے ہوئے الجھتے ہیں مرغِ چمن کے پاؤں
شب کو کسی کے خواب میں آیا نہ ہو کہیں
دکھتے ہیں آج اس بتِ نازک بدن کے پاؤں
غالبؔ مرے کلام میں کیونکر مزا نہ ہو
پیتا ہوں دھو کے خسروِ شیریں سخن کے پاؤں

واں اس کو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہ ہو
اپنے کو دیکھتا نہیں ذوقِ ستم کو دیکھ
آئینہ تاکہ دیدۂ نخچیر سے نہ ہو

واں پہنچ کر جو غش آتا پئے ہم ہے ہم کو
صد رہ آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے ہم کو
دل کو میں اور مجھے دل محوِ وفا رکھتا ہے
کس قدر ذوقِ گرفتاریِ ہم ہے ہم کو
ضعف سے نقشِ پئے مور ہے طوقِ گردن
تیرے کوچے سے کہاں طاقتِ رم ہے ہم کو

* اس دور میں 'پاؤں' کو 'پانو' لکھتے تھے۔ اس لئے یہ غزل ردیف 'و' میں شامل ہے۔

جان کر کیجے تغافل کہ کچھ اُمید بھی ہو — یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

رشکِ ہم طرحی و دردِ اثرِ بانگِ حزیں — نالۂ مرغِ سحر، تیغِ دو دم ہے ہم کو

سر اُڑانے کے جو وعدے کو مکرّر چاہا — ہنس کے بولے کہ "ترے سر کی قسم ہے ہم کو"

دل کے خوں کرنے کی کیا وجہ؟ ولیکن ناچار — پاسِ بے رونقیِ دیدہ اہم ہے ہم کو

تُم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو — ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا، یعنی — ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر — عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لیے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

تم جانو تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو — مجھ کو بھی پوچھتے رہو تو کیا گناہ ہو

بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے — قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بے گنہ کُش و حق ناشناس ہیں؟ — مانا کہ تم بشر نہیں خورشید و ماہ ہو

اُبھرا ہوا نقاب میں ہے اُن کے ایک تار — مرتا ہوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ہو

جب میکدہ چھُٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید — مسجد ہو، مدرسہ ہو، کوئی خانقاہ ہو

سُنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست — لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

غالبؔ بھی گر نہ ہو تو کچھ ایسا ضرر نہیں
دُنیا ہو یا رب۔ اور مرا بادشاہ ہو

۱؎ مولانا حسرت موہانی اور مولوی نظامی بدایونی کے مطبوعہ دیوانوں کے آخر میں غیر مروجہ اشعار کی ضمن میں اس غزل کا ایک شعر یہ بھی درج ہے۔

ابر روتا ہے کہ بزمِ طرب آمادہ کرو — برق ہنستی ہے کہ فرصت کوئی دم ہے ہم کو

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو ۔ کہے سے کچھ نہ ہوا پھر کہو تو کیونکر ہو
ہمارے ذہن میں اس فکر کا ہے نام وصال ۔ کہ گر نہ ہو تو کہاں جائیں، ہو تو کیونکر ہو
ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے ۔ حیا ہے اور یہی گومگو، تو کیونکر ہو
تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا ۔ بتوں کی ہو اگر ایسی ہی خو تو کیونکر ہو
الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ ۔ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو
جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا ۔ وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو
ہمیں پھر ان سے امید، اور انھیں ہماری قدر ۔ ہماری بات ہی پوچھیں نہ وہ تو کیونکر ہو
غلط نہ تھا ہمیں خط پر گماں تسلی کا ۔ نہ مانے دیدۂ دیدار جو - تو کیونکر ہو
بتاؤ اس مژہ کو دیکھ کر ہو مجھ کو قرار ۔ یہ نیش ہو رگِ جاں میں فرو تو کیونکر ہو

مجھے جنوں نہیں غالب ولے بقولِ حضور
"فراقِ یار میں تسکین ہو تو کیونکر ہو"

کسی کو دے کے دل کوئی نواسنجِ فغاں کیوں ہو ۔ نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو
وہ اپنی خو نہ چھوڑیں گے، ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں ۔ سبک سر بن کے کیا پوچھیں کہ ہم سے سرگراں کیوں ہو
کیا غمخوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو ۔ نہ لاوے تاب جو غم کی وہ میرا رازداں کیوں ہو
وفا کیسی؟ کہاں کا عشق؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا ۔ تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو
قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم ۔ گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو
یہ کہہ سکتے ہو "ہم دل میں نہیں ہیں" پر یہ بتلاؤ ۔ کہ جب دل میں تمھیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو
غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ، دیکھو جرم کس کا ہے ۔ نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو
یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟ ۔ ہوئے تم دوست جس کے، دشمن اس کا آسماں کیوں ہو
یہی ہے آزمانا تو ستانا کس کو کہتے ہیں؟ ۔ عدو کے ہو لیے جب تم، تو میرا امتحاں کیوں ہو

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی" بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالب
ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ہم سخن کوئی نہ ہو اور ہم زباں کوئی نہ ہو
بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیئے کوئی ہمسایہ نہ ہو اور پاسباں کوئی نہ ہو

پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جائیے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو

ردیف "ہ"

(۱)

از مہر تا بہ ذرہ دل و دل ہے آئینہ طوطی کو شش جہت سے مقابل ہے آئینہ
حیرت ہجومِ لذتِ غلطانیِ تپش سیماب بالش و کمرِ دل ہے آئینہ
غفلت، بہ بالِ جوہرِ شمشیر پرفشاں یاں پشتِ چشمِ شوخیِ قاتل ہے آئینہ
حیرت نگاہِ برقِ تماشا بہار شوخ در پردۂ ہوا پرِ بسمل ہے آئینہ
یاں رہ گئے ہیں ناخنِ تدبیر ٹوٹ کر جوہر طلسمِ عقدۂ مشکل ہے آئینہ
ہم زانوئے تاملِ و ہم جلوہ گاہِ گل آئینہ بندِ خلوت و محفل ہے آئینہ

دل کارگاہِ فکر و اسد بے نوائے دل
یاں سنگِ آستانۂ بیدل ہے آئینہ

جز دل سراغِ دردِ بدل خفتگاں نہ پوچھ — آئینہ عرض کر خط و خالِ بیاں نہ پوچھ

ہندوستان[۱] سایۂ گل پائے تخت تھا — سامانِ بادشاہیِ وصلِ بتاں نہ پوچھ

پرواز یک تپِ غمِ تسخیرِ نالہ ہے — گرمیِ نبضِ خار و خسِ آشیاں نہ پوچھ

تو مشقِ ناز کر دلِ پروانہ ہے بہار — بیتابیِ تجلیِ آتش بجاں نہ پوچھ

غفلت متاعِ کفۂ میزانِ عدل ہوں — یارب حسابِ سختیِ خوابِ گراں نہ پوچھ

ہر[۲] داغِ تازہ یک دلِ داغ انتظار ہے — عرضِ فضائے سینۂ درد امتحاں نہ پوچھ

کہتا[۳] تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل
دردِ جدائیِ اسد اللہ خاں نہ پوچھ

ہے[۴] سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ — جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

ناچار بے کسی کی بھی حسرت اٹھائیے
دشواریِ رہ و ستمِ ہمزباں نہ پوچھ

---

(۲)

رفتار سے شیرازۂ اجزائے قدم باندھ — اے آبلہ محمل پئے صحرائے عدم باندھ

۱؎ یہ دیوانِ غالب مطبوعہ مولانا نظامی بدایونی و مولانا حسرت موہانی کے آخر میں اشعارِ غیر مروجہ کی ضمن میں موجود ہے مگر اس میں مصرعِ ثانی یوں ہے

جاہ و جلالِ عہدِ وصالِ بتاں نہ پوچھ

۲؎۳؎ یہ دونوں شعر بھی مذکورہ بالا دیوانوں کے آخر میں موجود ہیں لیکن ۳؎ کا مصرعِ اول یوں ہے

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ ہاں الخ

۴؎ اس غزل کے ہم طرح فقط یہ دو شعر مروجہ دیوانوں میں ملتے ہیں۔ ان میں سے پہلا شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر بھی غالباً درج ہے۔ غالباً دوسرا شعر اور بھی بعد کا کہا ہوا ہے۔ سوائے ان دو شعروں کے اس غزل کا ہم طرح کوئی شعر مطبوعہ دیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔

بیکاریِ تسلیم بہر رنگ چمن ہے
گر خاک ہو گلدستۂ صد نقشِ قدم باندھ

اے جادہ بہ سر رشتۂ یک ریشہ دویدن
شیرازۂ صد آبلہ جوں سبحہ بہم باندھ

حیرت حدِ اقلیمِ تمنائے پری ہے
آئینہ بہ آئینِ گلستانِ ارم باندھ

پا مردِ یک انداز نہیں قامتِ ہستی
طاقت اگر اعجاز کرے تہمتِ خم باندھ

دیباچۂ وحشت ہے اسد شکوۂ خوباں
خوں کردِ دلِ اندیشہ و مضمونِ ستم باندھ

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ
ورنہ ہے چرخ و زمیں یک ورقِ گردانده

میکدے میں ز دلِ افسردگیِ بادہ کشاں
موجِ مے شکلِ خطِ جام ہے ہر جا ماندہ

خواہشِ دل ہے زباں کو سببِ گفتِ بیاں
ہے سخن گرد ز دامانِ ضمیر افشاندہ

کوئی آگاہ نہیں باطنِ ہم دیگر سے
ہے ہر اک فرد جہاں میں ورقِ ناخواندہ

حیف بے حاصلیِ اہلِ ریا پر غالب
یعنی ہیں ماندہ ز آسودہ و ازیں سو راندہ

بسکہ مے پیتے ہیں اربابِ فنا پوشیدہ
خطِ پیمانۂ مے ہے نفسِ دزدیدہ

بہ غرورِ طرحِ قامتِ رعنائیِ سرو
طوق ہے گردنِ قمری میں رگِ بالیدہ

کی ہے وا اہلِ جہاں نے بہ گلستانِ جہاں
چشمِ غفلت نظرِ شبنمِ خور نادیدہ

یاس آئینۂ پیدائیِ استغنا ہے
ناامیدی ہے پرستارۂ دلِ رنجیدہ

واسطے فکرِ مضامینِ متیں کے غالب
چاہیے خاطرِ جمع و دلِ آرامیدہ

جوشِ دل ہے نشہ ہائے فطرتِ بیدل نہ پوچھ
قطرہ ہی میخانہ ہے دریائے بے ساحل نہ پوچھ

ہیں گشتنہائے دل بزمِ نشاطِ گرد باد
لذتِ عرضِ کشادِ عقدۂ مشکل نہ پوچھ

آبلہ پیمائیِ اندازۂ تشویش لکھتا
اے دماغِ نارسا خمخانۂ منزل نہ پوچھ

نے صبا بال پری ہے نے شعلہ سودائے جنوں
شمع سے جز عرضِ افسونِ گدازِ دل نہ پوچھ

یک مژہ برہم زدن حشرِ دو عالم فتنہ ہے
یاں سراغِ عافیت جز دیدۂ بسمل نہ پوچھ

بزم ہے یک پنبۂ مینا گدازِ ربط سے
عیش کر غافل حجابِ نشۂ محفل نہ پوچھ

تا تخلص جامۂ شستگری ارزانی اسد
شاعری جز سازِ درویشی نہیں حاصل نہ پوچھ

شکوہ و شکر کو ثمر بیم و امید کا سمجھ
خانۂ آگہی خراب، دل نہ سمجھ بلا سمجھ

رنگِ رواں و سرخوشِ درسِ تسلیِ شعاع
آئینہ طرد اے خیال جلوہ کو خوں بہا سمجھ

وحشتِ دردِ بیکسی بے اثر اس قدر نہیں
رشتۂ عمرِ خضر کو نالۂ نارسا سمجھ

شوقِ عنان گسل اگر درسِ جنوں ہوس کرے
جلوۂ سیرِ دو جہاں یک مژہ خواب پا سمجھ

گاہ بہ خلد امیدوار گہ بہ جحیم بیمناک
گرچہ خدا کی یاد ہے کلفتِ ماسوا سمجھ

اے بہ سرابِ حسنِ خلق تشنۂ سعیِ امتحاں
شوق کو منفعل نہ کر ناز کو التجا سمجھ

شوخیِ حسن و عشق ہے آئینہ دار ہمدگر
خار کو بے نیام جان ہم کو برہنہ پا سمجھ

نغمۂ بے دلی اسد سازِ فسانگی نہیں
بسملِ دردِ خفتہ ہوں، گریۂ ماجرا سمجھ

کلفتِ ربطِ این و آں غفلتِ مدعا سمجھ
شوق کرے جو سرگراں محملِ خواب پا سمجھ

جلوہ نہیں ہے دردِ سر آئینہ صندلی نہ کر
عکس کجاؤ کو نظر نقش کو مدعا سمجھ

حیرت اگر خرام ہے، کارِ نگہ تمام ہے
گر کفِ دست بام ہے آئینہ کو ہوا سمجھ

ہے خطِ عجز ما و تو، اوّلِ درسِ آرزو
ہے یہ سیاقِ گفت گو کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ

شیشۂ شکستِ اعتبار، رنگ بہ گردشِ استوا
گر نہ مٹیں یہ کوہسار آپ کو توصدا سمجھ

نغمہ ہے محوِ سازِ رہ، نشّہ ہے بے نیازِ رہ
رندِ تمام نازِ رہ، خلق کو پارسا سمجھ

چربیِ پہلوئے خیالِ رزقِ دو عالم احتمال
کل ہے جو وعدۂ وصال آج بھی ہے اُٹھا سمجھ

نے سرو برگِ آرزو نے رہ و رسمِ گفتگو
اے دل و جانِ خلق تو ہم کو بھی آشنا سمجھ

لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمۂ یا علی مدد
ٹوٹے گر آئینہ اسدؔ سبحہ کو خوں بہا سمجھ

ردیف "ی"

(۱)

دل ہی نہیں، کہ منّتِ درباں اُٹھائیے
کس کو وفا کا سلسلہ جنباں اُٹھائیے [۱]

تا چند داغ بیٹھیے، نقصاں اُٹھائیے
اب چار سوئے عشق سے دکاں اُٹھائیے

صد جلوہ روبرو ہے جو مژگاں اُٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھائیے م

ہستی فریب نامۂ موجِ سراب ہے
یک عمر نازِ شوخیِ عنواں اُٹھائیے

ہے سنگ پر براتِ معاشِ جنونِ عشق
یعنی ہنوز منّتِ طفلاں اُٹھائیے م

ضبطِ جنوں سے ہر سرِ مو ہے ترانہ خیز
یک نالہ بیٹھیے تو نیستاں اُٹھائیے

---

[۱] پہلے متن میں یہ مصرع یوں تھا:
"کہتے ہیں اہلِ گفت گو کچھ نہ سمجھ فنا سمجھ"

طرزِ خراشِ نالہ سرشکِ نمک اثر   لطفِ کرم بدولتِ مہماں اٹھائیے
دیوار بارِ منتِ مزدور سے ہے خم   م   اے خانماں خرابِ احساں اٹھائیے
یا میرے زخمِ رشک کو رسوا نہ کیجیے   م   یا پردۂ تبسمِ پنہاں اٹھائیے
انگورِ سعی بے سروپائی سے سبز ہے
غالب بدوشِ دل خمِ مستاں اٹھائیے

ہے بزمِ بتاں میں سخن آزردہ لبوں سے   تمہ   تنگ آئے ہیں ہم ایسے خوشامد طلبوں سے
ہے دورِ قدح وجہِ پریشانیِ صہبا   م   یک بار لگا دو خمِ مے میرے لبوں سے
کیا پوچھے ہے برخود غلطی ہائے عزیزاں   خواری کو بھی اک عار ہے عالی نسبوں سے
رندانِ درِ میکدہ گستاخ ہیں زاہد   م   زنہار نہ ہونا طرف ان بے ادبوں سے
گو تم کو رضا جوئیِ اغیار ہے، لیکن   جاتی ہے ملاقات کب ایسے سببوں سے
بیدادِ وفا دیکھ کہ جاتی رہی آخر   م   ہر چند مری جان کو تھا ربط لبوں سے
مت پوچھ اسد وعدۂ کم فرصتیِ زیست
دو دن بھی جو کاٹے تو قیامت تعبوں سے

غمِ دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی   تمہ   فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی
کھلے گا کس طرح مضموں مرے مکتوب کا یا رب   م   قسم کھائی ہے اس کافر نے کاغذ کے جلانے کی
لگدکوبِ حوادث سے نہ سر بر ہو سکی آخر
لگدکوبِ حوادث کا تحمل کر نہیں سکتی   م   مری طاقت کہ ضامن تھی بتوں کے ناز اٹھانے کی
لپٹنا پرنیاں میں شعلۂ آتش کا پنہاں ہے   م   ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی
انھیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا   م   اٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی

ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا ۔ ترا آنا نہ تھا ظالم، مگر تمہید جانے کی

کہوں کیا خوبیٔ اوضاعِ ابنائے زماں غالبؔ
بدی کی اُس نے جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی

بساطِ عجز میں تھا ایک دل یک قطرہ خوں وہ بھی ۔ سو رہتا ہے بہ اندازِ چکیدن سرنگوں وہ بھی
رہے اُس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے ۔ تکلف برطرف، تھا ایک اندازِ جنوں وہ بھی
مئے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے ۔ لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی
مجھے معلوم ہے جو تو نے میرے حق میں سوچا ہے ۔ کہیں ہو جائے جلد اے گردشِ گردونِ دوں وہ بھی
نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ ۔ مرے دریائے بیتابی میں ہے اک موجِ خوں وہ بھی
خیالِ مرگ کب تسکیں دلِ آزردہ کو بخشے ۔ مرے دامِ تمنا میں ہے اک صیدِ زبوں وہ بھی
نہ کرتا کاش نالہ مجھ کو کیا معلوم تھا ہمدم ۔ کہ ہوگا باعثِ افزائشِ دردِ دروں وہ بھی
نظر راحت پہ میری کر نہ وعدہ شب کے آنے کا ۔ کہ میری خواب بندی کے لیے ہوگا فسوں وہ بھی

اسدؔ ہے دل میں دردِ اشتیاق و شکوۂ ہجراں
مرے دل میں ہے غالبؔ شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اُس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

حاصل سے ہاتھ دھو بیٹھ، اے آرزو خرامی ۔ دل جوشِ گریہ میں ہے ڈوبی ہوئی اسامی
کرتے ہو شکوہ کس کا، تم اور بے وفائی ۔ سر پیٹتے ہیں اپنا، ہم اور نیک نامی
صد رنگ گل کترنا، در پردہ قتل کرنا ۔ تیغِ ادا نہیں ہے پابندِ بے نیامی
طرفِ سخن نہیں ہے مجھ سے خدا نکردہ ۔ ہے نامہ بر کو اُس سے دعوائے ہم کلامی
طاقت فسانۂ باد، اندیشہ شعلہ ایجاد ۔ اے غم ہنوز آتش، اے دل ہنوز خامی
ہر چند عمر گزری آزردگی میں لیکن ۔ ہے شرحِ شوق کو بھی جوں شکوہ ناتمامی

ہے پاس میں اسدؔ کو ساقی سے بھی فراغت — دریا سے خشک گزری مستوں کی تشنہ کامی

اُس شمع کی طرح سے جس کو کوئی بجھا دے
مطلع
میں بھی جلے ہوؤں میں ہوں داغِ ناتمامی

کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے — مطلع جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے
ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے — م پرتو سے آفتاب کے ذرّے میں جان ہے
کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا — آوے نہ کیوں پسند؟ کہ ٹھنڈا مکان ہے
ہے بارے اعتمادِ وفاداری اس قدر[1] — م { ہم بھی اسی میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے / غالبؔ ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہرباں ہے }
بیٹھا ہے جو کہ سایۂ دیوارِ یار میں — م فرمانروائے کشورِ ہندوستان ہے
کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟ — م بس چپ رہو ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

دہلی کے رہنے والو! اسدؔ کو ستاؤ مت
بیچارہ چند روز کا یاں مہرباں ہے

حالانکہ ہے یہ سیلیِ خارا سے لالہ رنگ — غافل کو میرے شیشے پہ مے کا گمان ہے

ہستی کا اعتبار بھی غم نے مٹا دیا
کس سے کہوں کہ داغ جگر کا نشان ہے

درد سے میرے ہے تجھ کو بے قراری ہائے ہائے — مطلع کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ — م تو نے پھر کیوں کی تھی میری غم گساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — م دشمنی اپنی تھی میری دوست داری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا — م عمر کو بھی تو نہیں ہے پائداری ہائے ہائے

[1] مروجہ دیوانوں میں اس شعر کے مصرعِ ثانی میں تخلص ڈال کر مقطع بنا دیا ہے۔ اور بلاشبہ نہایت پاکیزہ ترمیم ہے۔

شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں   ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
گلفشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا   خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی   یعنی تجھ سے تھی اسے ناسازگاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا   دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئی   اُٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشگال   ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال   ایک دل تس پر یہ نا امیدواری ہائے ہائے
گر مصیبت تھی تو غربت میں اُٹھا لیتے اسدؔ   میری دلی ہی میں ہونی تھی یہ خواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالبؔ ابھی الفت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے   تسکیں کو دے نوید، کہ مرنے کی آس ہے
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر   اب تک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے
کیجے بیاں سرورِ تپِ غم کہاں تلک   ہر مو مرے بدن پہ زبانِ سپاس ہے
پی جس قدر ملے شبِ مہتاب میں شراب   اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
ہے وہ غرورِ حسن سے بیگانۂ وفا   ہر چند اُس کے پاس دلِ حق شناس ہے
کیا غم ہے اُس کو جس کا علی سا امام ہو   اتنا بھی اے فلک زدہ کیوں بے حواس ہے

ہر اک مکان کو ہے مکیں سے شرف اسدؔ
مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اُداس ہے

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے   خوش ہوں کہ میری بات سمجھنا محال ہے

کس کو سناؤں حسرتِ اظہار کا گلہ ؎ دل، فردِ جمع و خرچِ زباں ہائے لال ہے
کس پردہ میں ہے آئینہ پرداز اے خدا ؎ رحمت، کہ عذر خواہِ لبِ بے سوال ہے
ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی! ؎ اے ذوقِ منفعل! یہ تجھے کیا خیال ہے
عالم بساطِ دعوتِ دیوانگی نہیں
وحشت پہ میری عرصۂ آفاق تنگ تھا ؎ دریا زمین کو عرقِ انفعال ہے
مشکیں لباسِ کعبہ علی کے قدم سے جان ؎ نافِ زمین ہے نہ کہ نافِ غزال ہے
پہلو تہی نہ کر غم و اندوہ سے اسدؔ ؎ دل وقفِ درد کر کہ فقیروں کا مال ہے
ہستی[1] کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

نظر بہ نقصِ گدایاں کمالِ بے ادبی ہے ؎ کہ خارِ خشک کو بھی دعوئے چمن نسبی ہے
ہوا وصال سے شوقِ دلِ حریص زیادہ لبِ قدح پہ کفِ بادہ جوشِ تشنہ لبی ہے
خوشا وہ دل کہ سراپا طلسمِ بے خبری ہو جنون و یاس و الم رزقِ مدعا طلبی ہے
تم اپنے شکوے کی باتیں نہ کھود کھود کے پوچھو حذر کرو مرے دل سے کہ اس میں آگ دبی ہے
چمن میں کس کے یہ برہم ہوئی ہے بزمِ تماشا کہ برگ برگِ سمن شیشہ ریزۂ حلبی ہے
امامِ ظاہر و باطن، امیرِ صورت و معنی علی ولی اسد اللہ جانشینِ نبی ہے
اسدؔ[2] یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہے کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہے نہ آہِ نیم شبی ہے ؎

---

[1] چونکہ اس غزل کا مقطع بوقتِ انتخاب حذف کر دیا گیا تھا۔ اس لئے غالباً بوقتِ نظرِ ثانی دوسرا مقطع کہہ کر بڑھایا گیا۔ یہ قلمی نسخہ کے حاشیہ پر بھی لکھا ہے اور مروجہ دیوانوں میں بھی موجود ہے۔ باقی تمام غزل بہ استثنائے مصرع (شعرِ پنجم) بالکل مشترک ہے۔

[2] مروجہ دیوانوں میں اس مقطع میں "اسد" کی جگہ "دلا" لکھا ہوا ہے اور یہ پورا شعر دونوں دیوانوں میں مشترک ہے۔

رفتارِ عمر قطعِ رہِ اضطراب ہے — اس سال کے حساب کو برق آفتاب ہے
ظاہر ہے طرزِ قید سے صیاد کی غرض — جو دانہ دام میں ہے سو اشکِ کباب ہے
مینائے مے ہے سروِ نشاطِ بہار سے — بالِ تدرو جلوۂ موجِ شراب ہے
زخمی ہوا ہے پاشنہ پائے ثبات کا — نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ہے
جادادِ بادہ نوشیِ رنداں ہے شش جہت — غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے
بے چشمِ دل نہ کر ہوسِ سیرِ لالہ زار — یعنی یہ ہر ورق ورقِ انتخاب ہے
نظارہ کیا حریف ہو اس برقِ حسن کا — جوشِ بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

گزرا اسد مسرتِ پیغامِ یار سے
قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے — ٹہ قلمی — صبحِ وطن ہے خندۂ دنداں نما مجھے
ہے پیچ تابِ رشتۂ شمعِ سحر گہی — خجلت گدازیِ نفسِ نارسا مجھے
واں رنگ ہا بہ پردۂ تدبیر ہیں ہنوز — یاں شعلۂ چراغ ہے برگِ حنا مجھے
کرتا ہے بسکہ باغ میں تو بے حجابیاں — آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے
پرواز ہا نیازِ تماشائے حسنِ دوست — بالِ کشادہ ہے نگہِ آشنا مجھے
از خود گزشتگی میں خموشی پہ حرف ہے — موجِ غبارِ سرمہ ہوئی ہے صدا مجھے
کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ؟ — شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے
تا چند پستیِ فطرتِ طبعِ آرزو — یارب ملے بلندیِ دستِ دعا مجھے

ٹہ یہ اور اس کے بعد کا شعر قلمی دیوان کے حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔

یاں آب و دانہ موسمِ گُل میں حرام ہے — زنّارِ واگسستہ ہے موجِ صبا مجھے
یکبار امتحانِ ہوس بھی ضرور ہے — اے جوششِ عشق بادۂ مرد آزما مجھے

میں نے جنوں سے کی جو اسدؔ التماسِ رنگ
خونِ جگر میں ایک ہی غوطہ دیا مجھے

ڈھونڈے ہے اُس مغنّیِ آتش نفس کو جی — ہجو — جس کی صدا ہو جلوۂ برقِ فنا مجھے

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدّعا مجھے

کہوں کیا گرمجوشی مے کشی میں شعلہ رویاں کی — تم — کہ شمعِ خانۂ دل آتشِ مے سے فروزاں کی
ہمیشہ مجھ کو طفلی میں بھی مشقِ تیرہ روزی تھی — سیاہی ہے مرے ایام میں لوحِ دبستاں کی
دریغ! آہِ سحر گہ کارِ بادِ صبح کرتی ہے — کہ ہوتی ہے زیادہ سرد مہری شمع رویاں کی
مجھے اپنے جنوں کی بے تکلّف پردہ داری تھی — ولیکن کیا کروں آوے جو رسوائی گریباں کی
ہُنر پیدا کیا ہے میں نے حیرت آزمائی میں — کہ جوہر آئینہ کا ہر پلک ہے چشمِ حیراں کی
خُدایا کس قدر اہلِ نظر نے خاک چھانی ہے — کہ ہیں صد رخنہ جُوں غربال دیواریں گلستاں کی
ہوا شرمِ تہی دستی سے وہ بھی سرنگوں آخر — بس اے زخمِ جگر اب دیکھ لی شورش نمکداں کی
سیاہی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر — م — مری قسمت میں یوں تصویر ہے شب[۱] ہائے ہجراں کی

بیادِ گرمیِ صحبت برنگِ شعلہ دہکے ہے
چھپاؤں کیونکر غالبؔ سوزشیں داغِ نمایاں کی

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہ ہو گر شادمانی کی — تم — نمک پاشِ خراشِ دل ہے لذّت زندگانی کی
کشاکش ہائے ہستی سے کرے کیا سعیِ آزادی — م — ہوئی زنجیرِ موجِ آب کو فرصت روانی کی

---

۱ یہ معروف شعر پہلے متن میں نہ تھا۔ بعد میں حاشیے پر بڑھایا گیا ہے۔

نہ کھینچ اے سعیِ دستِ نارسا زلفِ تمنا کو | پریشاں تر ہے موئے خامہ سے تدبیر مانی کی
کہاں ہم بھی رگ و پے رکھتے ہیں انصاف بہتر ہے | نہ کھینچے طاقتِ خمیازہ تہمت ناتوانی کی
تکلف بر طرف! فرہاد اور اتنی سبک دستی | خیال آساں تھا لیکن خوابِ خسرو نے گرانی کی
م پس از مردن بھی دیوانہ زیارت گاہِ طفلاں ہے | شرارِ سنگ نے تربت پہ میری گل فشانی کی

اسدؔ کو بوریے میں دھر کے پھونکا موجِ ہستی نے
فقیری میں بھی باقی ہے شرارت نوجوانی کی

ق قلمی نکوہش ہے سزا، فریادیِ بیدادِ دلبر کی | مبادا خندۂ دنداں نما ہو صبحِ محشر کی
م رگِ لیلیٰ کو خاکِ دشتِ مجنوں ریشگی بخشے | اگر بووے بجائے دانہ، دہقاں نوک نشتر کی
م بجز دیوانگی ہوتا نہ انجامِ خود آرائی | اگر پیدا نہ کرتا آئینہ زنجیر جوہر کی
م پرِ پروانہ شاید بادبانِ کشتیِ مے تھا | ہوئی مجلس کی گرمی سے روانی دورِ ساغر کی
غرورِ لطفِ ساقی نشۂ بیباکیِ مستاں | نمِ دامانِ عصیاں ہے طراوت موجِ کوثر کی
مرا دل مانگتے ہیں عاریت اہلِ ہوس شاید | یہ جانا چاہتے ہیں آج دعوت میں سمندر کی
م کروں بیدادِ ذوقِ پر فشانی عرض کیا قدرت | کہ طاقت اڑ گئی اڑنے سے پہلے میرے شہپر کی
م کہاں تک روؤں اس کے خیمے کے پیچھے قیامت ہے | مری قسمت میں یارب کیا نہ تھی دیوار پتھر کی

اسدؔ جز آب بخشیدن ز دریا خضر کو کیا تھا
ڈبوتا چشمۂ حیواں میں گر کشتی سکندر کی

ق قلمی آ کہ مری جان کو قرار نہیں ہے | طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ہے

لہ مقطع سے پہلے کے یہ تینوں شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہیں۔ ان میں سے دو مشہور اور متداول ہیں پہلا شعر معلوم ہوتا ہے انتخاب میں نہیں لیا۔

دیتے ہیں جنت حیاتِ دہر کے بدلے م نشہ بہ اندازۂ خمار نہیں ہے
گریہ نکالے ہے تری بزم سے مجھ کو م ہائے کہ رونے پہ اختیار نہیں ہے
ہم سے عبث ہے گمانِ رنجشِ خاطر م خاک میں عشّاق کی غُبار نہیں ہے
دل سے اُٹھا لطفِ جلوہ ہائے معانی م غیرِ گل آئینۂ بہار نہیں ہے
قتل کا میرے عہد تو کیا ہے بارے م وائے اگر عہد اُستوار نہیں ہے
تُو نے قسم میکشی کی کھائی ہے غالبؔ
م
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ہے

ہجومِ غم سے یاں تک سرنگونی مجھ کو حاصل ہے کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ہے
ہوا ہے مانعِ عاشق نوازی نازِ خود بینی تکلّف بر طرف، آئینۂ تمیز حائل ہے
بہ سیلِ اشک لختِ دل ہے دامن گیر مژگاں کا غریقِ بحر جویائے خس و خاشاکِ ساحل ہے
بہا ہے یاں تک اشکوں میں غبارِ کلفتِ خاطر کہ چشمِ تر میں ہر اک پارۂ دل پائے در گل ہے
رفوئے زخم سے مطلب ہے لذّت زخمِ سوزن کی م سمجھیو مت کہ پاسِ درد سے دیوانہ غافل ہے
نکلتی ہے تپش میں بسملوں کی برق کی شوخی غرض اب تک خیالِ گرمیِ رفتارِ قاتل ہے
وہ گل جس گلستاں میں جلوہ فرمائی کرے غالبؔ
م
چٹکنا غنچۂ دل کا صدائے خندۂ دل ہے

تشنۂ خونِ تماشا جو وہ پانی مانگے قلمی آئینہ رخصتِ اندازِ روانی مانگے
رنگ نے گُل سے۔ دمِ عرضِ پریشانیِ بزم برگِ گل، ریزۂ مینا کی نشانی مانگے
زُلف۔ تحریرِ پریشانِ تقاضا ہے مگر شانہ ساں۔ مو بہ زباں خامۂ مانی مانگے
آمدِ خط سے نہ کر خندۂ شیریں کہ مباد چشمِ مور آئینۂ دل نگرانی مانگے

---

[1] یہ مشہور شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر درج ہے۔ متن میں نہیں ہے۔

ہوں گرفتارِ کمیں گاہِ تغافل کہ جہاں — خوابِ صیّاد سے پرواز گرانی مانگے
چشمِ پرواز و نفسِ خفتہ مگر ضعفِ اُمید — شہپرِ کاہ پئے مژدہ رسانی مانگے
تو وہ بدخو کہ تحیّر کو تماشا جانے — ۲ {دل وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے / غم وہ افسانہ کہ آشفتہ بیانی مانگے}
وحشتِ شورِ تماشا ہے کہ جوں نکہتِ گل — نمکِ زخمِ جگر بال فشانی مانگے
نقشِ نازِ بتِ طنّاز بہ آغوشِ رقیب — ۲ پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے
{وہ تبِ عشقِ تمنّا ہے کہ جوں رشتۂ شمع / وہ تبِ عشقِ تمنا ہے کہ پھر صورتِ شمع} — ۲ شعلہ تا نبضِ جگر ریشہ دوانی مانگے

گر ملے حضرتِ بیدل کا خطِ لوحِ مزار
اسدؔ آئینۂ پروازِ معانی مانگے

ہم زباں آیا نظر فکرِ سخن میں تو مجھے — ۱ مردمک ہے طوطیِ آئینۂ زانو مجھے
یادِ مژگاں میں بہ نشتر زارِ سودائے خیال — چاہیے وقتِ تپش یک دست صد پہلو مجھے

---

۱ قلمی دیوان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ غزل پہلے کہی گئی تھی۔ پھر اس کے کچھ عرصے بعد اسی طرح کی دوسری غزل کہی گئی جو آگے آتی ہے۔ چنانچہ اس نسخے پر نظرِ ثانی کرتے وقت اس غزل کے حاشیے پر اُسے غالباً غالب نے خود بڑھا دیا۔ مگر چند صفحے بعد دیکھا تو وہ غزل پہلے ہی لکھی ہوئی موجود تھی۔ اس لیے وہاں حاشیے پر یہ لکھ دیا کہ "غلط۔ مکرّر نوشتہ شد۔" شاید اسی وقت مقطع کے مصرعِ ثانی میں تخلص بھی بدلا گیا کیونکہ پہلے وہ مصرع یوں تھا: "خوبرویوں نے بنایا ہے اسد بدخو مجھے"۔ ایسی ہی اصلاحوں سے یہ قیاس ہوتا ہے کہ یہ ترمیمیں بخطِ غالب کی قلمی ہیں۔

۲ یہ شعر پہلے یوں تھا:

یادِ مژگاں میں بہ نشتر زارِ صحرائے خیال — چاہیے بہرِ تپش یک دست صد پہلو مجھے

خاکِ فرصت بر سرِ ذوقِ فنا، اے انتظار — ہے غبارِ شیشۂ ساعت رمِ آہو مجھے
اضطرابِ عمرِ بے مطلب نہیں آخر، کہ ہے — جستجوئے فرصتِ ربطِ سرِ زانو مجھے
چاہیے درمانِ ریشِ دل بھی تیغِ یار سے — مرہمِ زنگار ہے وہ وسمۂ ابرو مجھے

کثرتِ جور و ستم سے ہو گیا ہوں بے دماغ
خوبرویوں نے بنایا غالبؔ بدخو مجھے

باعثِ واماندگی ہے عمرِ فرصت جو مجھے — تتمہ — کر دیا ہے پا بہ زنجیرِ رمِ آہو مجھے
پا بہ دامن ہو رہا ہوں بسکہ میں صحرا نورد — م — خارِ پا ہیں جوہرِ آئینۂ زانو مجھے
فرصتِ آرامِ غش ہستی ہے بحرانِ عدم — ہے شکستِ رنگِ امکاں گردشِ پہلو مجھے
دیکھنا حالت مرے دل کی ہم آغوشی کے وقت — م — ہے نگاہِ آشنا تیرا سرِ ہر مو مجھے
ہوں سراپا سازِ آہنگِ شکایت کچھ نہ پوچھ — م — ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

سازِ ایمائے فنا ہے عالمِ پیری اسدؔ
قامتِ خم سے ہے حاصل شوخیِ ابرو مجھے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی — تتمہ — امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
خار خارِ المِ حسرتِ دیدار تو ہے — م — شوق گلچینِ گلستانِ تسلی نہ سہی
مے پرستاں خُمِ مے منہ سے لگائے ہی بنے — م — ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی
نفسِ قیس کہ ہے چشم و چراغِ صحرا — م — گر نہیں شمعِ سیہ خانۂ لیلی نہ سہی
ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — م — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی
نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا[1] — م — گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

---

[1] متن میں اس مشہور شعر کا مصرعِ ثانی پہلے یوں تھا: "نہ ہوئے گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی"۔ مگر حاشیے پر وہ اصلاح

(بقیہ اگلے صفحے پر)

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غنیمت سمجھو
نہ ہوئی غالبؔ اگر عمرِ طبیعی نہ سہی

دلِ بیمارِ از خود رفتہ تصویرِ نہالی ہے | قلمی | کہ مژگاں ریشہ دارِ نیستانِ شیر قالی ہے
سرورِ نشۂ گردش اگر کیفیت افزا ہو | | نہاں ہر گردِ بادِ دشت میں جامِ سفالی ہے
عروجِ نشہ ہے سر تا قدم قدِ چمن رویاں | | بجائے خود وگرنہ سرو بھی مینائے خالی ہے
ہُوا آئینہ جامِ بادہ عکسِ روئے گلگوں سے | | نشانِ خالِ رخ، داغِ شرابِ پرتگالی ہے
بہ پائے خامۂ مُو، طے رہِ وصفِ کمر کیجے | | کہ تارِ جادۂ سر منزلِ نازک خیالی ہے
اسدؔ اٹھنا قیامت قامتوں کا وقتِ آرائش
لباسِ نظم میں بالیدنِ مضمونِ عالی ہے

تغافل دوست ہوں، میرا دماغِ عجز عالی ہے | قلمی | اگر پہلو تہی کیجے تو جا میری بھی خالی ہے
بتانِ شوخ کا دِل سخت ہوگا کس قدر یارب | | مری فریاد کو کہسار سازِ عجز مالی ہے
نشانِ بے قرارِ شوخ جز مژگاں نہیں باقی | | کئی کانٹے ہیں اور پیراہنِ شکلِ نہالی ہے
جنوں کر اے چمن تحریرِ درسِ شغلِ تنہائی | | نگاہِ شوق کو صحرا بھی دیوانِ غزالی ہے
سیہ مستی ہے اہلِ خاک کو ابرِ بہاری سے | | زمیں جوشِ طرب سے جامِ لبریزِ سفالی ہے
رہا آباد عالم اہلِ ہمت کے نہ ہونے سے | م | بھرے ہیں جس قدر جام و سبو مےخانہ خالی ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۷) غالبؔ کی قلمی موجود ہے جو اب عام طور پر متداول ہے۔ یہ ایک غزل ہی اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ پچیس سال کی عمر سے پہلے بھی غالبؔ کی شاعری کس درجۂ کمال تک پہنچ چکی تھی۔

ؔ پہلے یہ مصرع متن میں یوں لکھا تھا: "زمیں کیفیتِ یک جامِ لبریزِ سفالی ہے۔"

اسدؔ مت رکھ تعجّب خرد ماغی ہائے منعم کا
کہ یہ نامرد بھی شیر افگنِ میدانِ قالی ہے

نشۂ مے بے چمن دودِ چراغِ کشتہ ہے قلمی جام، داغِ شعلہ اندودِ چراغِ کشتہ ہے
رحم کر ظالم کہ کیا بودِ چراغِ کشتہ ہے م نبضِ بیمارِ وفا دودِ چراغِ کشتہ ہے
داغِ ہم دیگر ہیں اہلِ باغ، گر گل ہو شہید لالہ چشمِ حسرت آلودِ چراغِ کشتہ ہے
شور ہے کس بزم کی عرضِ جراحت خانہ کا صبح یک زخمِ نمک سودِ چراغِ کشتہ ہے
نامرادِ جلوہ ہر عالم میں حسرت گل کرے لالہ داغِ شعلہ فرسودِ چراغِ کشتہ ہے
ہو جہاں تیرا دماغِ نازِ مستِ بے خودی خوابِ نازِ گلرخاں دودِ چراغِ کشتہ ہے
ہے دلِ افسردہ داغِ شوخیِ مطلب اسدؔ شعلہ آخر فالِ مقصودِ چراغِ کشتہ ہے

دل لگی کی آرزو بے چین رکھتی ہے ہمیں
مطبوعہ ورنہ یاں بے رونقی سودِ چراغِ کشتہ ہے

گلشن کو تری صحبت ازبسکہ خوش آئی ہے نجی ہر غنچہ کا گل ہونا آغوش کشائی ہے
واں کنگرِ استغنا ہر دم ہے بلندی پر م یاں نالے کو اور اُلٹا دعوائے رسائی ہے
آئینہ نفس سے بھی ہوتا ہے کدورت کش عاشق کو غبارِ دل اک وجہِ صفائی ہے
داغوں کا نظر آنا خود چشم نمائی ہے
ازبسکہ سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے م
جو داغ نظر آیا اک چشم نمائی ہے
ہنگامِ تصوّر ہوں دریوزہ گرِ بوسہ یہ کاسۂ زانو بھی اک جامِ گدائی ہے

وہ دیکھ کے حُسن اپنا مغرور ہوا غالبؔ
صد جلوۂ آئینہ یک صُبحِ جدائی ہے

یوں بعدِ ضبطِ اشک پھروں گرد یار کے
تمی پانی پیے کسو پہ کوئی جیسے وار کے

سیماب پشتِ گرمیِ آئینہ دے ہے ہم
م حیراں کیے ہوئے ہیں دلِ بیقرار کے

بعد از وداعِ یار بخوں در طپیدہ ہیں
نقشِ قدم ہیں ہم کفِ پائے نگار کے

ظاہر ہے ہم سے کلفتِ بختِ سیاہ روز
گویا کہ تختۂ مشق ہیں خطِ غبار کے

حسرت سے دیکھ رہتے ہیں ہم آب و رنگِ گل
مانندِ شبنم اشک ہیں مژگانِ خار کے

آغوشِ گل کشودہ برائے وداع ہے
م اے عندلیب چل کہ چلے دن بہار کے

ہم مشقِ فکرِ وصل و غمِ ہجر سے اسد
لائق نہیں رہے ہیں غمِ روزگار کے

بہ نقصِ ظاہری رنگِ کمالِ طبع پنہاں ہے
تمی کہ بہرِ مدّعاتے دل زبانِ لال زنداں ہے

خموشی خانہ زادِ چشمِ بے پروا نگاہاں ہے
غبارِ سرمہ یاں گردِ سوادِ سنبلستاں ہے

صفائے اشک میں داغِ جگر جلوہ دکھاتے ہیں
پرِ طاؤس گویا برقِ ابرِ چشمِ گریاں ہے

بہ بوئے زلفِ مشکیں یہ دماغِ آشفتہ رم ہیں
کہ شاخِ آہواں دودِ چراغِ آسا پریشاں ہے

تکلف برطرف ہے جاں ستاں تر لطفِ بدخویاں
م نگاہِ بے حجابِ یار تیغِ تیزِ عریاں ہے

اسد یہ فرطِ غم نے کی تلف کیفیتِ شادی
ہوئی یہ کثرتِ غم سے تلف کیفیتِ شادی
م کہ صبحِ عید مجھ کو بدتر از چاکِ گریباں ہے

جہاں زندانِ موجستانِ دلہائے پریشاں ہے
تمی طلسمِ شش جہت یک حلقۂ گردابِ طوفاں ہے

نہیں ہے ثروتِ صاحب دلاں جز کسبِ جمعیت
سویدا ایں نفس مانندِ خطِ در نقطہ پنہاں ہے

غبارِ دشتِ وحشت سرمہ سازِ انتظار آیا
کہ چشمِ آبلہ میں طولِ میلِ راہ مژگاں ہے

ز بس وحشیِ رمِ آہو پہ بے محمل تمنا کا
جنونِ قیس سے بھی شوخیِ لیلیٰ نمایاں ہے

نقابِ یار ہے غفلت نگاہی اہلِ بینش کی   مژہ پوشیدنیہا پردۂ تصویرِ عریاں ہے

اسد بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ یک عالم گلستاں ہے

ہجومِ نالہ حیرت عاجزِ عرضِ یک افغاں ہے   تم   خموشی ریشۂ صد نیستاں سے خس بدنداں ہے
کجا مے، کو عرق سعیِ عروجِ نشہ رنگیں تر   خطِ رخسارِ ساقی تا خطِ ساغر چراغاں ہے
رہا بے قدر دل در پردۂ جوشِ ظہور آخر   گل و نرگس بہم آئینۂ اقلیمِ کوراں ہے
تکلف سازِ رسوائی ہے غافل شرمِ رعنائی   دلِ خوں گشتہ در دستِ حنا آلودہ عریاں ہے
تماشا سرخوشِ غفلت ہے باوصفِ حضورِ دل   ہنوز آئینہ خلوت گاہِ نازِ ربطِ مژگاں ہے
تکلف برطرف ذوقِ زلیخا جمع کر، ورنہ   پریشاں خوابِ آغوشِ وداعِ یوسفستاں ہے

اسد جمعیتِ دل درکنارِ بے خودی خوشتر
دو عالم آگہی سامانِ یک خوابِ پریشاں ہے

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے   مطلع   کہ اس بازار میں ساغر متاعِ دستگرداں ہے

غمِ آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

عاشق نقابِ جلوۂ جانانہ چاہیے   مطلع   فانوسِ شمع کو پرِ پروانہ چاہیے
ہے وصل، ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں   م   معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے
پیدا کریں دماغِ تماشائے سرو و گل   حسرت کشوں کو ساغر و مینا نہ چاہیے
دیوانگاں ہیں حاملِ رازِ نہانِ عشق   اے بے تمیز گنج کو ویرانہ چاہیے
اس لب سے مل ہی جائے گا بوسہ کبھی تو ہاں   م   شوقِ فضول و جرأتِ رندانہ چاہیے

ساقی! بہارِ موسمِ گل ہے سرور بخش　　پیماں سے ہم گزر گئے پیمانہ چاہیے

جادہ ہے طرزِ گفتگوئے یار اے اسد

یاں جز فسوں نہیں اگر افسانہ چاہیے

چاک کی خواہش اگر وحشت بہ عریانی کرے　تہی　صبح کی مانند زخمِ دل گریبانی کرے

میکدہ گر چشمِ مستِ یار سے پائے شکست　م　موئے شیشہ دیدۂ ساغر کی مژگانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے زلف کو اُلفت نے عہد　م　یک قلم منظور ہے جو کچھ پریشانی کرے

ہاتھ پر گر ہاتھ مارے یار وقتِ قہقہہ　　کرمکِ شب تاب آسا مہ پر افشانی کرے

وقت اُس افتادہ کا خوش جو قناعت سے اسد

نقشِ پائے مور کو تختِ سلیمانی کرے

جلوہ کا تیرے وہ عالم ہے اگر کیجے خیال　مجو　دیدۂ دل کو زیارت گاہِ حیرانی کرے

ہے شکستن سے بھی دل نومید یارب کب تلک

آبگینہ کوہ پر عرضِ گراں جانی کرے

چشمِ خوباں مے فروشِ نشہ زارِ ناز ہے　قلمی　سرمہ گویا موجِ دودِ شعلۂ آواز ہے

ہے صریرِ خامہ ریزش ہائے استقبالِ ناز　　نامہ خود پیغام کو بال و پرِ پرواز ہے

سرنوشتِ اضطراب انجامیِ اُلفت نہ پوچھ　　نالِ خامہ خار خارِ پیراہنِ آغاز ہے

نالۂ دل نغمہ ریزاں ہے بہ مضرابِ خیال　　رشتۂ پایاں نوا سامانِ بندِ ساز ہے

شرم ہے طرزِ تلاشِ انتخابِ یک نگاہ　　اضطرابِ چشم بر پا دوختہ غماز ہے

شوخیِ اظہار کو جز وحشتِ مجنوں اسد

بسکہ لیلائے سخن محمل نشینِ راز ہے

چشمِ خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے مطبوعہ سرمہ تو کہوے کہ دودِ شعلۂ آواز ہے
پیکرِ عشاق سازِ طالعِ ناساز ہے نالہ، گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے
دست گاہِ دیدۂ خونبارِ مجنوں دیکھنا
یک بیاباں جلوۂ گل فرشِ پا انداز ہے

خوابِ جمعیتِ مخمل ہے پریشاں مجھ سے تمی رگِ بستر کو ملی شوخیِ مژگاں مجھ سے
آرزو خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
غمِ عشاق نہ ہو سادگی آموزِ بتاں م کس قدر خانۂ آئینہ ہے ویراں مجھ سے
گنجِ تاریک و کمیں گیریِ اختر شمری عینکِ چشم بنا روزنِ زنداں مجھ سے
اے تسلی ہوسِ وعدہ فریب افسوں ہے ورنہ کیا ہو نہ سکے نالہ بساماں مجھ سے
بستنِ عہدِ محبت ہمہ نادانی تھا چشمِ نکشودہ رہا عقدۂ پیماں مجھ سے
آتش افروزیِ یک شعلۂ ایماں تجھ سے چشمک آرائیِ صد شہر چراغاں مجھ سے
اے اسدؔ دسترسِ وصلِ تمنا معلوم
کاش ہو قدرتِ برچیدنِ داماں مجھ سے

ہر قدم دوریِ منزل ہے نمایاں مجھ سے تمہا میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے
درسِ عنوانِ تماشا بہ تغافل خوشتر م ہے نگہ رشتۂ شیرازۂ مژگاں مجھ سے
دود کی طرح رہا سایہ گریزاں مجھ سے
وحشتِ آتشِ دل سے شبِ تنہائی میں م صورتِ دود رہا سایہ گریزاں مجھ سے
اثرِ آبلہ کرتا ہے بیاباں روشن جادہ جوں رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے
اثرِ آبلہ سے، جادۂ صحرائے جنوں م صورتِ رشتۂ گوہر ہے چراغاں مجھ سے

بیکسی ہائے شب ہجر کی وحشت مت پوچھ
بیکسی ہائے شب ہجر کی حسرت ہے ہے [1] — سایۂ خورشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

بے خودی بسترِ تمہیدِ فراغت ہو جو — پُر ہے سائے کی طرح میرا شبستاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں گر تُو مجھے گردن مارے — جُوں گُلِ شمع ہو نظارہ پریشاں مجھ سے

گردشِ ساغرِ صد جلوۂ رنگیں تجھ سے — آئنہ داریِ یک دیدۂ حیراں مجھ سے

نگہِ گرم سے اک آگ ٹپکتی ہے اسدؔ
ہے چراغاں خس و خاشاکِ گلستاں مجھ سے

بسکہ حیرت سے زپا افتادۂ زنہار ہے — ناخنِ انگشت تبخالِ لبِ بیمار ہے

زلف سے شب درمیاں دادن نہیں ممکن دریغ — ورنہ صد محشر بہ رہنِ صافیِ رخسار ہے

در خیالِ آبادِ سودائے سرِ مژگانِ دوست — صد رگِ جاں جادہ آسا وقفِ نشترزار ہے

بسکہ ویرانی سے کفر و دیں ہوئے زیر و زبر — گردِ صحرائے حرم تا کوچۂ زنار ہے

اے سرِ شوریدہ نازِ عشق و پاسِ آبرو — یک طرف سودا و یکسو منتِ دستار ہے

وصل میں دل انتظارِ طرفہ رکھتا ہے مگر — فتنہ تاراجِ تمنا کے لئے درکار ہے

ایک جا حرفِ وفا لکھا تھا، وہ بھی مٹ گیا — ظاہرا کاغذ ترے خط کا غلط بردار ہے

خانماں ہا پائمالِ شوخیِ دعوےٰ اسدؔ — سایۂ دیوار، سیلابِ در و دیوار ہے

جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پر نہ کیوں [2] — ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

ہے وہی بدمستیِ ہر ذرہ کا خود عذر خواہ — جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

---

[1] یہ تینوں شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر غالب کے قلم کے بڑھائے ہوئے موجود ہیں۔

[2] یہ شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر ایک دوسرے قافیے کی غزل کے ساتھ درج ہے اور فرق فقط یہ ہے کہ وہاں قافیے میں ناچار کی جگہ مجبور ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۱۴۹

مجھ سے مت کہہ "تو ہمیں کہتا تھا اپنی زندگی" زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

آنکھ کی تصویر سر نامے پہ کھینچی ہے، کہ تا
تجھ پہ کھل جاوے کہ اس کو حسرتِ دیدار ہے

تغافل مشربی سے ناتمامی بسکہ پیدا ہے قلمی نگاہِ نازِ چشمِ یار میں زنارِ مینا ہے
تکلف وحشیوں میں ہے تصور ہائے مجنوں کا سوادِ چشمِ آہو عکسِ خالِ روئے لیلیٰ ہے
محبت طرزِ پیوندِ نہالِ دوستی جانے دویدن ریشہ ساں مفتِ رگِ خوابِ زلیخا ہے
کیا یکسر گدازِ دل نیازِ جوششِ حسرت سویدا نسخۂ تہ بندیِ داغِ تمنا ہے
ہجومِ ریزشِ خوں کے سبب رنگ اڑ نہیں سکتا حنائے پنجۂ صیاد مرغِ رشتہ برپا ہے

اسد گر نام والائے علیؑ تعویذِ بازو ہو
غریقِ بحرِ خوں تمثال در آئینہ رہتا ہے

اثر سوزِ محبت کا قیامت بے محابا ہے مل کہ رگ سے سنگ میں تخمِ شرر کا ریشہ پیدا ہے
نہاں ہے گوہرِ مقصود جیبِ خود شناسی میں کہ یاں غواص ہے تمثال اور آئینہ دریا ہے
عزیزو ذکرِ وصلِ غیر سے مجھ کو نہ بہلاؤ[۱] کہ یاں افسونِ خواب افسانۂ خوابِ زلیخا ہے
تصور بہرِ تسکینِ طپیدن ہائے طفلِ دل بباغِ رنگ ہائے رفتہ گلچینِ تماشا ہے
بسعیِ غیر ہے قطعِ لباسِ خانہ ویرانی کہ تارِ جادۂ رہ رشتۂ دامانِ صحرا ہے
مجھے شبہائے تاریکِ فراقِ شعلہ رویاں میں چراغِ خانۂ دل سوزشِ داغِ تمنا ہے

ترے نوکر ترے در پر اسد کو ذبح کرتے ہیں
ستم گر، ناخدا ترس، آشنا کش، ماجرا کیا ہے

۱؎ متن میں یہ شعر پہلے یوں تھا:
عزیزاں گرچہ بہلاتے ہیں ذکرِ وصل سے لیکن مجھے افسونِ خواب افسانۂ خوابِ زلیخا ہے

بہ بزمِ مے پرستی حسرتِ تکلیفِ بےجا ہے (قلمی)
کہ جامِ بادہ، کفِ برلب بہ تکلیفِ تقاضا ہے

نشاطِ دیدۂ بینا ہے، کو خواب و چہ بیداری
بہم آوردہ مژگاں بوسۂ روئے تماشا ہے

نہ لائی شوخیِ اندیشہ تابِ دردِ نومیدی
کفِ افسوس سودن عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

نگہ معمارِ حسرت ہا، چہ آبادی، چہ ویرانی
کہ مژگاں جس طرف وا ہو بہ کف داماںِ صحرا ہے

نسو دے آبلوں میں گر سرشکِ دیدۂ نم سے
بہ جولاں گاہِ نومیدی نگاہِ عاجزاں پا ہے

بہ سختی ہائے قیدِ زندگی، معلوم آزادی
شرر در بندِ دامِ رشتۂ رگہائے خارا ہے

اسدؔ یاسِ تمنا سے نہ رکھ اُمیدِ آزادی
گدازِ آرزو ہا، آبیارِ آرزو ہا ہے

مری ہستی، فضائے حیرت آبادِ تمنا ہے (مطبوعہ[1])
جسے کہتے ہیں نالہ، وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا؟ فصلِ گل کہتے ہیں کس کو؟ کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی، ورنہ اے ہمدم
اثر فریادِ دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائے شوخیِ اندیشہ تابِ رنجِ نومیدی
کفِ افسوس ملنا عہدِ تجدیدِ تمنا ہے

عیادت بسکہ تجھ سے گرمیِ بازارِ بستر ہے
خوشا اقبالِ رنجوری، عیادت کو تم آئے تو } (قلمی)
فروغِ شمعِ بالیں، طالعِ بیدارِ بستر ہے

بہ ذوقِ شوخیِ اعضا تکلف بارِ بستر ہے
معافِ پیچ و تابِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے

معمائے تکلف سربسر چشم پوشیدن
گدازِ شمعِ محفل پیچشِ طومارِ بستر ہے

مژہ فرشِ رہ و دل ناتواں و آرزو مضطر
بہ پائے خفتہ سیرِ وادیِ پُرخارِ بستر ہے

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ داماں ہا
سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن ہے } ۲
دلِ بے دست و پا افتادہ برخوردارِ بستر ہے

---

[1] مطبوعہ دیوانوں کے یہ چاروں شعر قلمی نسخے کے حاشیے پر انہی متداول غزلوں کے ساتھ درج ہیں جو غالباً بعد میں لکھے گئے ہیں۔

بہ طوفان گاہِ جوشِ اضطرابِ وحشتِ شب ہا
بہ طوفاں گاہ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی } ۲ شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر ہے

اسدؔ جوشِ بہارِ دیدۂ بیدار کے صدقے
کبھی آتی ہے جو بالش سے اُس کی زلفِ مشکیں کی } ۲ ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

تپش سے میری وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے مطبوعہ مرا سر رنجِ بالیں ہے، مرا تن بارِ بستر ہے

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بیتابی سے ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

خطر ہے رشتۂ اُلفت رگِ گردن نہ ہو جائے نمی غرورِ دوستی آفت ہے، تُو دشمن نہ ہو جائے
بہ پاسِ شوخیِ مژگاں سرِ ہر خار سوزن ہے تبسّم برگِ گُل کو بخیۂ دامن نہ ہو جائے
جراحت دوزیِ عاشق ہے جائے رحم ڈرتا ہوں کہ رشتہ تارِ اشکِ دیدۂ سوزن نہ ہو جائے
غضب شرم آفریں ہے رنگ ریزیہائے خود بینی سفیدیِ آئینہ کی پنبۂ روزن نہ ہو جائے

سمجھ اِس فصل میں کوتاہیِ نشو و نما غالبؔ
اگر گُل سرو کے قامت پہ پیراہن نہ ہو جائے

دو مژہ براہِ رو بانیدن از دل تیز ہے نمی یہ زمیں مثلِ نیستاں، سخت ناوک خیز ہے
ہو سکے کیا خاک، دست و بازوئے فرہاد سے بے ستوں خوابِ گرانِ خسرو پرویز ہے
ان ستم کیشوں کے کھائے ہیں زبس تیرِ نگاہ پردۂ بادام، یک غربالِ حسرت بیز ہے
خوں چکاں ہے جادہ مانندِ رگِ سودائیاں سبزۂ صحرائے اُلفت، نشترِ خوں ریز ہے

جلوۂ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ
عارضِ گُل دیکھ روئے یار یاد آیا اسدؔ } ۲ جوششِ فصلِ بہاری اشتیاق انگیز ہے

ہے بہارِ تیز رو گلگونِ نکہت پر سوار — یک شکستِ رنگِ گل صد جنبشِ مہمیز ہے

کیوں نہ ہو چشمِ بتاں محوِ تغافل کیوں نہ ہو — یعنی اس بیمار کو نظارے سے پرہیز ہے

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی
وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

ترِ جبیں رکھتی ہے شرمِ قطرہ سامانی مجھے قلمی — موجِ گردابِ حیا ہے چینِ پیشانی مجھے

شبنمِ آسا کو مجالِ سبحہ گردانی مجھے — ہے شعاعِ مہر زنارِ سلیمانی مجھے

بسملِ تصویر ہوں بیتابِ اظہارِ تپش — جنبشِ نالِ قلم، جوشِ پریشانی مجھے

ضبطِ سوزِ دل ہے وجہِ حیرتِ اظہارِ حال — داغ ہے مہرِ دہن، جوں چشمِ قربانی مجھے

شوخ ہے مثلِ حباب از خویش بیروں آمدن — ہے گریباں گیرِ فرصت، ذوقِ عریانی مجھے

وا کیا ہرگز نہ میرا عقدۂ تارِ نفس — ناخنِ بُریدہ ہے تیغِ صفاہانی مجھے

ہوں ہیولائے دو عالم صورتِ تقریر اسدؔ
فکر نے سونپی خموشی کی گریبانی مجھے

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے — کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

بن گیا تیغِ نگاہِ یار کا سنگِ فساں — مرحبا میں، کیا مبارک ہے گراں جانی مجھے

کیوں نہ ہو بے التفاتی، اس کی خاطر جمع ہے — جانتا ہے محوِ پرسش ہائے پنہانی مجھے

میرے غم خانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی — لکھ دیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاش کے — اس قدر ذوقِ نوائے مرغِ بستانی مجھے

لہ یہ دو ہم طرح غزلیں جن میں ایک شعر بھی مشترک نہیں، بالمقابل درج ہیں۔ ان سے غالب کی شاعری کے مختلف دوروں کا اندازہ ہوتا ہے۔

وائے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے

وعدہ آنے کا وفا کیجے، یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ واہ!!
پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزل خوانی مجھے

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

یاد ہے شادی میں عقدِ نالۂ "یارب" مجھے
یاد ہے شادی میں بھی ہنگامۂ "یارب" مجھے
قلمی
سبحۂ زاہد ہوا ہے خندہ زیرِ لب مجھے

ہے کشادِ خاطرِ وابستہ دَر، رہنِ سخن
م
تھا طلسمِ قفلِ ابجد، خانۂ مکتب مجھے

یارب اس آشفتگی کی داد کس سے چاہیے
م
رشک آسائش پہ ہے زندانیوں کی اب مجھے

صبح ناپیدا ہے کلفت خانۂ ادبار میں
توڑنا ہوتا ہے رنگِ یک نفَس ہر شب مجھے

شومیِ طالع سے ہوں ذوقِ معاصی میں اسیر
نامۂ اعمال ہے تاریکیِ کوکب مجھے

دردِ ناپیدا و بے جا تہمتِ وارستگی
پردہ دارِ یاوگی ہے وسعتِ مشرب مجھے

طبع ہے مشتاقِ لذت ہائے حسرت کیا کروں
آرزو سے ہے شکستِ آرزو مطلب مجھے

دل لگا کر آپ بھی غالبؔ مجھی سے ہو گئے
عشق سے آتے تھے مانع میرزا صاحب مجھے

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت ہے
تم
کشاد و بستِ مژہ سیلیِ ندامت ہے

یہ پیچ و تابِ ہوس سلکِ عافیت مت توڑ
م
نگاہِ خفتہ سرِ رشتۂ سلامت ہے
نگاہِ عجز سرِ رشتۂ سلامت ہے

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
م
جنونِ ساختہ و فصلِ گل قیامت ہے

نہ جانوں کیونکہ مٹے داغِ طعنِ بدعہدی م تجھے کہ آئینہ بھی ورطۂ ملامت ہے

اسدؔ! بہارِ تماشائے گلستانِ حیات
وصالِ لالہ عذارانِ سرو قامت ہے

شوخیِ مضرابِ جولاں، آبیارِ نغمہ ہے قلمی برگ ریزِ ناخنِ مطرب، بہارِ نغمہ ہے
کس سے اے غفلت تجھے تعبیرِ آگاہی ملے گوش ہا سیمابی و دل بے قرارِ نغمہ ہے
سازِ عیشِ بے دلی ہے خانہ ویرانی مجھے سیل یاں کوکِ صدائے آبشارِ نغمہ ہے
سنبلی خواں ہے بہ ذوقِ تارِ گیسوئے دراز نالۂ زنجیرِ مجنوں رشتہ دارِ نغمہ ہے
شوخیِ فریاد سے ہے پردۂ زنبورِ گُل کسوتِ ایجادِ بلبل، خارخارِ نغمہ ہے
نشّہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب م شیشۂ مے سروِ سبزِ جویبارِ نغمہ ہے
ہم نشیں! مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ یار م واں تو میرے نالہ کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

غفلتِ استعداد، ذوق و مدّعا غافل اسدؔ
پنبۂ گوشِ حریفاں پود و تارِ نغمہ ہے

خود فروشی ہائے ہستی، بسکہ جائے خندہ ہے قلمی تا شکستِ قیمتِ دل، ہا صدائے خندہ ہے

شوخیِ اظہارِ دنداں ہا برائے خندہ ہے
عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ ہے
م دعوئے جمعیّتِ احباب جائے خندہ ہے

ہیں عدم میں غنچہ ہا عبرت کشِ انجامِ گُل
ہے عدم میں غنچہ محوِ عبرتِ انجامِ گُل
م یک جہاں زانو تأمّل در قفائے خندہ ہے

عیشِ بیتابی حرامِ کلفتِ افسردگی
عرضِ دنداں در دلِ افشردن بنائے خندہ ہے
کلفتِ افسردگی کو عیشِ بے تابی حرام
ورنہ دنداں در دل افشردن بنائے خندہ ہے

نقشِ عبرت در نظر ہا، نقدِ عشرت در بساط   دو جہاں وسعت بقدرِ یک فضائے خندہ ہے

جائے استہزا ہے عشرت کوشئ ہستی اسدؔ   صبح و شبنم فرصتِ نشو و نمائے خندہ ہے

سوزشِ باطن کے ہیں احباب منکر، ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنائے خندہ ہے

حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ ہے   آئنہ زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ ہے

عجزِ دیدن ہا بہ ناز و ناز رفتن ہا بہ چشم   جادۂ صحرائے آگاہی شعاعِ جلوہ ہے

اختلافِ رنگ و بو، طرحِ بہارِ بے خودی   صبحِ گل گردِ ادب گاہِ نزاعِ جلوہ ہے

تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن   چشمِ وا گر دیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ ہے

حسنِ خوباں بسکہ بے قدرِ تماشا ہے اسدؔ
آئینہ یک دستِ ردِّ امتناعِ جلوہ ہے

جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی   مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

سر پر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے عمر   فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی

عالم غبارِ وحشتِ مجنوں ہے سر بسر   کب تک خیالِ طرۂ لیلیٰ کرے کوئی

افسردگی نہیں، طرب انشائے التفات   ہاں درد بن کے دل میں مگر جا کرے کوئی

رونے سے اے ندیم ملامت نہ کر مجھے   آخر کبھی تو عقدۂ دل وا کرے کوئی

تمثالِ جلوہ عرض کر اے حسن، کب تلک   آئینۂ خیال کو دیکھا کرے کوئی

چاکِ جگر سے جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی   کیا فائدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شغل   جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

حسن فروغِ شمعِ سخن دور ہے اسدؔ   پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

وحشت کہاں کہ بیخودی انشا کرے کوئی — قلمی — ہستی کو لفظِ معنیٔ عنقا کرے کوئی

ہے لختِ دل سے جوں مژہ ہر خار شاخِ گل
لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل — م — تا چند باغبانیٔ صحرا کرے کوئی

جو کچھ ہے محوِ شوخیٔ ابروئے یار ہے — آنکھوں کو رکھ کے طاق پہ دیکھا کرے کوئی

ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد- نالہ خیز
ہے وحشتِ طبیعتِ ایجاد، یاس خیز — م — یہ درد وہ نہیں کہ نہ پیدا کرے کوئی

ناکامیٔ نگاہ ہے برقِ نظارہ سوز — م — تُو وہ نہیں کہ تجھ کو تماشا کرے کوئی

عرضِ سرشک پر ہے فضائے زمانہ تنگ — صحرا کہاں کہ دعوتِ دریا کرے کوئی

وہ شوخ اپنے حسن پہ مغرور ہے اسدؔ — دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی

مطبوعہ
ہر سنگ و خشت ہے صدفِ گوہرِ شکست
نقصاں نہیں جنوں سے جو سودا کرے کوئی

باغ تجھ بن گلِ نرگس سے ڈراتا ہے مجھے — قلمی — چاہوں گر سیرِ چمن آنکھ دکھاتا ہے مجھے

نالہ سرمایۂ یک عالم و عالم کفِ خاک — م — آسماں بیضۂ قمری نظر آتا ہے مجھے

جوہرِ تیغ بہ سر چشمۂ دیگر معلوم — م — ہوں میں وہ سبزہ کہ زہراب اگاتا ہے مجھے

مدعا محوِ تماشائے شکستِ دل ہے — م — آئنہ خانے میں کوئی لئے جاتا ہے مجھے

شورِ تمثال ہے کس رشکِ چمن کا یا رب — آئنہ بیضۂ بلبل نظر آتا ہے مجھے

حیرتِ آئنہ انجامِ جنوں ہوں، جوں شمع — کس قدر داغِ جگر شعلہ اٹھاتا ہے مجھے

میں ہوں اور حیرتِ جاوید، مگر ذوقِ خیال — بہ فسونِ نگہِ ناز ستاتا ہے مجھے

حیرتِ فکرِ سخن، سازِ سلامت ہے اسدؔ — دل پسِ زانوئے آئینہ بٹھاتا ہے مجھے

باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے — مطبوعہ — سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں اب مر گئے پر کون اُٹھاتا ہے مجھے

کوہ کے ہوں بارِ خاطر، گر صدا ہو جائیے — بے تکلف اے شرارِ جستہ، کیا ہو جائیے
یاد رکھیے نازہائے التفاتِ اوّلیں — آشیانِ طائرِ رنگِ رسا ہو جائیے
بیضہ آسا ننگِ بال و پر ہے یہ کنجِ قفس — از سرِ نو زندگی ہو، گر رہا ہو جائیے
لطفِ عشقِ ہر یک اندازِ دگر دکھلائے گا — بے تکلف یک نگاہِ آشنا ہو جائیے
داد از دستِ جفائے صدمۂ ضرب المثل — گر ہمہ افتادگی، جوں نقشِ پا ہو جائیے

وسعتِ مشرب نیازِ کلفتِ وحشت اسدؔ
یک بیاباں سایۂ بالِ ہما ہو جائیے

داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بہ دنداں ہے — اے ہوس مبارک ہو کارِ عشق آساں ہے
کارگاہِ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے — برقِ خرمنِ راحت، خونِ گرمِ دہقاں ہے
حیرتِ تپیدن ہا، خوں بہائے دیدن ہا — رنگِ گل کے پردے میں آئینہ پرافشاں ہے
عشق کے تغافل سے ہرزہ گردیٔ عالم — روئے شش جہت آفاق پشتِ چشمِ زنداں ہے
غنچہ تا شگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم — باوجودِ دلجمعی خوابِ گل پریشاں ہے
گل بہ کوہ از لالہ، بزمِ سازِ بے تابی — شکلِ دودِ مجمر ہا، داغِ بال افشاں ہے

اے کرم نہ ہو غافل، ورنہ ہے اسدؔ بیدل
از گہر صدف خالی پشتِ چشمِ نیساں ہے

ہم سے رنجِ بیتابی کس طرح اُٹھایا جائے — داغِ پشتِ دستِ عجز، شعلہ خس بہ دنداں ہے

غم و عشرت قدم بوسِ دلِ تسلیم آئیں ہے ‌ ‌ قلمی ‌ ‌ دعائے مدعا گم کردگانِ عشق "آمیں" ہے
تماشا ہے کہ ناموسِ وفا رسوائے آئیں ہے ‌ ‌ نفس تیری گلی میں خوں ہوا اور بازِ رنگیں ہے
لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی ‌ ‌ م ‌ ‌ قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے
ہمارا دیکھنا گر ننگ ہے سیرِ گلستاں کم ‌ ‌ شرارِ آہ سے موجِ صبا دامانِ گلچیں ہے
پیامِ تعزیت پیدا ہے اندازِ عیادت سے ‌ ‌ شبِ ماتم تہِ دامانِ دودِ شمع بالیں ہے
زبس جو حسنِ منت ناگوارا ہے طبیعت پر ‌ ‌ کشادِ عقدہ، محوِ ناخنِ دستِ نگاریں ہے
نہیں ہے سرنوشتِ عشق، غیر از بے دماغی ہا ‌ ‌ جبیں پر میری مدِ خامۂ قدرت خطِ چیں ہے
بہارِ باغ پامالِ خرامِ جلوہ فرمایاں ‌ ‌ حنا سے دست و خونِ کشتگاں سے تیغ رنگیں ہے

بیابانِ فنا ہے بعد صحرائے طلب غالبؔ
پسینہ توسنِ ہمت کا سیلِ خانہ زیں ہے

دیکھتا ہوں وحشتِ شوقِ خروش آمادہ سے ‌ ‌ قلمی ‌ ‌ فالِ رسوائی سرشکِ سر بہ صحرا دادہ سے
دام گر سبزے میں پنہاں کیجیے طاؤس ہو ‌ ‌ جوشِ نیرنگِ بہارِ عرضِ صحرا دادہ سے
{ پانزابِ سیلِ طوفانِ صدائے آب ہے
{ آمدِ سیلابِ طوفانِ صدائے آب ہے ‌ ‌ م ‌ ‌ نقشِ پا جو کان میں رکھتا ہے انگلی جادہ سے
بزمِ مے وحشت کدہ ہے کس کی چشمِ مست کا ‌ ‌ م ‌ ‌ شیشے میں نبضِ پری پنہاں ہے موجِ بادہ سے
خیمۂ لیلیٰ سیاہ و خانۂ مجنوں خراب ‌ ‌ جوشِ ویرانی ہے عشقِ داغِ بیروں دادہ سے

بزمِ ہستی وہ تماشا ہے کہ جس کو ہم اسدؔ
دیکھتے ہیں چشمِ از خوابِ عدم نکشادہ سے

منت کشی میں حوصلہ بے اختیار ہے ‌ ‌ قلمی ‌ ‌ دامانِ صد کفن تہِ سنگِ مزار ہے

عبرت طلب ہے حلِ معمائے آگہی　　شبنم، گدازِ آئینۂ اعتبار ہے
ہے ذرہ ذرہ تنگیِ جا سے غبارِ شوق　م　گر دام یہ ہے، وسعتِ صحرا شکار ہے
خجلت کشِ وفا کو شکایت نہ چاہیے　　اے مدعی! طلسمِ عرق بے غبار ہے
کس کا سراغ جلوہ ہے حیرت کو اے خدا　م　آئینہ فرشِ شش جہتِ انتظار ہے
چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگِ گل پر آب　م　اے عندلیب وقتِ وداعِ بہار ہے

کیفیتِ ہجومِ تمنا رسا اسد
خمیازہ ساغرِ مے رنجِ خمار ہے

جس جا نسیم شانہ کشِ زلفِ یار ہے　　نافہ، دماغِ آہوئے دشتِ تتار ہے
دل مت گنوا، خبر نہ سہی، سیر ہی سہی　م　اے بے دماغ آئینہ تمثال دار ہے
زنجیر یاد پڑتی ہے جادے کو دیکھ کر　　اس چشم سے ہنوز نگہ یادگار ہے
بے پردہ سوئے وادیِ مجنوں گزر نہ کر　م　ہر ذرے کے نقاب میں دل بے قرار ہے
سودائیِ خیال ہے طوفانِ رنگ و بو　　یاں ہے کہ داغِ لالہ دماغِ بہار ہے
بھونچال میں گرا تھا یہ آئینہ طاق سے　　حیرت شہیدِ جنبشِ ابروئے یار ہے
حیراں ہوں شوخیِ رگِ یاقوت دیکھ کر　　یاں ہے کہ صحبتِ خس و آتش برار ہے
اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں　م　طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے
غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ وفا
غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط　م　اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے
دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ　　نظارہ کا مقدمہ پھر روبکار ہے

پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے
وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے   تھی   نگاہ دل سے تری سرمہ سا نکلتی ہے

بہ حلقۂ خمِ گیسوئے راستی آموز   دہانِ مار سے گویا صبا نکلتی ہے

برنگِ شیشہ ہوں یک گوشۂ دلِ خالی   کبھی پری مری خلوت میں آ نکلتی ہے

فشارِ تنگیِ صحبت سے آتی ہے شبنم   صبا جو غنچہ کی خلوت میں جا نکلتی ہے
فشارِ تنگیِ خلوت سے بنتی ہے شبنم   م   صبا جو غنچے کے پردے میں جا نکلتی ہے

نہ پوچھ سینۂ عاشق سے آبِ تیغِ نگاہ   م   کہ زخمِ روزنِ در سے ہوا نکلتی ہے

اسد کو حسرتِ عرضِ نیاز تھی دمِ قتل
ہنوز یک سخنِ بے صدا نکلتی ہے

آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے   تھی   ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

ہے انتظار سے شرر آبادِ رستخیز   مژگانِ کوہکن رگِ خارا کہیں جسے

حسرت نے لا رکھا تری بزمِ خیال میں   م   گلدستۂ نگاہ، سویدا کہیں جسے

کس فرصتِ وصال پہ ہے گل کو عندلیب   زخمِ فراق، خندۂ بے جا کہیں جسے

ہے تار و پودِ فرشِ تبسم بہ بزمِ عیش
درکار ہے شگفتنِ گلہائے عیش کو   م   صبحِ بہار، پنبۂ مینا کہیں جسے

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا   م   افسونِ انتظارِ تمنا کہیں جسے

یارب! ہمیں تو خواب میں بھی مت دکھائیو   یہ محشرِ خیال کہ دنیا کہیں جسے

سر پر ہجومِ دردِ غریبی سے ڈالیے   م   وہ ایک مشتِ خاک کہ صحرا کہیں جسے

ہے چشمِ تر میں حسرتِ دیدار سے نہاں   م   شوقِ عناں گسیختہ، دریا کہیں جسے

غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے
م   ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

شبنم، بہ گُلِ لالہ نہ خالی ز ادا ہے تھی داغِ دلِ بے درد نظرگاہِ حیا ہے

دل خوں شدۂ کشمکشِ کثرتِ اظہار
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار م آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا ہے

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد ذوق م آئینہ بہ اندازِ گُل آغوش کشا ہے

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ م اے نالہ! نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

مجبوری و دعوائے گرفتاریِ اُلفت م دامن تہِ سنگ آمدہ احرامِ وفا ہے
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

سررشتۂ بیتابیِ دل در گرہِ عجز پرواز بہ خوں خفتہ و فریاد رسا ہے

اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب اِدھر بھی م سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

معلوم ہوا حالِ شہیدانِ گزشتہ م تیغِ ستم آئینۂ تصویر نما ہے

بیگانگیِ خلق سے بیدل نہ ہو غالبؔ
م کوئی نہیں تیرا تو مری جان! خدا ہے

شعلے سے نہ ہوتی ہوسِ شعلہ نے جو کی بعد جی کس قدر افسردگیِ دل پہ جلا ہے

تُو نے تری افسردہ کیا وحشتِ دل کو معشوقی و بے حوصلگی طرفہ بلا ہے

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب! اگر اِن کردہ گناہوں کی سزا ہے

---

(۲)

پھونکتا ہے نالہ ہر شب صورِ اسرافیل کی ہم کو جلدی ہے مگر تو نے قیامت ڈھیل کی

کی ہیں کس پانی سے یاں یعقوب نے آنکھیں سفید ہے جو آبی پیرہن ہر موج رودِ نیل کی

؎ یہ وہ غزلیں ہیں جن کا ہم طرح کوئی شعر مطبوعہ دیوان میں موجود نہیں۔

عرش پر تیرے قدم سے ہے دماغِ گردِ راہ — آج تنخواہِ شکستن ہے کلہ جبریل کی

مدعا در پردہ، یعنی جو کہوں باطل سمجھ — وہ فرنگی زادہ کھاتا ہے قسم انجیل کی

خیر خواہِ دید ہوں از بہرِ دفعِ چشمِ زخم — کھینچتا ہوں اپنی آنکھوں میں سلائی نیل کی

نالہ کھینچا ہے سراپا داغِ جرأت ہوں اسدؔ

کیا سزا ہے میرے جرمِ آرزو تاویل کی،

کیا ہے ترکِ دنیا کاہلی سے — ہمیں حاصل نہیں بے حاصلی سے

خراجِ دیہِ ویراں یک کفِ خاک — بیاباں خوش ہوں تیری عاملی سے

پر افشاں ہو گئے شعلے ہزاروں — رہے ہم داغ، اپنی کاہلی سے

خدا، یعنی پدر سے مہرباں تر — پھرے ہم دربدر ناقابلی سے

اسدؔ، قربانِ لطفِ جورِ بیدل

خبر لیتے ہیں لیکن بیدلی سے

نگاہِ اُس چشم کی افزوں کرے ہے ناتوانائی — پرِ بالش ہے وقتِ دیدِ مژگانِ تماشائی

شکستِ قیمتِ دل، آں سوئے عذرِ شناسائی — طلسمِ ناامیدی ہے خجالت گاہِ پیدائی

تحیّر ہے گریباں گیرِ ذوقِ جلوہ پیرائی — ملی ہے جوہرِ آئینہ کو، جوں بخیہ گیرائی

پرِ طاؤس سے ہے نیرنگِ داغِ حیرت انشائی — دو عالم دیدۂ بسمل چراغاں جلوہ پیمائی

شرارِ سنگ سے پا در حنا گلگونِ تغییر ہے — ہنوز اے تیشۂ فرہاد عرضِ آتش پائی

غرورِ دستِ رد نے شانہ توڑا فرقِ ہدہد پر — سلیمانی ہے ننگِ بے دماغانِ خود آرائی

جنوں افسردہ و جاں ناتواں اے جلوہ شوخی کر — گئی یک عمرِ خودداری بہ استقبالِ رعنائی

نگاہِ حیرت افسوں، گاہ برق و گاہ مشعل ہے — ہوا ہے خلوت و جلوت سے حاصل ذوقِ تنہائی

خدایا! خوں ہو رنگِ امتیاز اور نالہ موزوں ہو
جنوں کو سخت بیتابی ہے تکلیفِ شکیبائی

جنوں بے کسی ساغر کشِ داغِ پلنگ آیا
شرر کیفیتِ مے رنگِ عرضِ نازِ مینائی

خراباتِ جنوں میں ہے اسدؔ وقتِ قدح نوشی
بعشقِ ساقیِ کوثر بہارِ بادہ پیمائی

بسکہ زیرِ خاک، با آبِ طراوت راہ ہے
ریشہ سے ہر تخم کا دلو اندرونِ چاہ ہے

عکسِ گلہائے سخن سے چشمہ ہائے باغ میں
فلسِ ماہی آئینہ پردازِ داغِ ماہ ہے

واں سے ہے تکلیفِ عرضِ بے دماغی ہائے دل
یاں صریرِ خامہ مجھ کو نالۂ جانکاہ ہے

حسن در رعنائی میں وہمِ صد سرو گردن ہے فرق
سرو کے قامت پہ گل یک دامنِ کوتاہ ہے

رشک ہے آسائشِ اربابِ غفلت پر اسدؔ
پیچ و تابِ دل نصیبِ خاطرِ آگاہ ہے

بسکہ چشم از انتظارِ خوش خطاں بے نور ہے
یک قلم شاخِ گلِ نرگس عصائے کور ہے

بزمِ خوباں بسکہ جوشِ جلوہ سے پُر نور ہے
پشتِ دستِ عجز یاں ہر برگِ نخلِ طور ہے

ہوں تصور ہائے ہمدوشی سے بدمستِ شراب
حیرتِ آغوشِ خوباں ساغرِ بلور ہے

ہے عجب سردوں کو غفلت ہائے اہلِ دہر سے
سبزہ جوں انگشتِ حیرت در دہانِ گور ہے

حسرت آبادِ جہاں میں ہے الم غم آفریں
نوحہ گویا خانہ زادِ نالۂ رنجور ہے

کیا کروں غم ہائے پنہاں لے گئے صبر و قرار
دزد گر ہو خانگی تو پاسباں مجبور ہے

ہے ز پا افتادگی ہی نشہ پیمائی مجھے
بے سخن ہنگامۂ لب دانۂ انگور ہے

آگ سے[1] پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے مجبور ہے

[1] یہ اور اس سے قبل کا شعر حاشیے پر بعد میں بڑھائے گئے ہیں۔ مطبوعہ دیوان میں اس شعر کا قافیہ "مجبور" کی بجائے "لاچار" ہے۔ ملاحظہ ہو نسخۂ اصل ص ۱۴۲

جس جگہ ہو مسند آرا جانشینِ مصطفیٰؐ — اس جگہ تختِ سلیماں نقشِ پائے مور ہے

ہے وہاں تکلیفِ عرضِ بے دماغی اور اسدؔ
یاں صریرِ خامہ مجھ کو نالۂ رنجور ہے

اے خیالِ وصل نادر ہے مے آشامی تری — پختگی ہائے کبابِ دل ہوئی خامی تری

رچ گیا، جوشِ صفائے زلف کا، اعضا میں عکس — ہے نزاکت جلوہ، اے ظالم! سیہ فامی تری

برگ ریزی ہائے گل ہے، وضعِ زرافشاندنی — باج لیتی ہے گلستاں سے گل اندامی تری

بسکہ ہے عبرت، ادیبِ یادِ گیہائے ہوس — میرے کام آئی دلِ مایوس! ناکامی تری

ہم نشینیِ رقیباں، گرچہ ہے سامانِ رشک — لیکن اس سے ناگوارا تر ہے بدنامی تری

سر بزانوئے کرم رکھتی ہے شرمِ ناکسی
اے اسدؔ! بیجا نہیں ہے غفلت آرامی تری

ربطِ تمیزِ اعیاں، دُردِ مے صدا ہے — اعمیٰ کو سرمۂ چشم آوازِ آشنا ہے

موئے دماغِ وحشت، سر رشتۂ فنا ہے — شیرازۂ دو عالم یک آہِ نارسا ہے

دیوانگی ہے تجھ کو، درسِ خرامِ دنیا — موجِ بہار، یکسر زنجیرِ نقشِ پا ہے

پروانہ سے ہو شاید تسکینِ شعلۂ شمع — آسائشِ وفا ہا، بیتابیِ جفا ہے

اے اضطراب سرکش! ایک سجدہ وار تمکیں — میں بھی ہوں شمعِ کشتہ، گر داغ خوں بہا ہے

نے حسرتِ تسلی، نے ذوقِ بے قراری — یک درد و صد دوا ہے، یک دست و صد دعا ہے

ویرانۂ مے ہے ساقی، لیکن خمار باقی — تا کوچہ دادنِ موج، خمیازہ آشنا ہے

وحشت نہ کھینچ قاتل! حیرت نفس ہے بسمل — جب نالہ خوں ہو غافل! تاثیر کیا بلا ہے

بتخانہ میں اسدؔ بھی بندہ تھا گاہ گہے — حضرت چلے حرم کو، اب آپ کا خدا ہے

گر یاس سر نہ کھینچے، تنگی عجب فضا ہے
وسعت گہِ تمنا، یک بام و صد ہوا ہے

برہم زنِ دو عالم، تکلیفِ یک صدا ہے
مینا شکستگاں کو کہسار خوں بہا ہے

فکرِ سخن، یک انشائے زندانیِ خموشی
دودِ چراغ گویا زنجیرِ بے صدا ہے

موزونیِ دو عالم، قربانِ سازِ یک درد
مصراعِ نالۂ نے، سکتہ ہزار جا ہے

درسِ خرام، تا کے، خمیازۂ روانی
اس موجِ مے کو، غافل! پیمانہ نقشِ پا ہے

گردش میں لا تجلی، صد ساغرِ تسلی
چشمِ تحیر آغوش، مخمورِ مدعا ہے

یک برگِ بے نوائی، صد صوتِ نیستاں
طوفانِ نالۂ دل، تا موجِ بوریا ہے

اے غنچۂ تمنا! یعنی کفِ نگاریں
دل دے تو ہم بتا دیں، مٹھی میں تیری کیا ہے

ہر نالہ اسدؔ ہے مضمونِ داد خواہی
یعنی سخن کو کاغذ، احرامِ مدعا ہے

ضبط سے جوں مردمک اسپند آرامت گیر ہے
مجمرِ بزمِ فسردن، دیدۂ نخچیر ہے

آشیاں بندِ بہارِ عیش ہوں ہنگامِ قتل
یاں پرِ پروازِ رنگِ رفتہ بالِ تیر ہے

ہے جہاں فکرِ کشیدن ہائے نقشِ روئے یار
ماہتاب ہالہ پیرا، گردۂ تصویر ہے

وقتِ حسن افروزیِ زینت طرازاں جائے گل
از نہالِ شمع پیدا غنچۂ گلگیر ہے

گریہ سے بندِ محبت میں ہوئی نام آوری
لختِ لختِ دل، نگینِ خانۂ زنجیر ہے

ریزشِ خونِ وفا ہے جرعۂ نوشیدنِ یار
یاں گلوئے شیشۂ مے قبضۂ شمشیر ہے

جو بہ شامِ غم، چراغِ خلوتِ دل تھا اسدؔ
وصل میں، وہ، سوزِ شمعِ مجلسِ تقریب ہے

ذوقِ بے پروا خرابِ وحشتِ تسخیر ہے
آئینہ خانہ مری تمثال کو زنجیر ہے

ذرہ دے مجنوں کے کس کس داغ کو پروازِ عرض
ہر بیاباں ایک بیاباں حسرتِ تعمیر ہے

میکشِ مضموں کو حسنِ رابطِ خط کیا چاہیے
لغزشِ رفتارِ خامہ مستیِ تحریر ہے

خانمانِ جبریانِ غفلتِ معنی خراب
جب اٹھے ہم بے گنہ گر رحمت کی تقصیر ہے

چاہیے گر جنت، جز آدم وارثِ آدم نہیں
شوخیِ ایمانِ زاہد سستیِ تدبیر ہے

شب دراز و آتشِ دل تیز یعنی مثلِ شمع
مہ زِ سرتا ناخنِ پا رزقِ یک شبگیر ہے

آب ہو جاتے ہیں ننگِ ہمتِ باطل سے مرد
اشک پیدا کر اسدؔ گر آہ بے تاثیر ہے

بہ سرنوشت میں تیری ہے اشک افشانی
کہ موجِ آب ہے ہر ایک چینِ پیشانی

جنونِ وحشتِ ہستی یہ عام ہے، کہ بہار
رکھے ہے کسوتِ طاؤس میں پر افشانی

لبِ نگاہ ہیں آئینہ دیکھ، آبِ حیات
بہ گمرہی سکندر ہے محوِ حیرانی

نظر بہ غفلتِ اہلِ جہاں، ہوا ظاہر
کہ عیدِ خلق پہ حیراں ہے چشمِ[لہ] قربانی

کہوں وہ مصرعِ برجستہ وصفِ قامت میں
کہ سرد ہو نہ سکے اس کا مصرعِ ثانی

اسدؔ نے کثرتِ دلہائے خلق سے جانا
کہ زلفِ یار ہے مجموعۂ پریشانی

بجز و زبسکہ خاطرِ بیتاب ہو گئی
مژگانِ بازماندہ رگِ خواب ہو گئی

موجِ تبسمِ لبِ آلودۂ مسی
میرے لیے تو تیغِ سیہ تاب ہو گئی

لہ قلمی نسخے میں اس مصرع کا کوئی لفظ بہ سہوِ کاتب رہ گیا ہے۔ کیونکہ متن میں یہ مصرع یوں درج ہے

"کہ عیدِ خلق پہ حیراں ہے قربانی"

جو کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا۔ میں نے جسارت کر کے ایک لفظ "چشم" بڑھا دیا ہے۔ اربابِ نظر اس جرأت کو معاف فرما کر خود تصحیح فرما دیں۔

رخسارِ یار کی جو ہوئی جلوہ گستری — زلفِ سیاہ بھی شبِ ماہتاب ہو گئی
بیدادِ انتظار کی طاقت نہ لا سکی — اے جانِ برلب آمدہ ابتیاب ہو گئی

غالبؔ زبسکہ سوکھ گئے چشم میں سرشک
آنسو کی بوند گوہرِ نایاب ہو گئی

ہر رنگِ سوز پردۂ یک سازہے مجھے — بالِ سمندر، آئینۂ ناز ہے مجھے
طاؤسِ خاک حسنِ نظر باز ہے مجھے — ہر ذرہ چشمکِ نگہِ ناز ہے مجھے
آغوشِ گل ہے آئینۂ ذرۂ خاک — عرضِ بہار جوہرِ پرواز ہے مجھے
ہے بوئے گل غریبِ تسلّی گہِ وطن — ہر جزوِ آشیاں پرِ پرواز ہے مجھے
ہے جلوۂ خیال سویدائے مردمک — جوں داغِ شعلہ سرخطِ آغاز ہے مجھے
وحشت بہارِ نشہ و گل ساغرِ شراب — چشمِ پری شفق کدۂ راز ہے مجھے
نکہ سخن بہانۂ پردازِ خامشی — دودِ چراغ سرمۂ آواز ہے مجھے

ہے خامہ فیضِ بیعتِ بیدل بہ کفِ اسدؔ
یک نیستاں قلمروِ اعجاز ہے مجھے

نگاہِ یار نے جب عرضِ تکلیفِ شرارت کی — دیا ابرو کو چھیڑا اور اس نے فتنے کو اشارت کی
روانی موجِ مے کی اگر خطِ جام آشنا ہوئے — لکھے کیفیت اس سطرِ تبسم کی عبارت کی
شہِ گل نے کیا جب بندوبستِ گلشن آرائی — عصائے سبز دے نرگس کو دی خدمت نظارت کی
نہیں ریزش عرق کی اب اے ذوبانِ احتیاط ہے — تبِ خجلت نے کیا نبضِ رگِ گل میں حرارت کی

زبس نکلا غبارِ دل بوقتِ گریہ آنکھوں سے
اسدؔ کھائے ہوئے سرمے نے آنکھوں میں بصارت کی

خدایا! دل کہاں تک دن بصد رنج و تعب کاٹے
خمِ گیسو ہو شمشیرِ سیہ تاب اور شب کاٹے

کریں گر قدرِ اشکِ دیدۂ عاشق، خود آرایاں
صدف دندانِ گوہر سے بہ حسرت اپنا لب کاٹے

دریغا! وہ مریضِ غم کہ فرطِ ناتوانی سے
بہ قدرِ یک نفس جادہ، بہ صد رنج و تعب کاٹے

یقیں[1] ہے آدمی کو دستگاہِ فقر حاصل ہو
دمِ تیغِ توکل سے اگر پائے سبب کاٹے

اسدؔ! مجھ میں ہے اُس کے بوسۂ پا کی کہاں جرأت
کہ میں نے دست و پا باہم بہ شمشیرِ ادب کاٹے

ہوا جب حُسن کم، خط بر عذارِ سادہ آتا ہے
کہ بعد از صافِ مے، ساغر میں دُردِ بادہ آتا ہے

نہیں ہے مزرعِ اُلفت میں حاصل غیرِ پامالی
نظر دانہ سرشکِ بر زمیں اُفتادہ آتا ہے

محیطِ دہر میں بالیدن از ہستی گزشتن ہے
کہ یاں ہر اک حباب آسا شکست آمادہ آتا ہے

دیارِ عشق میں جاتا ہے جو سوداگری ساماں
متاعِ زندگانی ہا، بہ غارت دادہ آتا ہے

اسدؔ وارستگاں باوصفِ ساماں بے تعلق ہیں
صنوبر گلستاں میں بادلِ آزادہ آتا ہے

بہ فکرِ حیرتِ رم آئنہ پرداز زانو ہے
کہ مشکِ نافہ، تمثالِ سوادِ چشمِ آہو ہے

ترحم میں ستم کوشاں کے ہے سامانِ خونریزی
سرشکِ چشمِ یار، آبِ دمِ شمشیرِ ابرو ہے

کرے ہے دستِ فرسودِ ہوس وہمِ توانائی
پر افشاندہ۔ درِ کنجِ قفس، تعویذِ بازو ہے

ہوا چرخِ خمیدہ، ناتواں بارِ علائق سے
کہ ظاہر پنجۂ خورشید دستِ زیرِ پہلو ہے

اسدؔ! تا کے طبیعت طاقتِ ضبطِ الم لائے
فغانِ دل بہ پہلو نالۂ بیمارِ بدخو ہے

---

[1] یہ شعر متن میں نہ تھا۔ بعد میں حاشیے پر بڑھا کر غزل کو پورا کیا گیا ہے۔

خبر نگہ کو نگہ، چشم کو عدو جانے
وہ جلوہ کر، کہ نہ میں جانوں اور نہ تُو جانے

نفس بہ نالہ رقیب و نگہ بہ اشک عدو
زیادہ اُس سے گرفتار ہوں کہ تُو جانے

بہ کسوتِ عرقِ شرم قطرہ زن ہے خیال
مبادا حوصلہ معذورِ جستجو جانے

جنوں فسردۂ تمکیں ہے کاش عہدِ وفا
گدازِ حوصلہ کو پاسِ آبرو جانے

نہ ہووے کیونکہ اسے فرضِ قتلِ اہلِ وفا
لہو میں ہاتھ کے بھرنے کو جو وضو جانے

زباں سے عرضِ تمنّائے خامُشی معلوم
مگر وہ خانہ برانداز گفتگو جانے

مسیحِ کشتۂ الفت ببر علی خاں ہے
کہ جو اسدؔ تپشِ نبضِ آرزُو جانے

دیکھ تری خوئے گرم، دل بہ تپش رام ہے
طائرِ سیماب کو، شعلہ رگِ دام ہے

شوخیِ چشمِ حبیب، فتنۂ ایّام ہے
قسمتِ بختِ رقیب، گردشِ صد جام ہے

جلوۂ بینش پناہ بخشی ہے ذوقِ نگاہ
کعبۂ پوششِ سیاہ مردمک احرام ہے

کوُ نفَس، وجہِ غبار، جرأتِ عجز آشکار
در تپش آبادِ شوق سرمہ صدا نام ہے

غفلتِ افسردگی تہمتِ تمکیں نہ ہو
اے ہمہ خوابِ گراں حوصلہ بدنام ہے

بزمِ وداعِ نظر یاس طرب نامہ بر
فرصتِ رقصِ شرر بوسہ بہ پیغام ہے

گریۂ طوفاں رکاب، نالۂ محشر عناں
بے سر و ساماں اسدؔ فتنہ سرانجام ہے

کاوشِ دزدِ حنا پوشیدہ افسوں ہے مجھے
ناخنِ انگشتِ خوباں لعلِ وارُوں ہے مجھے

ریشۂ شہرت دوانیدن ہے دفنِ زیرِ خاک
خنجرِ جلّاد برگِ بیدِ مجنوں ہے مجھے

ساقیا دے ایک ہی ساغر میں سب کچھ کہ آج
آرزوئے بوسۂ لب ہائے میگوں ہے مجھے

ہو گئی باہم دگر، جوشِ پریشانی سے جمع
گردشِ جامِ تمنا دورِ گردوں ہے مجھے

دیکھ لے جوشِ جوانی کی ترقی بھی کہ اب
بدر کی مانند کاہش روز افزوں ہے مجھے

غنچگی ہے بر نفس پیچیدنِ فکر اے اسد
در شگفتن ہائے دل، در رہنِ مضموں ہے مجھے

دلا عبث ہے تمنائے خاطر افروزی
کہ بوسۂ لبِ شیریں ہے اور گلو سوزی

طلسمِ آئینۂ زانوئے فکر ہے غافل
ہنوز حسن کو ہے سعیِ جلوہ اندوزی

ہوئی ہے سوزشِ دل بسکہ داغِ بے اثری
اُگی ہے دودِ جگر سے شبِ سیہ روزی

بہ پرفشانیِ پروانۂ چراغِ مزار
کہ بعدِ مرگ بھی ہے لذتِ جگر سوزی

تپش تو کیا، نہ ہوئی مشقِ پرفشانی بھی
رہا میں ضعف سے شرمندۂ نوآموزی

اسد ہمیشہ پئے کفشِ پائے سیم تناں
شعاعِ مہر سے کرتا ہے چرخ زردوزی

محوِ آمیدگی سامانِ بیتابی کرے
چشم میں توڑے نمکداں تا شکرخوابی کرے

آرزوئے خانہ آبادی نے ویراں تر کیا
کیا کروں گر سایۂ دیوار سیلابی کرے

نغمہ بادا بستۂ یک عقدۂ تارِ نفس
ناخنِ تیغِ بتاں، شاید کہ مضرابی کرے

صبحدم وہ جلوہ ریزِ بے نقابی ہو، اگر
رنگِ رخسارِ گلِ خورشید مہتابی کرے

زخمہائے کہنۂ دل رکھتے ہیں جوں مُردگی
اے خوشا گر آبِ تیغِ ناز تیزابی کرے

بادشاہی کا جہاں یہ حال ہو غالب تو پھر
کیوں نہ دلّی میں ہر اک ناچیز، نوابی کرے

صبح سے معلوم آثارِ ظہورِ شام ہے — غافلاں! آغازِ کار آئینۂ انجام ہے

بسکہ ہیں صیاد، راہِ عشق میں صرفِ کمیں — جادۂ راہ، سربسر مژگانِ چشمِ دام ہے

بسکہ تیرے جلوۂ دیدار کا ہے اشتیاق — ہر بتِ خورشید طلعت آفتابِ بام ہے

مستعدِ قتلِ یک عالم ہے جلّادِ فلک — کہکشاں موجِ شفق میں تیغِ خوں آشام ہے

کیا کمالِ عشق، نقص آبادِ گیتی میں ملے — پختگی ہائے تصور یاں خیالِ خام ہے

ہو جہاں وہ ساقیِ خورشید رو مجلس فروز
واں اسدؔ تارِ شعاعِ مہر خطِ جام ہے

اے خوشا وقتے! کہ ساقی یک خمستاں وا کرے — تار و پودِ فرشِ محفل، پنبۂ مینا کرے

گر شبِ آسودۂ مژگاں تصرف وا کرے — رشتۂ پا شوخیِ بالِ نفس پیدا کرے

گر دکھاؤں صفحۂ بے نقش رنگِ رفتہ کو — دستِ رد سطرِ تبسم یک قلم انشا کرے

جو عزادارِ شہیدانِ نفس دزدیدہ ہو — نوحۂ ماتم بہ آوازِ پرِ عنقا کرے

صفحۂ گرداب جوہر کو بنا ڈالے تنور — عکس گر طوفانیِ آئینۂ دریا کرے

یک درِ بر روئے رحمت بستہ دورِ شش جہت — ناامیدی ہے خیالِ خانہ ویراں کیا کرے

توڑ بیٹھے جبکہ ہم جام و سبو، پھر ہم کو کیا — آسماں سے بادۂ گلفام گو برسا کرے

ناتوانی سے نہیں سر در گریبانی اسدؔ
ہوں سراپا یک قلم تسلیم، جو مولا کرے

بہارِ تعزیت آبادِ عشق ماتم ہے — کہ تیغِ یار ہلالِ مہِ محرم ہے

یہ شعر حاشیے پر بڑھایا گیا ہے اور اس کا آسان اور قریب الفہم ہونا خود ہی کہہ رہا ہے کہ یہ بعد کا کہا ہوا ہے۔ غالب نے اپنے بعض خطوں میں بھی یہ شعر لکھا ہے۔

بہ رہنِ ضبط ہے آئینہ بندیِ گوہر / وگرنہ بحر میں ہر قطرہ چشمِ پُرنم ہے

چمن میں کون ہے طرز آفرینِ شیوۂ عشق / کہ گُل ہے بلبلِ رنگین و بیضہ شبنم ہے

اگر نہ ہووے رگِ خواب صرفِ شیرازہ / تمام دفترِ ربطِ مزاج برہم ہے

اسدؔ! بہ نازکیِ طبع آرزوئے انصاف!
کہ ایک وہمِ ضعیف و غمِ دو عالم ہے

عذارِ یار نظر بندِ چشمِ گریاں ہے / عجب کہ پرتوِ خور شمعِ شبستاں ہے

زباں بہ کامِ خموشاں ز فرطِ تلخیِ ضبط / بہ رنگِ پستہ، بہ زہر آب دادہ پیکاں ہے

قبائے جلوہ فزائے لباسِ عریانی / بہ طرزِ گل، رگِ جاں مجھ کو تارِ داماں ہے

لبِ گزیدۂ معشوق ہے دلِ افگار / نشانِ بُرّشِ شمشیر زخمِ دنداں ہے

کشودِ غنچۂ دلہا عجب نہ رکھ غافل! / صبا خرامیِ خوباں، بہارِ ساماں ہے

فغاں! کہ بہرِ شفائے حصولِ ناشدنی / دماغ نازکشِ منّتِ طبیباں ہے

اسدؔ! جہاں کہ علی بر سرِ نوازش ہو
گُشادِ عقدۂ دُشوار کارِ آساں ہے

شفق بہ دعویِ عاشق گواہِ رنگیں ہے / کہ ماہ دزدِ حنائے کفِ نگاریں ہے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ / خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گلچیں ہے

عیاں ہے پائے حنائی سے پرتوِ خورشید / رکابِ روزنِ دیوارِ خانۂ زیں ہے

جبینِ صبحِ امیدِ فسانہ گویاں پر / درازیِ رگِ خوابِ بتاں خطِ چیں ہے

ہوا نشانِ سوادِ دیارِ حُسن عیاں / کہ خطِ غبارِ زمیں خیزِ زلفِ مشکیں ہے

بجا ہے گر نہ سُنے نالہ ہائے بلبلِ زار / کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

جوہرِ آئینہ ساں مژگاں بہ دل آسودہ ہے
قطرہ، جو آنکھوں سے ٹپکا، سو نگاہ آلودہ ہے

دام گاہِ عجز میں سامانِ آسائش کہاں
پر فشانی بھی فریبِ خاطرِ آسودہ ہے

اے ہوس! عرضِ بساطِ نازِ مشتاقی نہ مانگ
جوں پرِ طاؤس چندیں داغ مشک اندودہ ہے

ہے ریا کا رتبہ بالاتر تصور کردنی
تیرگی سے داغ کی مہ ہیم مس اندودہ ہے

کیا کہوں پرواز کی آوارگی کی کش مکش
عافیت سرمایۂ بال و پرِ نگشودہ ہے

ہے سوادِ خط پریشاں موئے اہلِ عزا
خامہ میرا شمعِ قبرِ کشتگاں کا دودہ ہے

جس طرف سے آئے ہیں آخر اُدھر ہی جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر، راہِ عدم پیمودہ ہے

پنبۂ مینائی ہی رکھ لو تم اپنے کان میں
مے پرستاں! ناصحِ بے صرفہ گو، بیہودہ ہے

کثرتِ انشائے مضمونِ تحیّر سے اسدؔ
ہر سرِ انگشت نوکِ خامۂ فرسودہ ہے

بہرِ پروردن سراسر لطف گستر سایہ ہے
پنجۂ مژگاں بہ طفلِ اشک دستِ دایہ ہے

فصلِ گُل میں دیدۂ خونیں نگاہانِ جنوں
دولتِ نظارۂ گُل سے شفق سرمایہ ہے

شورشِ باطن سے یاں تک مجھ کو غفلت ہے کہ آہ
شیونِ دل یک سرودِ خانۂ ہمسایہ ہے

کیوں نہ تیغِ یار کو مشاطۂ الفت کہوں؟
زخم مثلِ گُل، سراپا کے مرے پیرایہ ہے

اے اسدؔ آباد ہے مجھ سے جہانِ شاعری
خامہ میرا تختِ سُلطانِ سخن کا پایہ ہے

چشمِ گریاں بسملِ شوقِ بہارِ دید ہے
اشک ریزی عرضِ بال افشانئِ اُمید ہے

دامنِ گردوں میں رہ جاتا ہے ہنگامِ وداع
گوہرِ شب تابِ اشکِ دیدۂ خورشید ہے

رتبۂ تسلیمِ خلق مشرباں عالی سمجھ
چشمِ قربانی گُلِ شاخِ ہلالِ عید ہے

کچھ نہیں حاصل، تعلق میں بغیر از کشمکش
اے خوشا رندی! کہ مرغِ گلشنِ تجرید ہے

کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسدؔ
یا علی! وقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

فرصتِ آئینۂ صد رنگ خود آرائی ہے
روز و شب یک کفِ افسوسِ تماشائی ہے

وحشتِ زخمِ وفا دیکھ کہ سرتاسرِ دل
بخیہ جوں جوہرِ تیغ آفتِ گیرائی ہے

شمع آسا، چہ سرِ دعویٰ و کو پائے ثبات؟
گلِ صد شعلہ، بہ یک جیبِ شکیبائی ہے

نالہ، خونیں ورق و دل، گلِ مضمونِ شفق
چمن آرائے نفس وحشتِ تنہائی ہے

بوئے گل، فتنۂ بیدار و چمن جائزۂ خواب
وصل بے رنگِ تپش، کسوتِ رسوائی ہے

شرم، طوفانِ خزاں، رنگ طرب گاہِ بہار
گلِ مہتاب بہ کفِ چشمِ تماشائی ہے

باغِ خاموشیِ دل سے سخنِ عشق اسدؔ
نفسِ سوختۂ رمزِ چمن ایمائی ہے

نوائے خفتۂ الفت اگر بیتاب ہو جاوے
پرِ پروانہ، تارِ شمع پر مضراب ہو جاوے

اگر وحشت عرق افشانِ بے پروا خرامی ہو
بیاضِ دیدۂ آہو کفِ سیلاب ہو جاوے

زبس طوفانِ آبِ گل ہے غافل! کیا تعجب ہے
کہ ہر یک گردبادِ گلستاں گرداب ہو جاوے

اثر میں یاں تک اے دستِ دعا اعجاز پیدا کر
کہ سجدہ قبضۂ تیغِ خمِ محراب ہو جاوے

بہ رنگِ گل اگر شیرازہ بندِ بے خودی رہیے
ہزار آشفتگی مجموعۂ یک خواب ہو جاوے

اسدؔ با وصفِ عجز بے تکلف خاک گردیدن
غضب ہے گر غبارِ خاطرِ احباب ہو جاوے

تا چند نازِ مسجد و بت خانہ کھینچیے
جوں شمع، دل بہ خلوتِ جانانہ کھینچیے

بہزاد، نقشِ یک دلِ صد چاک عرض کر
گر زلفِ یار کھینچ نہ سکے، شانہ کھینچیے

راحت کمینِ شوخیِ تقریبِ نالہ ہے
پائے نظر بہ دامنِ افسانہ کھینچیے

زلفِ پری بہ سلسلۂ آرزو رسا
یک عمر دامنِ دلِ دیوانہ کھینچیے

یعنی دماغِ غفلتِ ساقی رسیدہ تر
خمیازۂ خمار سے پیمانہ کھینچیے

پروازِ آشیانۂ عنقائے ناز ہے
بالِ پری بہ وحشتِ بیجا نہ کھینچیے

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچیے

ہے ذوقِ گریہ عزمِ سفر کیجیے اسدؔ
رختِ جنونِ سیل بہ ویرانہ کھینچیے

دامانِ دل بہ وہمِ تماشا نہ کھینچیے
اے مدعی! خجالتِ بیجا نہ کھینچیے

گل سر بسر اشارۂ جیبِ دریدہ ہے
نازِ بہار، جز بہ تقاضا نہ کھینچیے

حیرت، حجابِ جلوۂ وحشت، غبارِ راہ
پائے نظر بہ دامنِ صحرا نہ کھینچیے

واماندگی بہانہ و دل بستگی فریب
دردِ طلب بہ آبلۂ پا نہ کھینچیے

گر صفحہ کو نہ دیجیے پروازِ سادگی
جز خطِ عجز، نقشِ تمنا نہ کھینچیے

خود نامہ بن کے جائیے اس آشنا کے پاس
کیا فائدہ کہ منتِ بیگانہ کھینچیے

دیدارِ دوستانِ لباسی ہے ناگوار
صورت بہ کارخانۂ دیبا نہ کھینچیے

ہے بے خمار، نشۂ خونِ جگر اسدؔ
دستِ ہوس بہ گردنِ مینا نہ کھینچیے

زلفِ سیہ افعیِ نظرِ بد قلمی ہے
ہر چند خطِ سبز و زمرد رقمی ہے

ہے مشقِ وفا جانتے ہیں، لغزشِ پا تک
اے شمع! تجھے دعویٔ ثابت قدمی ہے

ہے عرضِ شکستِ آئینہ جرأتِ عاشق
جز آہ، کہ سر لشکرِ وحشت علمی ہے

واماندۂ ذوقِ طربِ وصل نہیں ہوں
اے حسرتِ بسیار! تمنا کی کمی ہے

وہ پردہ نشیں اور اسد، آئینۂ اظہار
شہرت چمنِ فتنہ و عنقا ارمی ہے

بسکہ سودائے خیالِ زلف وحشت ناک ہے
تا دلِ شب آبنوسی شانہ آسا چاک ہے

یاں خلاخن باز کس کا نالۂ بیباک ہے
جادۂ تا کہسار موئے چینیٔ افلاک ہے

ہے دو عالم نازِ یک صیدِ شہیدِ دل سوا
یاں خطِ پرکارِ ہستی حلقۂ فتراک ہے

خلوتِ بال و پرِ قمری میں وا کر راہِ شوق
جادۂ گلشن، بہ رنگِ ریشۂ زیرِ خاک ہے

عیش گرمِ اضطراب و اہلِ غفلت سرد مہر
دورِ ساغر یک گلستاں برگ ریزناک ہے

عرضِ وحشت پر ہے نازِ ناتوانی ہائے دل
شعلۂ بے پردہ چینِ دامنِ خاشاک ہے

ہے بکندِ موجِ گل، آشفتہ فتراکی اسد!
رنگ یاں بُو سے سوارِ توسنِ چالاک ہے

مژہ، پہلوئے چشم، اے جلوۂ ادراک باقی ہے
ہوا وہ شعلہ داغ اور شوخیِ خاشاک باقی ہے

چمن میں کچھ نہ چھوڑا تو نے غیر از بیضۂ قمری
عدم میں بہرِ فرقِ سرو مشتِ خاک باقی ہے

گدازِ سعیِ بینش شست و شو سے نقشِ خودکامی
سراپا شبنم آئینِ یک نگاہِ پاک باقی ہے

ہوا ترکِ لباسِ زعفرانی، دل کشا لیکن
ہنوز آفت نسب یک عقدہ یعنی چاک باقی ہے

چمن زارِ تمنا ہو گئی صرفِ خزاں لیکن
بہارِ نیم رنگِ آہِ حسرت ناک باقی ہے

نہ حیرت چشمِ ساقی کی، نہ صحبت دورِ ساغر کی
مری محفل میں غالب گردشِ افلاک باقی ہے

شکلِ طاؤس گرفتار بنایا ہے مجھے
ہوں وہ گُلدام کہ سبزے میں چھپایا ہے مجھے

پرِ طاؤس تماشا نظر آیا ہے مجھے
ایک دل تھا کہ بہ صد چشم دکھایا ہے مجھے

عکسِ خط، تا سخنِ ناصحِ دانا سرسبز
آئینہ بیضۂ طوطی نظر آیا ہے مجھے

سُنبلستانِ جنوں ہوں، ستمِ نسبتِ زلف
مُوکشاں خانۂ زنجیر میں لایا ہے مجھے

گرد باد آئینۂ محشرِ خاکِ مجنوں
یک بیاباں دلِ بیتاب اُٹھایا ہے مجھے

حیرتِ کاغذِ آتش زدہ ہے جلوۂ عمر
تہِ خاکسترِ صد آئینہ پایا ہے مجھے

لالہ و گُل بہم آئینۂ اخلاقِ بہار
ہوں میں وہ داغ کہ پھولوں میں بسایا ہے مجھے

دردِ اظہارِ تپش کسوتِ گُل معلوم
ہوں میں وہ چاک کہ کانٹوں میں سلایا ہے مجھے

بے دماغِ تپش و عرضِ دو عالم فریاد
ہوں میں وہ خاک کہ ماتم میں اُڑایا ہے مجھے

جامِ ہر ذرّہ ہے سرشارِ تمنّا مجھ سے
کس کا دل ہوں؟ کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

جوشِ فریاد سے لوں گا دیتِ خواب اسدؔ!
شوخیِ نغمۂ بیدلؔ نے جگایا ہے مجھے

جنوں رسوائیِ وارستگی زنجیر بہتر ہے
بقدرِ مصلحت دل تنگیِ تدبیر بہتر ہے

خوشا خود بینی و تدبیر و غفلت نقدِ اندیشہ
بدینِ عجز، اگر بدنامیِ تقدیر بہتر ہے

دلِ آگاہ تسکیں خیزِ بیدردی نہ ہو یا رب!
نفَس آئینہ دارِ آہِ بے تاثیر بہتر ہے

خدایا! چشم تا دل درد ہے افسونِ آگاہی
نگہ حیرت سوادِ خوابِ بے تعبیر بہتر ہے

درونِ جوہرِ آئینہ، جوں برگِ حنا خوں ہے
بتاں! نقشِ خود آرائی حیا تحریر بہتر ہے

تمنّائے اسدؔ، قتلِ رقیب اور شکر کا سجدہ
دعائے دل بہ محرابِ خمِ شمشیر بہتر ہے

دریوزۂ ساماں ہا، اے بے سروسامانی — ایجادِ گریباں ہا، در پردۂ عریانی

تمثالِ تماشا ہا، اقبالِ تمنا ہا — عجزِ عرقِ شرمے، اے آئینہ حیرانی

دعوائے جنوں باطل، تسلیمِ عبث حاصل — پروازِ فنا مشکل، میں عجزِ تن آسانی

بیگانگیٔ خو ہا، موجِ رمِ آہو ہا — دامِ گلۂ الفت، زنجیرِ پشیمانی

یک نازِ تپش رنگے، گلزار ہمہ تنگے — خوں ہو قفسِ دل میں اے ذوقِ پرافشانی

سنگ آمد و سخت آمد، دردِ سرِ خودداری — معذورِ سبکساری، مجبورِ گراں جانی

گلزارِ تمنا ہوں، گلچینِ تماشا ہوں
صد نالہ اسدؔ بلبل، در بندِ زباں دانی

گریہ سرشاریٔ شوقے بہ بیاباں زدہ ہے — قطرۂ خونِ جگر، چشمکِ طوفاں زدہ ہے

گریہ بے لذتِ کاوش نہ کرے جراتِ عشق — قطرۂ اشک، ولے جیبِ نمکداں زدہ ہے

بے تماشا نہیں جمعیتِ چشمِ بسمل — مژہ فالِ دو جہاں خوابِ پریشاں زدہ ہے

فرصتِ آئینہ و پیمانۂ عدم تا ہستی — یک شررِ بالِ دل و دیدۂ چراغاں زدہ ہے

درسِ نیرنگ ہے کس موجِ نگہ کا! یا رب! — غنچہ صد آئینۂ زانوئے گلستاں زدہ ہے

سازِ وحشت رقمیہا کہ بہ اظہارِ اسدؔ
دشت در رنگِ آئینۂ صفحۂ افشاں زدہ ہے

خوابِ غفلت بہ کمیں گاہِ نظر پنہاں ہے — شام سائے میں بہ تاراجِ سحر پنہاں ہے

دو جہاں گردشِ یک سُبحۂ اسرارِ نیاز — نقدِ صد دل بہ گریبانِ سحر پنہاں ہے

خلوتِ دل میں نہ کر دخل بجز سجدۂ شوق — آستاں میں صفتِ آئینہ در پنہاں ہے

فکرِ پروازِ جنوں ہے سببِ ضبط نہ پوچھ — اشک جوں بیضۂ مژگاں تہِ پر پنہاں ہے

ہوش! اے ہرزہ درا! تہمتِ بیدردی چند؟ نالہ، در گروِ تمنّائے اثر پنہاں ہے
وہمِ غفلت، گر احرامِ فسردن باندھے ورنہ ہر سنگ کے باطن میں شرر پنہاں ہے

وحشتِ دل ہے اسد! عالمِ نیرنگِ نشاط
خندۂ گل، بہ لبِ زخمِ جگر پنہاں ہے

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک ہے موجِ شراب، یک مژۂ خوابناک ہے
کلفت طلسمِ جلوۂ کیفیّتِ دگر زنگار خوردہ آئنہ یک برگِ تاک ہے
ہے عرضِ جوہرِ خط و خالِ ہزار عکس لیکن ہنوز دامنِ آئینہ پاک ہے
ہوں خلوتِ فسردگی انتظار میں وہ بے دماغ جس کو ہوس بھی تپاک ہے
جز زخمِ تیغِ ناز نہیں دل میں آرزو جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

جوشِ جنوں سے کچھ نظر آتا نہیں اسد
صحرا ہماری آنکھ میں اک مشتِ خاک ہے

نظر پرستی و بیکاری و خود آرائی رقیبِ آئنہ ہے حیرتِ تماشائی
بخود گزشتنِ دل کاروانِ حیرت ہے نگہ غبارِ ادب گاہِ جلوہ فرمائی
بہ چشمِ در شدہ مژگاں ہے جوہرِ رگِ خواب نہ پوچھ نازکیِ وحشتِ شکیبائی
خرابِ نالۂ بلبل، شہیدِ خندۂ گل ہنوز دعوئِ تمکین و بیمِ رسوائی
شکستِ سازِ خیال آشنائے کردۂ غم ہنوز ناطقہ پر افشانِ ذوقِ رعنائی
ہزار قافلۂ آرزو بیابانِ مرگ ہنوز محملِ حسرت بہ دوشِ خود رائی

وداعِ حوصلہ، توفیقِ شکوہ، عجزِ وفا
اسد! ہنوز گمانِ غرورِ دانائی

کوشش ہمہ بیتابِ تردّد شکنی ہے — صد جنبشِ دل یک مژہ برہم زدنی ہے
گو حوصلہ پامردِ تغافل نہیں، لیکن — خاموشیِ عاشق گلۂ کم سخنی ہے
دی لطفِ ہوا نے بہ جنوں طرفہ نزاکت — تا آبلہ دعوائے تنک پیرہنی ہے
رامش گرِ اربابِ فنا، نالۂ زنجیر — عیشِ ابد از خویش بروں تاختنی ہے
ازبسکہ ہے محو بہ چمن تکیہ زدن ہا — گل برگ پہ بالشِ سرو چمنی ہے
آئینہ و شانہ، ہمہ دست و ہمہ زانو — اے حسن! مگر حسرتِ پیماں شکنی ہے

فریاد اسدؔ بے نگہی ہائے بتاں سے
سچ کہتے ہیں واللہ کہ اللہ غنی ہے

کاشانۂ ہستی کہ بر انداختنی ہے — یاں سوختنی، چارہ گرِ ساختنی ہے
ہے شعلۂ شمشیرِ فنا حوصلہ افگار — اے داغِ تمنا! سپر انداختنی ہے
جز خاک بسر کردنِ بے فائدہ، حاصل؟ — ہر چند بہ میدانِ ہوس تاختنی ہے
اے بے ثمراں! حاصلِ تکلیفِ دمیدن — گردن بہ تماشائے گل افراختنی ہے

ہے سادگیِ ذہن تمنائے تماشا
جائے کہ اسدؔ رنگِ چمن باختنی ہے

گلستاں بے تکلف پیش پا افتادہ مضموں ہے — جو تو باندھے کفِ پا پر حنا، آئینہ موزوں ہے
بہارِ گل و دماغِ نشۂ ایجادِ مجنوں ہے — ہجومِ برق سے چرخ و زمیں یک قطرۂ خوں ہے
رجوعِ گریہ سوئے دل، خوشا سرمایۂ طوفاں — بر انگشتِ حبابِ اشک ناخن نعلِ واژوں ہے
عدم وحشت سراغ و ہستی آئیں بندِ رنگینی — دماغِ دو جہاں پر سنبل و گل یک شبیخوں ہے
تماشا ہے علاجِ بے دماغی ہائے دل، غافل — سویدا مردمِ چشمِ پری نظارہ افسوں ہے

فنا کرتی ہے زائل سرنوشتِ کلفتِ ہستی
سحر از بہرِ شستِ وشوئے داغِ ماہ، صابوں ہے
اسدؔ! ہے آج مژگانِ تماشا کی حنا بندی
چراغانِ نگاہ و شوخیِ اشکِ جگر گوں ہے

گدائے طاقتِ تقریر ہے زباں تجھ سے
کہ خامشی کو ہے پیرایۂ بیاں تجھ سے
فسردگی میں ہے فریادِ بے دلاں تجھ سے
چراغِ صبح و گلِ موسمِ خزاں تجھ سے
بہارِ حیرتِ نظّارہ، سخت جانی سے
حنائے پائے اجل خونِ کشتگاں تجھ سے
پری بہ شیشہ و عکسِ رُخ اندر آئینہ
نگاہِ حیرتِ مشاطہ خوں فشاں تجھ سے
طراوتِ سحر ایجادیِ اثر، یک سو
بہارِ نالہ و رنگینیِ فغاں تجھ سے
چمن چمن گلِ آئینہ در کنارِ ہوس
اُمیدِ محوِ تماشائے گلستاں تجھ سے
نیاز، پردۂ اظہارِ خود پرستی ہے
جبینِ سجدہ فشاں تجھ سے آستاں تجھ سے
بہانہ جوئیِ رحمت کمیں گرِ تقریب
وفائے حوصلہ و رنجِ امتحاں تجھ سے
اسدؔ! بہ موسمِ گل در طلسمِ کُنجِ قفس
خرام تجھ سے، صبا تجھ سے، گلستاں تجھ سے

حکمِ بیتابی نہیں اور آرمیدن منع ہے
باوجودِ مشقِ وحشت ہا، رمیدن منع ہے
شرمِ آئینہ تراشِ جبہۂ طوفان ہے
آب گردیدن روا، لیکن چکیدن منع ہے
بے خودی فرمانروائے حیرت آبادِ جنوں
زخم دوزی جرم و پیراہن دریدن منع ہے
مژدۂ دیدار سے رُسوائیِ اظہار دُور
آج کی شب چشمِ کوکب تک پریدن منع ہے
بیمِ طبعِ نازکِ خوباں سے وقتِ سیرِ باغ
ریشۂ زیرِ زمیں کو بھی دویدن منع ہے
یار معذورِ تغافل ہے عزیزاں! شفقتے!
نالۂ بلبل بہ گوشِ گُل شُنیدن منع ہے

مانعِ بادہ کشی ناداں ہے لیکن اے اسد!
بے ولائے ساقیِ کوثر کشیدن منع ہے

قتلِ عشاق نہ غفلت کشِ تدبیر آوے
یا رب! آئینہ بہ طاقِ خمِ شمشیر آوے
بالِ طاؤس ہے رعنائیِ ضعفِ پرواز
کون ہے داغ؟ کہ شعلے کا عناں گیر آوے
عرضِ حیرانیِ بیمارِ محبت معلوم
ہچکی آخر بہ کفِ آئینہ تصویر آوے
ذوقِ راحت اگر احرامِ تپش ہو جوں شمع
پائے خوابیدہ بہ دلجوئیِ شبگیر آوے
اُس بیاباں میں گرفتارِ جنوں ہوں کہ جہاں
موجۂ ریگ سے دل پائے بہ زنجیر آوے
وہ گرفتارِ خرابی ہوں کہ فوارہ نمط
سیلِ صیادِ کمیں خانۂ تعمیر آوے

سرِ معنی بہ گریبانِ شقِ خامہ اسد!
چاکِ دل شانہ کشِ طرۂ تحریر آوے

تا چند نفسِ غفلتِ ہستی سے بر آوے
قاصد تپشِ نالہ سے یارب! خبر آوے
ہے طاقِ فراموشیِ سودائے دو عالم
وہ سنگ کہ گلدستۂ جوشِ شرر آوے
درد آئنہ کیفیتِ صدرنگ ہے یارب!
خمیازۂ طرب ساغرِ زخمِ جگر آوے
جمعیتِ آوارگیِ دید نہ پوچھو
دل تا مژہ آغوشِ وداعِ نظر آوے
اے ہرزہ دویِ رہنِ تمکینِ جنوں کھینچ
تا آبلہ محمل کشِ موجِ گہر آوے
زاہد کو جنوں سبحۂ تحقیق ہے یارب!
زنجیریِ صد حلقۂ بیرونِ در آوے
وہ تشنۂ سرشارِ تمنا ہوں کہ جس کو
ہر ذرہ بہ کیفیتِ ساغر نظر آوے
تمثالِ بتاں گر نہ رکھے پنبۂ مرہم
آئینہ بہ عریانیِ داغِ جگر آوے
ہر غنچہ اسد! بارگہِ شوکتِ گل ہے
دل فرشِ رہِ ناز ہے بیدل اگر آوے

چار سوئے عشق میں صاحب دکانی مفت ہے
نقد ہے داغِ دل اور آتش زبانی مفت ہے

زخمِ دل پر باندھیے حلوائے مغزِ استخواں
تندرستی فائدہ اور ناتوانی مفت ہے

نقدِ انجم تا بہ کے از کیسہ بیروں ریختن
یعنی اے پیرِ فلک اِشامِ جوانی مفت ہے

گر نہیں پاتا درونِ خانہ ہر بیگانہ جا
بر درِ نکشودۂ دل پاسبانی مفت ہے

چونکہ بالائے ہوس پر ہر قبا کوتاہ ہے
بر ہوس ہائے جہاں دامن فشانی مفت ہے

یک نفس ہر یک نفس جاتا ہے قسطِ عمر میں
حیف ہے اُن کو جو کھوئیں زندگانی مفت ہے

مال و جاہ و دست و پائے زر خریدہ ہیں اسدؔ
پس بہ دلہائے دگر راحت رسانی مفت ہے

بیتابیِ یادِ دوست ہمرنگِ تسلی ہے
موجِ تپشِ مجنوں محمل کشِ لیلیٰ ہے

کلفت کشیِ ہستی بدنامِ دو رنگی ہے
یاں تیرگیِ اختر خالِ رخِ زنگی ہے

دیدن ہمہ بالیدن، گردن ہمہ افسردن
خوشتر ز گل و غنچہ چشم و دلِ ساقی ہے

وہمِ طربِ ہستی، ایجادِ سیہ مستی
تسکین دہِ صد محفل یک ساغرِ خالی ہے

زندانِ تحمل میں، مہمانِ تغافل ہیں
بے فائدہ یاروں کو فرقِ غم و شادی ہے

ہوئے نہ غبارِ دل تسلیمِ زمیں گیری
مغرور نہ ہو ناداں ہا سر تا سرِ گیتی ہے

رکھ فکرِ سخن میں تو معذور مجھے غالبؔ
یاں زورقِ خودداری طوفانیِ معنی ہے

اگر گل حسن و الفت کی بہم جوشیدنی جانے
پرِ بلبل کے افسردن کو دامن چیدنی جانے

فسونِ حسن سے ہے شوخیِ گلگونہ آرائی
بہار اس کی کفِ مشاطہ میں بالیدنی جانے

نوائے بلبل و گل پاسبانِ بے دماغی ہے
بہ یک مژگانِ خوباں صد چمن خوابیدنی جانے

وہ ہے شب زندہ دارِ انتظارستاں کہ وحشت ہے
مژہ در پیچکِ مہ سوزن آسا چیدنی جانے

خوشا شوقے کہ جوشِ حیرتِ اندازِ قاتل سے
نگہ شمشیر میں جوں جوہر آرامیدنی جانے

جفا شوخ و ہوس گستاخ مطلب ہے مگر عاشق
نفس در قالبِ خشتِ لحد دزدیدنی جانے

نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے
تماشائے کہ رنگِ رفتہ برگردیدنی جانے

اسدؔ جاں نذرِ الطافے کہ ہنگامِ ہم آغوشی
زبانِ ہر سرِ مو حالِ دل پرسیدنی جانے

سوختگاں کی خاک میں ریزشِ نقشِ داغ ہے
آئنہ نشانِ حالِ شعلِ گل چراغ ہے

لطفِ خمارِ مے کو ہے در دلِ ہم دگر اثر
پنبۂ شیشۂ شراب کف بہ لبِ ایاغ ہے

عزتِ صفائے طبع ہے جلوۂ نازِ سوختن
داغِ دلِ سیہ دلاں مردمِ چشمِ زاغ ہے

رنجشِ یارِ مہرباں عیش و طرب کا ہے نشاں
دل سے اٹھے ہے جو غبار گردِ سوادِ باغ ہے

شعر کی فکر کو اسدؔ چاہیے ہے دل و دماغ
عذر کہ یہ فسردہ دل بے دل و بے دماغ ہے

---

(۳)

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیے
بھوں پاس آنکھ قبلۂ حاجات چاہیے

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر
آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہیے

؎ یہاں سے ردیف ی کی مطبوعہ غزلیں شروع ہوئی ہیں جن کا ہم طرح کوئی شعر قلمی نسخے میں نہیں ہے۔

مے سے غرض نشاط ہے کس رُو سیاہ کو؟
اِک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گُل و نسریں جُدا جُدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

سر پائے خُم پہ چاہیے ہنگامِ بیخودی
رُو سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

یعنی بہ حسبِ گردشِ پیمانۂ صفات
عارف ہمیشہ مستِ مئے ذات چاہیے

نشو و نما ہے اصل سے غالبؔ فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

تاہم کو شکایت کی بھی باقی نہ رہے جا
سُن لیتے ہیں گو ذکر ہمارا نہیں کرتے

غالبؔ ترا احوال سُنا دیں گے ہم اُن کو
وہ سُن کے بُلا لیں یہ اجارا نہیں کرتے

گھر میں تھا کیا؟ کہ ترا غم اُسے غارت کرتا
وہ جو رکھتے تھے ہم اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

پینس میں گزرتے ہیں جو کُوچے سے وہ میرے
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

عشق مجھ کو نہیں، وحشت ہی سہی
میری وحشت، تری شہرت ہی سہی

قطع کیجے نہ تعلّق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

میرے ہونے میں ہے کیا رُسوائی؟
اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

ہم بھی دشمن تو نہیں ہیں اپنے
غیر کو تجھ سے محبت ہی سہی

اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو
آگہی گر نہیں، غفلت ہی سہی

عمر، ہرچند کہ ہے برق خرام
دل کے خوں کرنے کی فرصت ہی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ہیں؟ — نہ سہی عشق، مصیبت ہی سہی
کچھ تو دے اے فلکِ ناانصاف! — آہ و فریاد کی رخصت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے — بے نیازی تری عادت ہی سہی
یار سے چھیڑ چلی جائے اسدؔ
گر نہیں وصل، تو حسرت ہی سہی

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالبؔ
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

اُس بزم میں مجھے نہیں بنتی حیا کیے — بیٹھا رہا اگرچہ اشارے ہوا کیے
دل ہی تو ہے سیاستِ درباں سے ڈر گیا — میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کیے
رکھتا پھروں ہوں خرقہ و سجادہ رہنِ مے — مدت ہوئی ہے دعوتِ آب و ہوا کیے
بے صرفہ ہی گزرتی ہے ہو گرچہ عمرِ خضر — حضرت بھی کل کہیں گے کہ "ہم کیا کیا کیے"
مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ "او لئیم — تُو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کیے؟"
کس روز تہمتیں نہ تراشا کیے عدو؟ — کس دن ہمارے سر پہ نہ آرے چلا کیے
صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو — دینے لگا ہے بوسے بغیر التجا کیے
ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں — بھولے سے اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کیے
غالبؔ تمھیں کہو، کہ ملے گا جواب کیا
مانا کہ تم کہا کیے اور وہ سنا کیے

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے — میں اُسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

ہاتھ دھو دل سے یہی گرمی گر اندیشے میں ہے   آبگینہ تندیِ صہبا سے پگھلا جائے ہے

غیر کو یا رب وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے   گر حیا بھی اُس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہردم نالہ کھینچے جائیے   دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے

دُور چشمِ بد، تری بزمِ طرب سے واہ واہ   نغمہ ہو جاتا ہے واں، گر نالہ میرا جائے ہے

گرچہ ہے طرزِ تغافل، پردہ دارِ رازِ عشق   پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

اُس کی بزم آرائیاں سُن کر دلِ رنجور، یاں   مثلِ نقشِ مدعائے غیر بیٹھا جائے ہے

ہو کے عاشق وہ پری رخ اور نازک بن گیا   رنگ کھلتا جائے ہے جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اُس کے مصوّر پر بھی کیا کیا ناز ہیں   کھینچتا ہے جس قدر اتنا ہی کھنچتا جائے ہے

سایہ میرا مجھ سے مثلِ دُود بھاگے ہے اسدؔ
پاس مجھ آتش بجاں کے کس سے ٹھہرا جائے ہے

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے   تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم   لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

کثرت آرائیِ وحدت ہے پرستاریِ وہم   کر دیا کافر اِن اصنامِ خیالی نے مجھے

ہوسِ گُل کا تصور میں بھی کھٹکا نہ رہا
عجب آرام دیا بے پر و بالی نے مجھے

اُگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالبؔ
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

سادگی پر اُس کی مر جانے کی حسرت دل میں ہے   بس نہیں چلتا، کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا — میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

گرچہ ہے کِس کِس بُرائی سے ولے با ایں ہمہ — ذِکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

بس ہجومِ نا اُمیدی! خاک میں مِل جائے گی — یہ جو اِک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

رنجِ رہ کیوں کھینچیے؟ واماندگی کو عشق ہے — اُٹھ نہیں سکتا ہمارا جو قدم منزل میں ہے

جلوہ زارِ آتشِ دوزخ ہمارا دل سہی — فتنۂ شورِ قیامت کس کی آب و گِل میں ہے

ہے دلِ شوریدۂ غالبؔ طلسمِ پیچ و تاب
رحم کر اپنی تمنّا پر، کہ کِس مشکل میں ہے

دل آپ کا، کہ دل میں ہے جو کچھ سب آپ کا؟
دل لیجیے، مگر مرے ارماں نکال کے

دل سے تری نگاہ جگر تک اُتر گئی — دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ، خوشا لذّتِ فراغ! — تکلیفِ پردہ داریِ زخمِ جگر گئی

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں؟ — اُٹھیے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مِری کوئے یار میں — بارے اب اے ہوا! ہوسِ بال و پر گئی

دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گُل کتر گئی

ہر بوالہوس نے حُسن پرستی شعار کی — اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر گئی

نظّارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یک بار مٹ گیا — کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

مارا زمانے نے اسد اللہ خاں تمھیں
وہ ولولے کہاں، وہ جوانی کدھر گئی؟

تسکیں کو ہم نہ روئیں جو ذوقِ نظر ملے — حورانِ خلد میں تری صورت مگر ملے

اپنی گلی میں مجھ کو نہ کر دفن، بعدِ قتل — میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے

ساقی گری کی شرم کرو آج، ورنہ ہم — ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے جس قدر ملے

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم — میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

تم کو بھی ہم دکھائیں کہ مجنوں نے کیا کیا — فرصت کشاکشِ غمِ پنہاں سے گر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں — جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

اے ساکنانِ کوچۂ دلدار دیکھنا!
تم کو کہیں جو غالبِ آشفتہ سر ملے

کوئی دن گر زندگانی اور ہے — اپنے جی میں ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں؟ — سوزِ غم ہائے نہانی اور ہے

بارہا دیکھی ہیں اُن کی رنجشیں، — پر کچھ اب کے سرگرانی اور ہے

دے کے خط، مُنہ دیکھتا ہے نامہ بر — کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے

قاطعِ اعمار ہیں، اکثر نجوم — وہ بلائے آسمانی اور ہے

ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

کوئی اُمید بر نہیں آتی — کوئی صورت نظر نہیں آتی

موت کا ایک دن معین ہے — نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

آگے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی — اب کسی بات پر نہیں آتی

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد — پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟

کیوں نہ چیخوں؟ کہ یاد کرتے ہیں
میری آواز گر نہیں آتی

داغِ دل گر نظر نہیں آتا
بُو بھی اے چارہ گر نہیں آتی؟

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ
شرم تم کو مگر نہیں آتی

دلِ ناداں! تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی! یہ ماجرا کیا ہے؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ "مدعا کیا ہے؟"

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں؟
ابر کیا چیز ہے؟ ہوا کیا ہے؟

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے؟

"ہاں بھلا کر، ترا بھلا ہوگا"
اور درویش کی صدا کیا ہے؟

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالبؔ
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے؟

کہتے تو ہو تم سب کہ بتِ غالیہ مو آئے
اک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ "وہ آئے"

ہوں کشمکشِ نزع میں، ہاں جذبِ محبت!
کچھ کہہ نہ سکوں، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں، گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اسے جس بھیس میں جو آئے

ہاں اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا نہیں وہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اس سے، مگر مجھ کو ڈبو آئے

اس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے غالب
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

پھر کچھ اک دل کو بے قراری ہے
سینہ جویائے زخمِ کاری ہے

پھر جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

قبلۂ مقصدِ نگاہِ نیاز
پھر وہی پردۂ عماری ہے

چشم دلالِ جنسِ رسوائی
دل خریدارِ ذوقِ خواری ہے

وہی صد رنگ نالہ فرسائی
وہی صد گونہ اشکباری ہے

دل ہوائے خرامِ ناز سے پھر
محشرستانِ بے قراری ہے

جلوہ پھر عرضِ ناز کرتا ہے
روزِ بازارِ جاں سپاری ہے

پھر اسی بے وفا پہ مرتے ہیں
پھر وہی زندگی ہماری ہے

پھر کھلا ہے درِ عدالتِ ناز
ق گرم بازارِ فوجداری ہے

ہو رہا ہے جہان میں اندھیر
زلف کی پھر سرشتہ داری ہے

پھر دیا پارۂ جگر نے سوال
ایک فریاد و آہ و زاری ہے

پھر ہوئے ہیں گواہِ عشق طلب
اشکباری کا حکم جاری ہے

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا
آج پھر اُس کی روبکاری ہے

بے خودی بے سبب نہیں غالبؔ
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

بے اعتدالیوں سے سُبک سب میں ہم ہُوئے
جتنے زیادہ ہو گئے اُتنے ہی کم ہُوئے

پنہاں تھا دامِ سخت قریب آشیان کے
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہُوئے

ہستی ہماری اپنی فنا پر دلیل ہے
یاں تک مٹے کہ آپ ہی اپنی قسم ہُوئے

سختی کشانِ عشق کی پُوچھے ہے کیا خبر؟
وہ لوگ رفتہ رفتہ سراپا اَلم ہُوئے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہُوئے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اِس میں ہاتھ ہمارے قلم ہُوئے

اللہ رے تیری تندیِ خُو، جس کے بیم سے
اجزائے نالہ، دل میں مرے رزقِ ہم ہُوئے

اہلِ ہوس کی فتح ہے ترکِ نبردِ عشق
جو پاؤں اُٹھ گئے وہی اُن کے عَلَم ہُوئے

نالے عدم میں چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھنچ سکے سو وہ یاں آ کے دم ہُوئے

چھوڑی اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
سائل ہُوئے تو عاشقِ اہلِ کرم ہُوئے

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے
اِک شمع ہے دلیلِ سحر، سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال، نہ نظّارۂ جمال
مدّت ہُوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے

مَے نے کیا ہے حُسنِ خود آرا کو بے حجاب
اے شوق، یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

دیدار بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست
بزمِ خیال، مے کدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار اگر تمھیں ہوسِ نائے و نوش ہے ق

دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ، رہزنِ تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گل فروش ہے

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ، وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھیے آکر، تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز، نہ جوش و خروش ہے

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے، سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ، صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

عجب نشاط سے جلّاد کے چلے ہیں ہم آگے
کہ اپنے سایے سے سر پاؤں سے ہے دو قدم آگے

قضا نے تھا مجھے چاہا خرابِ بادۂ الفت
فقط "خراب" لکھا، بس نہ چل سکا قلم آگے

غمِ زمانہ نے جھاڑی نشاطِ عشق کی مستی
وگرنہ ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

خدا کے واسطے داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اس کے در پہ پہنچتے ہیں نامہ بر سے ہم آگے

یہ عمر بھر جو پریشانیاں اٹھائی ہیں ہم نے
تمھارے آئیو، اے طرّہ ہائے خم بہ خم آگے

دل و جگر میں پرافشاں جو ایک موجۂ خوں ہے
ہم اپنے زعم میں سمجھے ہوئے تھے اس کو دم آگے

قسم جنازے پہ آنے کی میرے کھاتے ہیں غالبؔ
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم آگے

شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہہ، کہ جو کہیے تو گلا ہوتا ہے

پُر ہوں میں شکوے سے یوں، راگ سے جیسے باجا
اِک ذرا چھیڑیے، پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

گو سمجھتا نہیں، پر حسنِ تلافی دیکھو
شکوۂ جور سے سرگرمِ جفا ہوتا ہے

عشق کی راہ میں ہے چرخِ مکوکب کی وہ چال
سست رو جیسے کوئی آبلہ پا ہوتا ہے

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوکِ بیداد، کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں گر تیر خطا ہوتا ہے

خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا، اور اب
لب تک آتا ہے جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

ق

خامہ میرا، کہ وہ ہے باربدِ بزمِ سخن
شاہ کی مدح میں یوں نغمہ سرا ہوتا ہے

اے شہنشاہِ کواکب سپہ و مہرِ علم
تیرے اکرام کا حق کس سے ادا ہوتا ہے

سات اقلیم کا حاصل جو فراہم کیجے
تو وہ لشکر کا ترے نعلِ بہا ہوتا ہے

ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال
آستاں پر ترے، مہ ناصیہ سا ہوتا ہے

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں
یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ "تو کیا ہے"
تمھیں کہو، کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلے میں یہ کرشمہ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تند خو کیا ہے

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بدآموزیِ عدو کیا ہے

چپک رہا ہے بدن پہ لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

جلا ہے جسم جہاں، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا، تو پھر لہو کیا ہے

وہ چیز جس کے لیے ہم کو ہو بہشت عزیز — سوائے بادۂ گلفامِ مشکبو کیا ہے
پیوں شراب اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار — یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے
رہی نہ طاقتِ گفتار، اور اگر ہو بھی — تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

میں انھیں چھیڑوں، اور وہ کچھ نہ کہیں — چل نکلتے جو مے پیے ہوتے
قہر ہو یا بلا ہو، جو کچھ ہو — کاشکے تم مرے لیے ہوتے
میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یا رب کئی دیے ہوتے

آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیے ہوتے

جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے — جاں کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے
سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو و صنوبر — تو اس قدِ دلکش سے جو گلزار میں آوے
تب نازِ گراں مایگیِ اشک بجا ہے — جب لختِ جگر دیدۂ خونبار میں آوے
دے مجھ کو شکایت کی اجازت کہ ستمگر — کچھ تجھ کو مزہ بھی مرے آزار میں آوے
اس چشمِ فسوں گر کا اگر پائے اشارہ — طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے
کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یا رب! — اک آبلہ پا وادیِ پرخار میں آوے
مر جاؤں نہ کیوں رشک سے جب وہ تنِ نازک — آغوشِ خمِ حلقۂ زنّار میں آوے
غارت گرِ ناموس نہ ہو گر ہوسِ زر — کیوں شاہدِ گل باغ سے بازار میں آوے
تب چاکِ گریباں کا مزہ ہے دلِ ناداں — جب اک نفس الجھا ہوا ہر تار میں آوے

آتش کدہ ہے سینہ مرا، رازِ نہاں سے
اے وائے اگر معرضِ اظہار میں آوے

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

حُسنِ مہ گرچہ بہ ہنگامِ کمال اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خورشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ
جی میں کہتے ہیں کہ مفت آئے تو مال اچھا ہے

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

دیکھئے، پاتے ہیں عشاق بُتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا
جس طرح کا کہ کسی میں ہو کمال اچھا ہے

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے
کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

خضرِ سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت، لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالبؔ یہ خیال اچھا ہے

غیر لیں محفل میں بوسے جام کے
ہم رہیں یوں تشنہ لب پیغام کے

خستگی کا تم سے کیا شکوہ، کہ یہ
ہتھکنڈے ہیں چرخِ نیلی فام کے

خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے

رات پی زمزم پہ مے اور صبح دم
دھوئے دھبے جامۂ احرام کے

دل کو آنکھوں نے پھنسایا کیا، مگر
یہ بھی حلقے ہیں تمہارے دام کے؟

شاہ کے ہے غسلِ صحت کی خبر
دیکھئے کب دن پھریں حمام کے

عشق نے غالبؔ نکمّا کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک
اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر
رُوکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گُل کے دیکھنے کے لئے
چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے باد پیمائی

کیوں نہ دُنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی

کب وہ سُنتا ہے کہانی میری
اور پھر وہ بھی زبانی میری

خلشِ غمزۂ خوں ریز نہ پُوچھ
دیکھ خوں نابہ فشانی میری

کیا بیاں کر کے مرا روئیں گے یار
مگر آشفتہ بیانی میری

ہوں زخود رفتۂ بیدائے خیال
بھول جانا ہے نشانی میری

متقابل ہے مقابل میرا
رُک گیا دیکھ روانی میری

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں
سخت ارزاں ہے گرانی میری

گرد بادِ رہِ بیتابی ہوں
صرصرِ شوق ہے بانی میری

دہن اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کھُل گئی ہیچمدانی میری

کر دیا ضعف نے عاجز غالبؔ
ننگِ پیری ہے جوانی میری

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیر رفو کی
لکھ دیجیو یا رب اُسے قسمت میں عدو کی

اچھا ہے سر انگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے اک بُوند لہو کی

کیوں ڈرتے ہو عشاق کی بے حوصلگی سے
یاں تو کوئی سنتا نہیں فریاد کسو کی

دشنے نے کبھی مُنہ نہ لگایا ہو جگر کو
خنجر نے کبھی بات نہ پُوچھی ہو گلو کی

صد حیف وہ ناکام کہ اک عمر سے غالبؔ
حسرت میں رہے ایک بتِ عربدہ جو کی

چاہیے اچھوں کو جتنا چاہیے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیے

صحبتِ رنداں سے واجب ہے حذر
جائے مے اپنے کو کھینچا چاہیے

چاہنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل
بارے اب اس سے بھی سمجھا چاہیے

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل
کچھ اُدھر کا بھی اشارا چاہیے

دوستی کا پردہ ہے بیگانگی
مُنہ چُھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

دُشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیے

اپنی رسوائی میں کیا چلتی ہے سعی
یار ہی ہنگامہ آرا چاہیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیے

غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیے

چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسدؔ
آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے

نکتہ چیں ہے، غمِ دل اس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے

میں بلاتا تو ہوں اس کو، مگر اے جذبۂ دل!
اس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے، کہیں چھوڑ نہ دے، بھول نہ جائے
کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے لیے یوں ترے خط کو کہ، اگر
کوئی پوچھے کہ "یہ کیا ہے؟" تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا بُرا ہو، وہ بھلے ہیں تو کیا؟
ہاتھ آئیں تو انھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون؟ کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

موت کی راہ نہ دیکھوں؟ کہ بن آئے نہ رہے
تم کو چاہوں؟ کہ نہ آؤ تو بلائے نہ بنے

بوجھ وہ سر سے گرا ہے کہ اٹھائے نہ اٹھے
کام وہ آن پڑا ہے کہ بنائے نہ بنے

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے

وہ آ کے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے
ولے مجھے تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا
تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے

دکھا کے جنبشِ لب ہی تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ، تو منہ سے کہیں جواب تو دے

پلا دے اوک سے ساقی، جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا، نہ دے، شراب تو دے

اسدؔ! خوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہا جو اس نے "ذرا میرے پاؤں داب تو دے"

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے
نالہ پابندِ نَے نہیں ہے

کیوں بوتے ہیں باغبان تونبے؟
گر باغ گدائے مے نہیں ہے

ہر چند ہر ایک شے میں تُو ہے
پر تجھ سی تو کوئی شے نہیں ہے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

شادی سے گزر کہ، غم نہ ہووے
اُردی جو نہ ہو تو دے نہیں ہے

کیوں ردِ قدح کرے ہے زاہد
مے ہے یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحتِ دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے
مرتے ہیں، ولے، اُن کی تمنا نہیں کرتے

در پردہ انھیں غیر سے ہے ربطِ نہانی
ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ پردا نہیں کرتے

یہ باعثِ نومیدیٔ اربابِ ہوس ہے
غالب کو بُرا کہتے ہو، اچھا نہیں کرتے

کرے ہے بادہ ترے لب سے کسبِ رنگِ فروغ
خطِ پیالہ سراسر نگاہِ گُل چیں ہے

کبھی تو اِس دلِ شوریدہ کی بھی داد ملے
کہ ایک عمر سے حسرت پرستِ بالیں ہے

بجا ہے، گر نہ سنے نالہائے بلبلِ زار
کہ گوشِ گُل، نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

اسد ہے نزع میں، چل بے وفا برائے خدا
مقامِ ترکِ حجاب و وداعِ تمکیں ہے

دیا ہے دل اگر اس کو، بشر ہے کیا کہیے
ہوا رقیب تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بِن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

رہے ہے یوں گہ و بے گہ کہ کوئے دوست کو اب
اگر نہ کہیے کہ دشمن کا گھر ہے، کیا کہیے

زہے کرشمہ کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے ہی انھیں سب خبر ہے کیا کہیے

سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ سرِ رہگزر ہے، کیا کہیے

تمھیں نہیں ہے سرِ رشتۂ وفا کا خیال
ہمارے ہاتھ میں کچھ ہے، مگر ہے کیا؟ کہیے!

انھیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیے
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجے
ستم، بہائے متاعِ ہنر ہے، کیا کہیے

کہا ہے کس نے کہ غالب بُرا نہیں، لیکن
سوائے اس کے کہ آشفتہ سر ہے، کیا کہیے

حضورِ شاہ میں اہلِ سخن کی آزمائش ہے
چمن میں خوش نوایانِ چمن کی آزمائش ہے

قد و گیسو میں، قیس و کوہکن کی آزمائش ہے
جہاں ہم ہیں، وہاں دار و رسن کی آزمائش ہے

کریں گے کوہکن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز اس خستہ کے نیروئے تن کی آزمائش ہے

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسف کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

* رہے دل ہی میں تیر، اچھا، جگر کے پار ہو، بہتر
غرض شستِ بتِ ناوک فگن کی آزمائش ہے

نہیں کچھ سبحہ و زنار کے پھندے میں گیرائی
وفاداری میں شیخ و برہمن کی آزمائش ہے

پڑا رہ، اے دلِ وابستہ، بیتابی سے کیا حاصل؟
مگر پھر تابِ زلفِ پرشکن کی آزمائش ہے

رگ و پے میں جب اترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو!
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمائش ہے

وہ آئیں گے مرے گھر، وعدہ کیسا، دیکھنا، غالب
نئے فتنوں میں اب چرخِ کہن کی آزمائش ہے

* وہ آیا بزم میں، دیکھو، نہ کہیو پھر کہ غافل تھے
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمائش ہے

کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے مجھ سے — جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا جذبۂ دل کی، مگر تاثیر اُلٹی ہے — کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے

وہ بدخُو، اور میری داستانِ عشق طولانی — عبارت مختصر، قاصد بھی گھبرا جائے ہے مجھ سے

اُدھر وہ بدگمانی ہے، اِدھر یہ ناتوانی ہے — نہ پُوچھا جائے ہے اُس سے، نہ بولا جائے ہے مجھ سے

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی، کیا قیامت ہے — کہ دامانِ خیالِ یار چھُوٹا جائے ہے مُجھ سے

تکلف برطرف نظارگی میں بھی سہی، لیکن — وہ دیکھا جائے، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مُجھ سے

ہوئے ہیں پاؤں ہی پہلے نبردِ عشق میں زخمی — نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے، نہ ٹھہرا جائے ہے مُجھ سے

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالبؔ
وہ کافر جو خُدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مُجھ سے

لاغر اتنا ہوں کہ گر تُو بزم میں جا دے مجھے — میرا ذمہ، دیکھ کر گر کوئی بتلا دے مجھے

کیا تعجب ہے کہ اُس کو دیکھ کر آجائے رحم — واں تلک کوئی کسی حیلے سے پہنچا دے مجھے

مُنہ نہ دکھلاوے، نہ دِکھلا، پر بہ اندازِ عتاب — کھول کر پردہ ذرا آنکھیں ہی دکھلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زُلف گر بن جاؤں تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے — ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

اِک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک — اِک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

جُز نام نہیں صُورتِ عالم مجھے منظور — جُز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا مرے ہوتے — گھِستا ہے جبیں خاک پہ دریا مرے آگے

سچ کہتے ہو خودبین و خودآرا ہوں، نہ کیوں ہوں — بیٹھا ہے بتِ آئنہ سیما مرے آگے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار / رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

نفرت کا گماں گزرے ہے، میں رشک سے گزرا / کیونکر کہوں "لو نام نہ ان کا مرے آگے"

ایماں مجھے روکے ہے، جو کھینچے ہے مجھے کفر / کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام / مجنوں کو بُرا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یُوں مر نہیں جاتے / آئی شبِ ہجراں کی تمنا مرے آگے

ہے موجزن اک قلزمِ خوں، کاش یہی ہو / آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے / رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا
غالبؔ کو بُرا کیوں کہو، اچھا مرے آگے

کہوں جو حال تو کہتے ہو "مدعا کہیے" / تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ "ہم ستمگر ہیں" / مجھے تو خُو ہے کہ جو کچھ کہو "بجا" کہیے

وہ نیشتر سہی، پر دل میں جب اُتر جاوے / نگاہِ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کہیے

نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں / وہ زخمِ تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مدعی بنے اُس کے نہ مدعی بنیے / جو ناسزا کہے اُس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں حقیقتِ جاں کاہیِ مرض لکھیے / کہیں مصیبتِ ناسازیِ دوا کہیے

کبھی شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے / کہیں حکایتِ صبرِ گریز پا کہیے

رہے نہ جان، تو قاتل کو خوں بہا دیجے / کٹے زبان، تو خنجر کو مرحبا کہیے

نہیں نگار کو الفت، نہ ہو، نگار تو ہے / روانیِ روش و مستیِ ادا کہیے

نہیں بہار کو فرصت، نہ ہو، بہار تو ہے / طراوتِ چمن و خوبیِ ہوا کہیے

سفینہ جبکہ کنارے پہ آ لگا غالبؔ / خدا سے کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے

رونے سے اور عشق میں بے باک ہو گئے — دھوئے گئے ہم اتنے کہ بس پاک ہو گئے

صرفِ بہائے مے ہوئے آلاتِ میکشی — تھے یہ ہی دو حساب سو یوں پاک ہو گئے

رسوائے دہر گو ہوئے آوارگی سے تم — بارے طبیعتوں کے تو چالاک ہو گئے

کہتا ہے کون نالۂ بلبل کو بے اثر — پردے میں گل کے لاکھ جگر چاک ہو گئے

پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

کرنے گئے تھے اس سے تغافل کا ہم گلہ — کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے

اس رنگ سے اٹھائی کل اس نے اسدؔ کی نعش
دشمن بھی جس کو دیکھ کے غمناک ہو گئے

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی — ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

چال، جیسے کڑی کمان کا تیر — دل میں ایسے کے جا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے — وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو، گر برا کہے کوئی — نہ کہو، گر برا کرے کوئی

روک لو، گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجت مند — کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

بہت سہی غمِ گیتی، شراب کم کیا ہے
غلامِ ساقیِ کوثر ہوں، مجھ کو غم کیا ہے

تمہاری طرز و روش جانتے ہیں ہم، کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

کٹے تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلاوے
کوئی بتاؤ کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے

لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود
کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے

نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا
خدا کے واسطے ایسے کی پھر قسم کیا ہے

وہ داد و دید گراں مایہ شرط ہے ہمدم!
وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقین ہے ہم کو بھی لیکن اب اس میں دم کیا ہے

رونق ہوئی ہے کوکبۂ شہریار کی
اترائے کیوں نہ خاک سرِ رہ گزار کی

جب اس کے دیکھنے کے لئے آئیں بادشاہ
لوگوں میں کیوں نمود نہ ہو لالہ زار کی

بھوکے نہیں ہیں سیرِ گلستاں کے ہم ولے
کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے

ڈرے کیوں میرا قاتل کیا رہے گا اس کی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے عمر بھر یوں دم بدم نکلے

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں، لیکن
بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

۱؎ مطبوعہ دیوانوں میں اس غزل کے صرف تین شعر ہیں لیکن اردوئے معلیٰ صفحہ ۹۱ پر بقیہ اشعار موجود ہیں جو مرزا علاءالدین علائی کی غزل پر کہے گئے تھے۔

مگر لکھوائے کوئی اس کو خط تو ہم سے لکھوائے
ہوئی صبح، اور گھر سے کان پر رکھ کر قلم نکلے

ہوئی اِس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو، جہاں میں جامِ جم نکلے

ہوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ہم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کہاں میخانہ کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ
پر اِتنا جانتے ہیں، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

ہوں میں بھی تماشائیِ نیرنگِ تمنّا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ہی بر آوے

منظور تھی یہ شکل تجلّی کو نُور کی
قسمت کھُلی ترے قد و رُخ سے ظہور کی

اک خونچکاں کفن میں کروڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حُور کی

واعظ نہ تم پیو، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے، تمھاری شرابِ طہُور کی

لڑتا ہے مجھ سے حشر میں قاتل کہ کیوں اٹھا
گویا ابھی سُنی نہیں آوازِ صور کی

آمد بہار کی ہے جو بلبل ہے نغمہ سنج
اُڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیُور کی

گو واں نہیں، پہ واں کے نکالے ہوئے تو ہیں
کعبے سے اِن بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سَیر کریں کوہِ طُور کی

گرمی سہی کلام میں، لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات، اُس نے شکایت ضرور کی

غالب! گر اِس سفر میں مُجھے ساتھ لے چلیں
حج کا ثواب نذر کروں گا حضُور کی

غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے
یہ رنج کہ کم ہے مئے گلفام، بہت ہے

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

نے تیر کماں میں ہے، نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

کیا زُہد کو مانوں کہ نہ ہو گرچہ ریائی
پاداشِ عمل کی طمعِ خام بہت ہے

ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں
پابستگیِ رسم و رہِ عام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو مجھے، کیا طوفِ حرم سے
آلودہ بہ مے جامۂ احرام بہت ہے

ہے قہر، گر اب بھی نہ بنے بات کہ اُن کو
انکار نہیں، اور مجھے ابرام بہت ہے

خوں ہو کے جگر آنکھ سے ٹپکا نہیں اے مرگ!
رہنے دے مجھے یاں کہ ابھی کام بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالبؔ کو نہ جانے
شاعر تو وہ اچھا ہے پہ بدنام بہت ہے

مُدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کرتا ہُوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

پھر وضعِ احتیاط سے رُکنے لگا ہے دم
برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کیے ہوئے

پھر گرمِ نالہ ہائے شرربار ہے نفس
مدّت ہوئی ہے سیرِ چراغاں کیے ہوئے

پھر پرسشِ جراحتِ دل کو چلا ہے عشق
سامانِ صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

پھر بھر رہا ہوں خامۂ مژگاں بخونِ دل
سازِ چمن طرازیِ داماں کیے ہوئے

باہم دگر ہوئے ہیں دل و دیدہ پھر رقیب
نظارہ و خیال کا ساماں کیے ہوئے

دل پھر طوافِ کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

پھر شوق کر رہا ہے خریدار کی طلب
عرضِ متاعِ عقل و دل و جاں کیے ہوئے

دوڑے ہے پھر ہر ایک گُل و لالہ پر خیال
صد گُلستاں نگاہ کا ساماں کیے ہوئے

پھر چاہتا ہوں نامۂ دلدار کھولنا — جاں نذرِ دل فریبیِ عنواں کیے ہوئے

مانگے ہے پھر کسی کو لبِ بام پر ہوس — زُلفِ سیاہ رُخ پہ پریشاں کیے ہوئے

چاہے ہے پھر کسی کو مقابل میں آرزو — سُرمے سے تیز دشنۂ مژگاں کیے ہوئے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ — چہرہ، فروغِ مے سے گلستاں کیے ہوئے

پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں — سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوئے

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن — بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے

غالبؔ ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے
بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کیے ہوئے

نویدِ امن ہے بیدادِ دوست جاں کے لئے — رہی نہ طرزِ ستم کوئی آسماں کے لئے

بلا سے گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے — رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خونفشاں کے لئے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق اے خضر! — نہ تم کہ چور بنے عمرِ جاوداں کے لئے

رہا بلا میں بھی میں مبتلائے آفتِ رشک — بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کے لئے

فلک نہ دور رکھ اس سے مجھے کہ میں ہی نہیں — درازدستیِ قاتل کے امتحاں کے لئے

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مُرغِ اسیر — کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کے لئے

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئی — اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل — کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا — کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لئے

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک — بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

زمانہ عہد میں اس کے ہے محوِ آرائش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لئے

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے — سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

ادائے خاص سے غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

میں ہوں مشتاقِ جفا، مجھ پہ جفا اور سہی — تم ہو بیداد سے خوش، اس سے سوا اور سہی

تم جو بت پھر تمہیں پندارِ خدائی کیوں ہے — تم خداوند ہی کہلاؤ، خدا اور سہی

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب — سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

غیر کی مرگ کا غم کس لئے اے غیرتِ ماہ — ہیں ہوس پیشہ بہت، وہ نہ ہوا اور سہی

حسن میں حور سے بڑھ کر نہیں ہونے کے کبھی — آپ کا شیوہ و انداز و ادا اور سہی

تیرے کوچے کا ہے مائل دلِ مضطر میرا — کعبہ اک اور سہی، قبلہ نما اور سہی

کوئی دنیا میں مگر باغ نہیں ہے واعظ — خلد بھی باغ ہے خیر آب و ہوا اور سہی

مجھ کو وہ دو کہ جسے کھا کے نہ پانی مانگوں — زہر کچھ اور سہی، آبِ بقا اور سہی

مجھ سے غالب یہ علائی نے غزل لکھوائی
ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

۱؎ یہ غزل غالب نے اپنے ایک خط میں لکھی ہے جو اردوئے معلیٰ اور دیوانِ غالب مطبوعہ بدایوں کے آخر میں موجود ہے۔

قصائد

فاتحۂ فارسی

بہرِ ترویجِ جنابِ والیِ یوم الحساب [1] م خانمانِ تعمیرِ قصرستانِ دلہائے خراب
جرم بخشائے کہ گر جوشد بہارِ رحمتش م بر خطائے خویش لرزد چوں دلِ مجرم عذاب
ز انتقامِ اعدائے او را در شمارِ سالِ عمر م نعلِ واژوں بندد از ناخن بہ انگشتِ حساب
نوحِ عمرے ماند طوفانی بہ بحرِ وحدتش م تا سرِ زانو بہ موجے باختے مانندِ حباب
نغمہ چوں خوں در رگِ ابریشمِ سازم افسرد م ہیبتِ نہیش اگر جوشد بوضعِ احتساب
بارگاہش را ز خورشید است خشتِ آستاں م شمعِ بزمش را بدست آنگیر از دو لختِ ماہتاب
ہم چمن زارِ ازل را قدرتش رنگ آفریں م ہم گلستانِ ابد را خوئے جاں بخشش سحاب
بہرِ ترویجِ جنابِ اقدسے، کز حکمِ او م صیقلِ آئینہ بر نورِ نظر ریزد حجاب
آستانش بر نشاں گاہِ جلالے کز ادب م حلقۂ بیرونِ در گردیدہ چشمِ آفتاب
مد بناہِ عشقش حورانِ جنت را ہنوز م پنبۂ روزن بود چشمِ سفیدِ ماہتاب

---

[1] یہ فاتحہ دیوانِ غالب فارسی مطبوعہ نولکشور کے صفحہ ۴۹۰ پر بہ اختلافِ خفیف درج ہے۔ لیکن چونکہ قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں متعدد اشعار کی کمی بیشی ہے۔ اس لئے یہاں قلمی نسخے کے اشعار کو پورا نقل کر دیا ہے اور جو شعر دونوں دیوانوں میں مشترک ہیں اُن کو "م" سے ممتاز کر دیا ہے۔ بخوفِ طوالت مطبوعہ نسخوں کے اختلاف دکھانے کی میں نے جرأت نہیں کی۔ ارباب ذوق مطبوعہ دیوان سے مقابلہ فرما سکتے ہیں۔

سایه‌اش جز در حریمِ قدس نتواں یافتن م کز شکستِ رنگِ امکاں عصمتش دارد نقاب

بهرِ ترویجِ خدائے از دو عالم رستگاں م عابدِ الله و معبودِ خلائق بوتراب

مهرباں پیرے که بهرِ دیدنِ ماهِ صیام در کفِ مستانِ او تیغے است از موجِ غراب

بادۂ خمخانۂ او پرتوِ نورِ جمال پنبۂ مینائے او چشمِ سفیدِ ماهتاب

شهسوارِ قدرتے کز فرطِ تعظیم و جلال سرمه در چشمِ رکابش می‌کشد گردِ کتاب

ذوالفقارش شاهدے کاندر تماشاگاهِ قتل م می‌کشد در شوقِ او از موجِ الف بر سینه آب

در خیالِ صدمۂ جاں دادگانِ نفرتش م می‌جهد از دیدۂ عیسے چراغِ آفتاب

دلدلِ برق آفرینش را رمے کاندر خیال م می‌جهد هم چوں نگاه از حلقۂ چشمِ رکاب

بسکه شد ویرانِ شوخی خانۂ نظاره‌اش عینکِ پیرِ فلک گردیده ماه و آفتاب

بهرِ ترویجِ حسنؑ، حرزِ زبانِ ورهِ تسلیمِ دیں م خسروِ عرش آستاں، شاهنشهِ قدرت مآب

ناظمِ حسن آفرینی، کز برائے خدمتش از شفق بندد حنا بر شام، دستِ آفتاب

جلوه ریزد آید اگر لطفش به هنگامِ غضب دودِ آتش می‌شود بارانِ رحمت را سحاب

بشکنند شانِ تغافل گر به دلداریِ ناز لذتِ قندِ محبت جوشد از زهرِ عتاب

توسنِ قدرش که عرش و خلد جولاں گاهِ اوست م از خمِ زانوئے جبریلِ امیں دارد رکاب

بهرِ ترویجِ شفیعِ عاصیاں یعنی حسینؑ آنکه جنت ماست از اشکِ عزاداریش آب

بادشاهِ صابرے، صیادِ لے، تشنه لبے کز غمش از لعلِ خوں بار است چشمِ آفتاب

شاهِ غیرت آفرینے، کز پئے تسلیمِ صبر بخیۂ نقشِ قدم زد، بر لبِ موجِ سراب

عاشقِ الله و معشوقِ وفادارِ رسولؐ م قبلۂ عشق و پناهِ حسن و جانِ بوتراب

در گمش ما محملِ خوابِ زلیخا در شبِ راه م خیمه گاهش را نگاهِ ماهِ کنعانی طناب

بهرِ ترویجِ امام ابنِ امام ابنِ امام م آدمِ آلِ عبا، شاهنشهِ عالی جناب

آنکه نقشِ عالی و منزل گهِ قدرش رفیع بارگاهش عرش ساماں و جنابش مستطاب

لاله را هم رنگیِ چشمِ بخون آلوده اش — م — می‌زند بر فرق از داغِ غلامی انتساب

بهرِ ترویجِ محمد باقر حیدر نژاد — کو خیالِ آستان بوسیش می‌رقصد ثواب

بهرِ ترویجِ محمد جعفرِ صادق آفرین — عالمِ علمِ نبی و واقفِ سرِ کتاب

بهرِ ترویجِ شهِ کاظم که در هر عالم است — م — چون قضا حکمش روان، چون قدر دانش صواب

بهرِ ترویجِ رضا شاهِ خراسان، کز کرم — بهرِ تعمیرِ جهان، از کهکشان دارد طناب

بهرِ ترویجِ تقی کاندر تماشاگاهِ اوست — م — طاقِ ایوانِ آسمان، آئینه‌دار آفتاب

بهرِ ترویجِ نقی کز بهرِ تقریبِ نیاز — م — تحفه آورده است نرگس‌دانی بر درش ماهتاب

بهرِ ترویجِ حسن پشت و پناهِ خافقین — شاهِ کیوان بارگاه و خسروِ جنت جناب

بعد ازین، بهرِ ظهورِ مهدیِ صاحب زمان — م — نعمت آبادِ شبِ کفر و حسد را آفتاب

ابرِ لطفش ز آتشِ دوزخ بپالاید بهشت — م — برقِ قهرش ابرِ رحمت را کند دودِ کباب

حبذا معمارِ خلقت! کز پئ تعمیرِ دین — م — در کفِ او سررشتهٔ شرعِ نبی دارد طناب

می‌کند از هم جدا اطرافِ حکمِ قدرتش — در سیاست‌گاهِ نقمت سی ز سیمِ ماهتاب

بعد ازین بهرِ شهید اینکه خونش جان زاده اند — در شهادت‌گاهِ شاهِ کربلا داور رکاب

یعنی از بهرِ ترویجِ علمدارِ حسین — م — پیشوای لشکرِ شبیرِ ابنِ بوتراب

حضرتِ عباس عالی رتبه کز چوگانِ او — می‌رود مانندِ گوی سپهر و پا آفتاب

بعد ازین تاثیرِ دل جوئی دعای زمره‌ایست — گر حق دارند در دل آتش و در چشم آب

بادشاهان وشان، جنت نصیبان بخت‌شان — بی ملال یعنی عزاداران آلِ بوتراب

راقمِ بیچارهٔ پژمرده دل یعنی اسد — کز غم و نهای دل گردیده پابندِ جلاب

بر زبان مهرِ خموشی و به دل جوشِ جنون — در هوس آبادِ نادانی اسیرِ پیچ و تاب

نقدِ آگاهی به وهمِ فرصتی در باخته — م — دستِ خالی بر سرِ دل پایمالِ اضطراب

غافل از رفتارِ عمر و فارغ از تکمیلِ عشق — م — کرده آغوشِ وداعِ دل نشیمن‌گاهِ خواب

بسکہ دہ صحرائے وحشت عقل و دیں در باختہ
لذتِ تیغِ محبت جویدا از زہرِ عتاب

خود تو ے دانی گم گردیدہ دشتِ اُمید
تشنہ تر می گردد از بے آبیٔ موجِ سراب

دل بکار افتادہ و پا ماندہ دست از ہم گسست
قطعِ منزل کے تواں کردن بپائے جالِ خواب

مدعا را بر زباں آوردن از بیگانگی ست
چیز نگہ ہست شاہد ما را کفن بادا نقاب

ذوقِ مطلب از تو و حق از تو و مطلب تو
خود تو می بخشی و می فہمی زبانِ اضطراب

شعلۂ شوقِ ہوس دارم ز سودائے جنوں م کآتشِ افسردہ را بخشد بہارِ التہاب

دین و دنیا را فدا کردانِ نازت کردہ ام
جلوۂ رنگیں تر از صد گلشنِ جنت انتخاب

حسرتِ جانِ محمد کیست تر گوئے من
یا علیؑ یا مرتضیٰؑ یا بوالحسنؑ یا بوترابؑ

قصیدۂ حیدری بہ تمہیدِ بہارِ مغفرت

سازِ یک ذرہ نہیں فیضِ چمن سے بیکار
سایۂ لالۂ بے داغ سویدائے بہار

مستیٔ بادِ صبا سے ہے بعرضِ سبزہ م ریزۂ شیشۂ مے جوہرِ تیغِ کہسار

سنگ پہ کارگہِ ربطِ نزاکت ہے کہ ہے
خندۂ بے مے خودیٔ کبک بہ دندانِ شرار

سبز گر داغِ پلنگ
نشو و نما کو سمجھ افسونِ بہار

سبز ہے جامِ زمرد کی طرح داغِ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

کشتۂ افعیٔ زلفِ سیہ شیریں کو
بے ستوں سبزہ سے ہے سنگِ زمرد کا مزار

حسرتِ جلوۂ ساقی ہے کہ ہر پارۂ ابر
سینہ بیتابی سے ملتا ہے بہ تیغِ کہسار

دشمنِ حسرتِ عاشق ہے رگِ ابرِ سیاہ
جس نے برباد کیا ریشۂ چندیں شبِ تار

مستیٔ ابر سے گلچیں طرب ہے حسرت م کہ اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار

کوہ و صحرا، ہمہ معموریٔ شوقِ بلبل
راہِ خوابیدہ ہوئی خندۂ گُل سے بیدار

چشم بر چشم چنے ہے بہ تماشا مجنوں
ہر دو سُو، خانۂ زنجیر نگہ کا بازار

خانۂ تنگِ ہجومِ دو جہاں کیفیت
جامِ جمشید ہے یاں قالبِ خشتِ دیوار

سونپے ہے فیضِ ہوا صورتِ مژگانِ یتیم ۲
سرنوشتِ دو جہاں ابر، بہ یک سطرِ غبار

کفِ ہر خاکِ چمن آئینۂ قمری صیقل
کفِ ہر خاکِ بگردوں شدہ قمری پروانہ ۱
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤس شکار

سُنبل و دامِ کمیں خانۂ خوابِ صیاد
نرگس و جامِ سیہ مستیِ چشمِ بیدار

طرہ ہا بسکہ گرفتارِ صبا ہیں، شانہ
زانوئے آئینہ پہ مارے ہے دستِ بیکار

بسکہ یک رنگ ہیں دل، کرتی ہے ایجاد نسیم
لالے کے داغ سے جوں نقطہ و خط سنبل زار

اے خوشا فیضِ ہوائے چمنِ نشو و نما
بادہ پُر زور و نفس مست و مسیحا بیمار

جوہرِ ناخنِ تجدیدہ بہ اندازِ ہلال
کاٹ کر پھینکیے ناخن، تو بہ اندازِ ہلال ۲
ریشۂ عجز کو کرتا ہے غرض سے سرشار
قوتِ نامیہ اس کو بھی نہ چھوڑے بیکار

محنتِ نشو و نما میں یہ بلندی ہے کہ سرو
پرِ قمری سے کرے نیمچۂ تیغِ کہسار

ہر کفِ خاکِ جگر تشنۂ صد رنگِ ظہور
غنچے کے میکدہ میں مستِ تامّل ہے بہار

کس قدر عرض کروں ساغرِ شبنم یا رب
موجۂ سبزۂ نوخیز ہے لبریزِ خمار

غنچۂ لالہ سیہ مستِ جوانی ہے ہنوز
شبنمِ صبح ہوئی رعشۂ اعضائے بہار

جوشِ بیدادِ تپش سے ہوئی عریاں آخر[۱]
شاخِ گلبن پہ صبا چھوڑ کے پیراہنِ داغ

مایۂ عریانیٔ کیفیتِ دل ہے لیکن
پہ مے تند نہیں موجِ خرامِ اظہار

موجِ جامے پہ ہے براتِ بگرانی امید
گلِ نرگس سے کفِ جام پہ ہے چشمِ بہار

---

۱ متن میں پہلے "جوشِ بیدادِ تپش" کی جگہ "بے دماغیٔ تپش" تھا۔

گلشن و میکدہ سیلابیِ یک موجِ خیال
میکدے میں ہو اگر آرزوئے گل چینی
موجِ گل ڈھونڈ بہ طوفاں کدۂ غنچۂ باغ
موجِ گل ڈھونڈ بہ خلوت کدۂ غنچۂ باغ
پشتِ لب تہمتِ خط کھینچے ہے بیجا یعنی
کھینچے گرمانیٔ اندیشہ چمن کی تصویر
جائے حیرت ہے کہ گلبازیٔ اندیشۂ شوق
سل سے کی ہے بمدحِ چمن آرائے بہار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحتِ شاہ
کسوتِ تاک میں ہے نشۂ ایجادِ ازل
بہ نظرگاہِ گلستانِ جمالِ ساقی
ہوائے چمنِ جلوہ ہے طاؤس پرست
یک چمن جلوۂ یوسف ہے بچشمِ یعقوب
بیضۂ قمری کے آئینہ میں پنہاں سنبل
عکسِ موجِ گل و سرشاریٔ اندازِ حباب
کس قدر سازِ دو عالم کو ملی جراتِ ناز
ورنہ وہ ناز ہے جس گلشنِ بیداد سے تھا
سایۂ تیغ کو دیکھ اُس کے بذوقِ یک زخم
بت کدہ بہرِ پرستش گریِ جبہۂ ناز
سبحہ گرداں ہے اُسی کے کفِ امید کا ابر
زنگ ریزِ گل و جامِ دو جہاں ناز و نیاز

نشۂ جلوۂ گل بر سرِ ہم فتنہ عیّار
۲ بھول جا یک قدحِ بادہ بطاقِ گلزار
۱ گم کرے گوشۂ میخانہ میں گر تو دستار
سبزہ ہے موجِ تبسم بہوائے گفتار
۲ سبز مثلِ خطِ نوخیز ہو خطِّ پرکار
اس زمیں میں کرے سبز قلم کا رفتار
۱ طوطیِ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
سبحۂ عرضِ دو عالم بکفِ آبلہ دار
بیخودی دامِ رگِ گل سے ہے پیمانہ شکار
باندھے ہے پیرِ فلک موجِ شفق سے زنّار
لالہ با داغِ پراگندہ و گلہا بے خار
سروِ بیدل سے اک عکسِ خیالِ قدِ یار
نگہ آئینہ کیفیتِ دل سے ہے دوچار
کہ ہوا ساغرِ بے حوصلۂ دل سرشار
طورِ مشعل بکف از جلوۂ تنزیہہ بہار
سینۂ سنگ پہ کھینچے ہے الف بالِ شرار
باندھے زنّارِ رگِ سنگ میانِ کہسار
بیم سے جس کے صبا توڑے ہے صد جا زنّار
آئینِ دورِ امامت طربِ ایجادِ بہار

جوششِ طوفانِ کرم ساقیٔ کوثر ساغر
نہ فلک آئنہ ایجادِ کفِ گوہر بار

پہنے ہے پیرہنِ کاغذِ ابری نیساں
یہ تنک مایہ ہے فریادیٔ جوششِ ایثار

وہ شہنشاہ کہ جس کے پئے تعمیرِ سرا م
چشمِ جبریل ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلک العرش ہجومِ خمِ دوشِ مزدور م
رشتۂ فیضِ ازل سازِ طنابِ معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خطِ پشتِ لبِ بام م
رفعتِ ہمتِ صد عارف و یک اوجِ حصار

واں کی خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرِ کاہ م
وہ رہے مروحۂ بالِ پری سے بیزار

پہ یہ دولت تھی نصیبِ نگہِ معنیٔ ناز
کہ ہوا صورتِ آئینہ میں جوہر بیدار

ذرّہ اس گرد کا خورشید کو آئینۂ ناز م
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار

خاکِ صحرائے نجف جوہرِ سیرِ عرفا م
چشمِ نقشِ قدم آئینۂ بختِ بیدار

اے خوشا مکتبِ شوق و بلدستانِ مراد!
سبقِ ناز کی ہے عجز کو صد جا تکرار

مشقِ نقشِ قدم نسخۂ آبِ حیواں
جادۂ دشتِ نجف عمرِ خضر کا طومار

جلوہ تمثال ہے ہر ذرّۂ نیرنگِ سواد
بزمِ آئینۂ تصویر نما مشتِ غبار

دو جہاں طالبِ دیدار تھا یارب کہ ہنوز
چمکِ ذرّہ سے ہے گرم نگہ کا بازار

ہے نفس مایۂ شوقِ دو جہاں ریگِ رواں
پائے رفتار کم و حسرتِ جولاں بسیار

آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستیٔ ناز م
عرضِ خمیازۂ ایجاد ہے ہر موجِ غبار

وحشتِ الفت، چمن و آبلہ مہماں پرور
دلِ جبریل کفِ پا پہ ملے ہے رخسار

یاں تک انصاف نوازی کہ اگر ریزۂ سنگ
بے خبر دے بکفِ پائے مسافر آزار

یک بیاباں تپشِ بالِ شرر سے صحرا
مغزِ کہسار میں کرتا ہے فرو نشترِ خار

فرش اس دشتِ تمنا میں نہ ہوتا گر عدل
گرمیٔ شعلۂ رفتار سے جلتے خس و خار

ابرِ نیساں سے ملے موجِ گہر کا تاواں
خلوتِ آبلہ میں گم کرے گر تو رفتار

یک جہاں بسملِ اندازۂ پرافشانی ہے
دام سے اس کے قضا کو ہے رہائی دشوار

موجِ طوفانِ غضب چشمۂ نہ چرخِ حباب
ذوالفقارِ شہِ مرداں خطِ قدرت آثار

موجِ ابروئے قضا جس کے تصور سے دونیم
بیم سے جس کے دلِ شحنۂ تقدیر فگار

شعلۂ تحریر سے اُس برق کی ہے کلکِ قضا
بالِ جبریل سے مسطرکشِ سطرِ زنہار

موجِ طوفاں ہو اگر خونِ دو عالم ہستی
ہے حنا کو سرِ ناخن سے گذرنا دشوار

دشتِ تسخیر ہو گر گردِ خرامِ دُلدُل
نعل در آتشِ ہر ذرّہ ہے تیغِ کہسار

بالِ رعنائیِ دُمِ موجۂ گُل بندِ قبا
گردشِ کاسۂ سُمِ چشمِ پری آئینہ دار

گردِ راہ اُس کی بھریں شیشۂ ساعت میں اگر
ہر نفس راہ میں ٹوٹے نفسِ لیل و نہار

نرم رفتار ہو جس کوہ پہ وہ برق گداز
رفتنِ رنگِ حنا ہے تپشِ بالِ شرار

ہے سراسر روئیِ عالمِ ایجاد اُسے
جیبِ خلوت کدۂ غنچہ میں جولانِ بہار

جس کے حیرت کدۂ نقشِ قدم میں مانی
خونِ صد برق سے باندھے بکفِ دستِ نگار

ذوقِ تسلیمِ تمنا سے بگلزارِ حضور
عرضِ تسخیرِ تماشا ہے بدامِ اظہار

مطلعِ تازہ ہوا موجۂ کیفیتِ دل
جامِ سرشارِ مے و غنچۂ لبریزِ بہار

مطلع فیض سے تیرے ہے اے شمعِ شبستانِ بہار
دلِ پروانہ چراغاں، پرِ بلبل گلزار

شکلِ طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
جلوہ میں تیرے ہے تسخیرِ ہوائے دیدار

گردِ جولاں سے ہے تیری جگر بیابانِ خرام
جلوۂ طور نمک سودۂ زخمِ تکرار

جس چمن میں ہو ترا جلوۂ محرم نواز
پرِ طاؤس کرے گرمِ نگہ کا بازار

جس ادب گاہ میں تو آئینۂ شوخی ہو
جلوہ ہے ساقیِ مخموریِ تابِ دیدار

تو وہ ساقی ہے کہ ہر موجِ محیطِ تنزیہہ
کھینچے خمیازہ میں تیرے لبِ ساغر کا خمار

گرد بادِ آئینہ فتراکِ دماغِ دل ہا
تیرا صحرائے طلب محفلِ پیمانہ شکار

ذوقِ بیتابیِ دیدار سے تیرے ہے ہنوز
جوشِ جوہر سے دلِ آئینہ گلدستۂ خار

تیری اولاد کے غم میں ہے بروئے گردوں م
سلکِ اختر میں مہِ نو مژۂ گوہر بار

مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعتِ نبیؐ م
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوشِ اسرار

ہم عبادت کو ترا نقشِ قدم مہرِ نماز م
ہم ریاضت کو ترے حوصلے سے استظہار

تیرا پیمانہ ہے نسخۂ ادوارِ ظہور
تیرا نقشِ قدم آئینۂ شانِ اظہار

آیتِ رحمتِ حق بسملۂ مصحفِ ناز
مطلعِ برجستۂ دیباچۂ درسِ اسرار

قبلۂ نورِ نظر، کعبۂ ایجادِ مسیح
مژدۂ دیدۂ نخچیر سے نبضِ بیمار

تہمتِ بیخودیٔ کفر نہ کھینچے یارب
کمیٔ ربطِ نیاز و خطِ نازِ بسیار

نازپروردۂ صد رنگِ تمنا ہوں ولے
پرورش پائی ہے جوں غنچہ بجوشِ اظہار

تنگیٔ حوصلہ گردابِ دو عالم آداب
دل بیک غنچہ سے ہوں بسملِ نقصانِ بہار

رشکِ نظارہ تھی یک برقِ تجلی کہ ہنوز
تشنۂ خونِ دو عالم ہوں بعرضِ تکرار

وحشتِ فرصتِ یک جیبِ کشش نے کھویا
صورتِ رنگِ حنا ہاتھ سے دامانِ بہار

شعلہ آغاز و لے حیرتِ داغِ انجام
موجِ مے، ایک زمیں تا قدم آغوشِ خمار

ہے اسیرِ ستمِ کشمکشِ دامِ وفا
دلِ وارستہ ہما دو دولت بیزار

مژۂ خواب سے کرتا ہوں بہ آسائشِ درد
بخیۂ زخمِ دلِ چاک بیک رشتہ شرار

محرمِ دردِ گرفتاریٔ ہستی معلوم
ہوں نفس سے صفتِ نغمہ بہ بندِ رگِ تار

تھا سرِ سلسلہ جنبانیٔ صد عمرِ ابد
ساز یا شفتِ بریشم کدۂ نالۂ زار

لیکن اس رشتۂ تحریر میں ہر تا سرِ فکر
ہوں بقدرِ عددِ حرفِ علی سبحہ شمار

جوہرِ دستِ دعا آئنہ یعنی تاثیر م
{ یک طرف نازشِ مژگاں بدگر سو غمِ خار
{ یک طرف نازشِ مژگاں و دگر سو غمِ خار

{ مردمک سے ہو عزاخانۂ یک شہرِ نگاہ
{ مردمک سے ہو عزاخانۂ اقبالِ نگاہ م
خاکِ در کی تری جو چشم نہ ہو آئینہ دار

دشمنِ آلِ نبیؐ کو بطرب خانۂ دہر م
عرضِ خمیازۂ سیلاب ہو طاقِ دیوار

دوست اس سلسلۂ ناز کے جوں سنبل و گُل — ابرِ مے خانہ کریں ساغرِ خورشید شکار
لنگرِ عیش پہ سرشارِ تماشائے دوام — کہ رہے خونِ خزاں سے بحناپائے بہار
زُلفِ معشوق کششِ سلسلۂ وحشتِ ناز — دلِ عاشق شکن آموزِ خمِ طرۂ یار
مے تمثال پری نشۂ مینا آزاد — دلِ آئینہ طرب ساغرِ بختِ بیدار
دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک سجدۂ شوق — فیضِ اُلفت سے رقم تا دلِ معنی سرشار
دیدہ تا دل اسدؔ آئینۂ یک پرتوِ شوق — ۱ فیضِ معنی سے خطِ ساغرِ راقم سرشار

قصیدہ فی المنقبت

توڑے ہے عجزِ تنک حوصلہ بر روئے زمیں — سجدۂ تمثال وہ آئینہ، کہیں جس کو جبیں
دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں — ہم کہاں ہوتے اگر حُسن نہ ہوتا خودبیں
توڑے ہے نالہ سرِ رشتۂ پاسِ انفاس — سر کرے ہے دلِ حیرت زدہ شغلِ تسکیں
بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق — م بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں
ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم — م لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں
یاس، تمثالِ بہار آئینۂ استغنا — وہم آئینۂ پیدائیِ تمثال یقیں
خوں ہوا دردِ دو عالم سے تمنا کا دماغ — بزمِ یاس آئینۂ پیدائی و اخفا نگیں
مثلِ مضمونِ وفا باد بدستِ تسلیم — ۲ صورتِ نقشِ قدم خاک بفرقِ تمکیں
خانہ ویرانیِ امید و پریشانیِ بیم — جوشِ دوزخ ہے خزانِ چمنِ خلدِ بریں
لافِ دانش غلط و نفعِ عبادت معلوم — ۲ دُردِ یک ساغرِ غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

---

۱ یہ مشہور مطلع قلمی نسخے میں نہیں ہے غالباً بعد میں بڑھایا گیا ہے۔

بادِ افسانۂ بیمار ہے عیسیٰ کا نفس
استخوانِ ریزۂ موراں ہے سلیماں کا نگیں

نقشِ معنی ہمہ خمیازۂ عرضِ صورت م
سخنِ حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

عشق بے ربطیِ شیرازۂ اجزائے حواس ۲
{ وصل افسانۂ اطفالِ پریشاں بالیں
{ وصل زنگارِ رخِ آئنۂ حسنِ یقیں

کوہکن گرسنہ مزدورِ طرب گاہِ رقیب م
{ بے ستوں سازِ گرانباریِ خوابِ شیریں
{ بے ستوں آئنۂ خوابِ گرانِ شیریں

موجِ خمیازۂ یک نشہ چہ اسلام و چہ کفر
کجیِ یک خطِ مسطر، چہ توہم چہ یقیں

قبلہ و ابروئے بت یک سرِ خوابیدۂ شوق
کعبہ و بتکدہ یک محملِ خوابِ سنگیں

{ کس نے دیکھا جگرِ اہلِ جنوں نالہ فروش
{ کس نے دیکھا نفسِ اہلِ وفا آتش خیز ۲
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلہائے حزیں

عیشِ بسمل کدۂ عیدِ حریفاں معلوم
خوں ہوا آئنہ کہ ہر جامۂ طفلاں رنگیں

سامعِ زمزمۂ اہلِ جہاں ہوں لیکن ۲
نہ سر و برگِ ستائش، نہ دماغِ نفریں

نزعِ مخمور ہوں اُس دیدگیِ حسن ہیں کہ مجھے
رشتۂ سازِ ازل ہے نگہِ بازپسیں

حیرت آفت زدۂ عرضِ دو عالم نیرنگ
مومِ آئینۂ ایجاد ہے مغزِ تمکیں

وحشتِ دل سے پریشاں ہیں چراغانِ خیال
باندھوں ہوں آئنہ پر چشمِ پری سے آئیں

کوچہ دیتا ہے پریشاں نظری پر صحرا
رم آہو کو ہے ہر ذرّہ کی چشمک میں کمیں

چشمِ امید سے گرتے ہیں دو عالم جوں اشک
پاسِ پیمانہ کشِ گریۂ مستانہ نہیں

کس قدر فکر کو ہے نالِ قلم موئے دماغ
کہ ہوا خونِ نگہ شوق میں نقشِ تمکیں

عذرِ لنگ آفتِ جولانِ ہوس ہے یارب
جل اُٹھے گرمیِ رفتار سے پائے چوبیں

نہ تمنا، نہ تماشا، نہ تحیر، نہ نگاہ
گردِ جوہر میں ہے آئینۂ دل پردہ نشیں

کھینچوں ہوں آئنہ پر خندۂ گل سے مسطر
نامۂ عنوانِ بیانِ دلِ آزردہ نہیں

رنجِ تعظیمِ مسیحا نہیں اُٹھتا مجھ سے
درد ہوتا ہے مرے دل میں جو توڑوں بالیں

بسکہ گستاخیِ اربابِ جہاں سے ہوں ملول
پرِ پرواز مری بزم میں ہے خنجرِ کیں

اے عبادت تجھے کس خط سے ہے درسِ نیرنگ
اے نگہ تجھ کو ہے کس نقطہ میں مشقِ تسکیں

کس قدر نالہ پریشاں ہے عیاذاً باللہ
کس قدر رہزنہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
م
یک قلم خارجِ آدابِ جنون و تمکیں
ایک قلم خارجِ آدابِ وقار و تمکیں

جلوۂ ریگِ رواں دیکھ کہ گرد دل ہمہ ہیچ
خاک پر توڑے ہے آئینۂ نازِ پرویں

شورِ اوہام سے مت ہو شبِ خرمنِ انصاف
گفتگو بے مزہ و زخمِ تمنا نمکیں

ختم کر ایک اشارت میں عباراتِ نیاز
جوں مہِ نو ہے نہاں گوشۂ ابرو میں جبیں

نقشِ لاحول لکھ اے خامۂ ہذیاں تحریر م
"یا علی" عرض کر اے فطرتِ وسواس قریں

معنیِ لفظِ کرم بسملۂ نسخۂ حسن
قبلۂ اہلِ نظر کعبۂ اربابِ یقیں

جلوۂ رفتارِ سرِ جادۂ شرعِ تسلیم
نقشِ پا جس کا ہے توحید کو معراجِ جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مدح اُس کی بغیر از ہمہ اُو
کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
م
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں ناز خرام
ہو وہ سرمایۂ ایجادِ جہاں گرمِ خرام
م
ہر کفِ خاک ہے واں گردۂ تصویرِ زمیں

مظہرِ فیضِ خدا جان و دلِ ختمِ رسل م
قبلۂ آلِ نبیؐ، کعبۂ ایجادِ یقیں

نسبتِ نام سے اُس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے م
ابداً پشتِ فلک خم شدۂ نازِ زمیں

جلوہ تحریر ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا
جلوہ پرواز ہو نقشِ قدم اُس کا جس جا
م
وہ کفِ خاک ہے ناموسِ دو عالم کی امیں

فیضِ خُلق اُس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا م
بوئے گُل سے نفسِ بادِ صبا عطر آگیں

بُرِشِ تیغ کا اُس کی ہے جہاں میں چرچا م
قطع ہو جائے نہ سر رشتۂ ایجاد کہیں

کوہ کو بیم سے اُس کی ہے جگر باختگی — نہ کرے نذرِ صدا ورنہ متاعِ تمکیں

کُفر سوز اُس کا یہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے

کُفر سوز اُس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے — م — رنگِ عاشق کی طرح رونقِ بت خانۂ چیں

وصفِ دُلدل ہے مرے مطلعِ ثانی کی اساس — جنّتِ نقشِ قدم سے ہوں میں اُس کی گلچیں

گردِ رہ سرمہ کشِ دیدۂ اربابِ یقین — نقشِ ہر گام دو عالم صفہانِ زیرِ نگیں

برگِ گل کا ہو جو طوفانِ ہوا میں عالم — اُس کے جولاں میں نظر آئے ہے یوں دامنِ زیں

اُس کی شوخی سے بحسرت کدۂ نقشِ خیال — فکر کو حوصلۂ فرصتِ ادراک نہیں

جلوۂ برق سے ہو جائے مگر عکس پذیر — اگر آئینہ بنے حیرتِ صورت گرِ چیں

جاں پناہا دل و جاں فیض رساں بادشہا — اے کہ تجھ سے ہے بہارِ چمنستانِ یقیں

جاں پناہا دل و جاں فیض رسانا شاہا — م — وصیِ ختمِ رُسُل تُو ہے بفتوائے یقیں

ورقِ گلچینیِ نقشِ کفِ پا سے تیرے — عرش چاہے ہے کہ ہو در پہ ترے خاک نشیں

تجھ میں اور غیر میں نسبت ہے لیکن بہ تضاد — وصیِ ختمِ رُسُل تُو ہے بہ اثباتِ یقیں

جسمِ اطہر کو ترے دوشِ پیمبر منبر — م — نامِ نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں — م — تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئینۂ سنگ — م — رقمِ بندگیِ حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیے اسبابِ نثار آمادہ — م — خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

دادِ دیوانگیِ دل کہ ترا مدحت گر — ذرّے سے باندھے ہے خورشیدِ فلک پر آئیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحیِ ممدوحِ خدا — م — کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

یا علی جنسِ معاصی اسد اللہ اسد

جنسِ بازارِ معاصی اسد اللہ اسد — م — کہ سوا تیرے کوئی اُس کا خریدار نہیں

شوخیِ عرضِ مطالب میں ہے گستاخِ طلب — م — ہے ترے حوصلۂ فضل پہ از بسکہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبۂ حسنِ قبول ۔ م ۔ کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سَو بار آمیں

غمِ شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز ۔ م ۔ کہ رہیں خونِ جگر سے مری آنکھیں رنگیں

طبع کو اُلفتِ دُلدُل میں یہ سرگرمیِ شوق ۔ م ۔ کہ جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں

دلِ اُلفت نسب و سینۂ توحید فضا ۔ م ۔ نگہِ جلوہ پرست و نفسِ صدق گزیں

صرفِ اعدا، اثرِ شعلۂ و دودِ دوزخ

وقفِ احباب گُل و سُنبلِ فردوسِ بریں ۔ م

قصیدہ فی المنقبت

جو نہ نقدِ[1] داغِ دل کی کرے شعلہ پاسبانی ۔ تہی ۔ تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بے زبانی

بگمانِ قطعِ زحمت، نہ دوچارِ خامشی ہو ۔ کہ زبانِ سرمہ آلود نہیں تیغِ اصفہانی

بہ فریبِ آشنائی، بہ خیالِ بے وفائی ۔ نہ رکھ آپ سے تعلق مگر ایک بدگمانی

نظرے بسوئے گلستاں نہیں غیرِ شیشہ ساماں ۔ جو گدازِ دل ہو مطلب، تو چمن ہے سنگجانی

بفراز گاہِ عبرت، چہ بہار و کو تماشا ۔ کہ نگاہ ہے سیہ پوش بعزائے زندگانی

بہ فراقِ رفتہ یاراں خط و حرف مو پریشاں ۔ دلِ غافل از حقیقت ہمہ ذوقِ قصہ خوانی

تپشِ دلِ شکستہ، پئے عبرت آگہی ہے ۔ کہ نہ دے عنانِ فرصت بکشاکشِ زبانی

نہ وفا کو آبرو ہے، نہ جفا تمیز جو ہے ۔ چہ حسابِ جانفشانی، چہ غرورِ دلستانی

بہ شکنجِ جستجو ہا، بہ سرابِ گفتگو ہا ۔ تگ و تازِ آرزو ہا بفریبِ شادمانی

نہیں شاہراہِ اوہام، بجز آنسوئے رسیدن ۔ تری سادگی ہے غافل، درِ دل پہ پاسبانی

---

[1] مطبوعہ دیوان میں اس قصیدے کے صرف دو مطلع اور ایک شعر غزلیات کے ضمن میں درج ہیں جو (م) سے ممتاز ہیں۔

چہ امید و ناامیدی، چہ نگاہ و بے نگاہی — ہمہ عرضِ ناشکیبی، ہمہ سازِ جاں ستانی

اگر آرزو ہے راحت، تو عبث بخوں طپیدن — کہ خیال ہو تعب کش بہوائے کامرانی

ثمرِ غرورِ آرزو ہے، تب و تابِ عجز بہتر — نہ کرے اگر ہوس پر غمِ بیدلی گرانی

ہوسِ فروغِ شمع ہا، تب و تابِ سوختن ہا — سرِ شمع نقشِ پا ہے، بسپاسِ ناتوانی

شررِ اسیرِ دل کو، ملے اوجِ عرضِ اظہار — جو بصورتِ چراغاں کرے شعلہ نردبانی

ہوئے عشق جراتِ ناز، رہ و رسمِ طرحِ آداب — خمِ پشت خوشنما تھا، بگذارشِ جوانی

اگر آرزو رسا ہو، پئے دردِ دل دوا ہو — وہ اجل کہ خوں بہا ہو، بشہیدِ ناتوانی

غمِ عجز کا سفینہ، بکنارِ بیدلی ہے — مگر اک شکستہ پر ہو، کرے سازِ بادبانی

مجھے انتعاشِ غم نے پئے عرضِ حال بخشی — ہوسِ غزل سرائی، تپشِ فسانہ خوانی

مجھے اس سے کیا توقع، بزمانۂ جوانی — کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی مطلع ثانی

دلِ ناامید کیونکر، بہ تسلی آشنا ہو — جو امیدوار رہیے نہ بہ برگِ ناگہانی

مجھے بادۂ طرب ہے، بہ خمار گاہِ قسمت — جو ملی تو تلخ کامی، جو ہوئی تو سرگرانی

ستم کر اب تو مجھ پر، کہ وہ دن گئے کہ ہاں تھی — مجھے طاقت آزمائی، تجھے الفت آزمائی

یونہی دکھ کسی کو دینا، نہیں خوب ورنہ کہتا — کہ مرے عدو کو یارب ملے میری زندگانی

بہزار امیدواری، رہی ایک اشکباری — نہ ہوا حصولِ زاری، بجز آستیں فشانی

کروں عذرِ ترکِ صحبت، سو کہاں وہ بدطینی — نہ غرورِ سیرزائی، نہ فریبِ ناتوانی

ہمہ یک نفس تپش سے، تب و تابِ ہجر مت پوچھ — کہ ستم کشِ جنوں ہوں، نہ بقدرِ زندگانی

کفِ موجۂ حیا ہوں، بگدازِ عرضِ مطلب — کہ سرشک قطرہ زن ہے، بہ پیامِ دل رسانی

یہی بار بار جی میں، مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوانِ گفتگو پر، دل و جاں کی میہمانی

قصیدہ

مطلع

ہاں، مہِ نو! سنیں ہم اُس کا نام — جس کو تُو جھک کے کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح — یہی انداز اور یہی اندام

بارے دو دن کہاں رہا غائب — بندہ عاجز ہے گردشِ ایّام

اُڑ کے جاتا کہاں، کہ تاروں کا — آسماں نے بچھا رکھا تھا دام

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص — حبّذا اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں تین دن نہ آنے کے — لے کے آیا ہے عید کا پیغام

اُس کو بھولا نہ چاہیے کہنا — صبح جو جائے اور آئے شام

ایک میں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام

رازِ دل مجھ سے کیوں چھپاتا ہے — مجھ کو سمجھا ہے کیا کہیں نمّام

جانتا ہوں کہ آج دُنیا میں — ایک ہی ہے امید گاہِ انام

میں نے مانا کہ تُو ہے حلقہ بگوش — غالبؔ اُس کا مگر نہیں ہے غُلام؟

جانتا ہُوں کہ جانتا ہے تُو — تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو، اے ماہ — قربِ ہر روزہ بر سبیلِ دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا — جُز بہ تقریبِ عیدِ ماہِ صیام

جانتا ہوں کہ اُس کے فیض سے تُو — پھر بنا چاہتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن، ماہتاب بن، مَیں کون — مجھ کو کیا بانٹ دے گا تُو انعام

میرا اپنا جُدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص — گر تجھے ہے اُمیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشے گا تجھ کو فرِّ فروغ — کیا نہ دے گا مجھے مئے گلفام

جبکہ چودہ منازلِ فلکی، کر چکی قطع تیری تیزیِ گام
تیرے پرتو سے ہوں فروغ پذیر کوئے و مشکوئے و صحن و منظر و بام
دیکھنا میرے ہاتھ میں لبریز اپنی صورت کا اک بلوریں جام
پھر غزل کی روش پہ چل نکلا توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام تجھ کو کس نے کہا کہ ہو بد نام
مے ہی پھر کیوں نہ میں پیے جاؤں غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام
بوسہ کیسا، یہی غنیمت ہے کہ نہ سمجھیں وہ لذّتِ دشنام
کعبے میں جا بجائیں گے ناقوس اب تو باندھا ہے دَیر میں احرام
اُس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ ایام
بوسہ دینے میں اُن کو ہے انکار دل کے لینے میں جن کو تھا ابرام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں ورنہ **غالب** اپنا نام

کہہ چکا میں تو سب کچھ اب تو کہہ اے پری چہرہ پیکِ تیز خرام
کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام؟
تو نہیں جانتا، تو مجھ سے سُن نامِ شاہنشہِ بلند مقام
قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ مظہرِ ذوالجلال والاکرام
شہسوارِ طریقۂ انصاف نوبہارِ حدیقۂ اسلام
جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز جس کا ہر قول معنیِ الہام

بزم میں میزبانِ قیصر و جم
رزم میں اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا
اے ترا عہد فرخی فرجام

چشمِ بد دور خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے قیصرِ روم
جرعہ خواروں میں تیرے مرشدِ جام

وارثِ ملک جانتے ہیں تجھے
ایرج و تور و خسرو و بہرام

زورِ بازو میں مانتے ہیں تجھے
گیو و گودرز و بیژن و رہام

مرحبا موشگافیِ ناوک
ق آفریں آب داریِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
ق برق کو دے رہا ہے کیا الزام

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

فنِ صورت گری میں تیرا گرز
ق گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

اس کے مضروب کے سر و تن سے
ق کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام

جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
ق صفحہ ہائے لیالی و ایام

اور ان اوراق میں بہ کلکِ قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کُش
لکھ دیا عاشقوں کو دشمن کام

آسماں کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام

حکمِ ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام

مہرِ رخشاں کا نام خسروِ روز
ماہِ تاباں کا نام شحنۂ شام

تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

کاتبِ حکم نے بموجبِ حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

ہے ازل سے روائیِ آغاز
ہو ابد تک رسائیِ انجام

قصیدہ

صبحدم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا

خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا گنجینۂ گوہر کھلا

وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رُخ، سر کھلا

تھی نظر بندی کیا جب ردِ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے صبوحی کے لئے
رکھ دیا ہے ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زریں مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے منہ پر کھلا

شاہِ روشن دل بہادر شہ، کہ ہے
رازِ ہستی اس پہ سرتا سر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

پہلے دارا کا نکل آیا ہے نام
اُس کے سرہنگوں کا جب دفتر کھلا

روشناسوں کی جہاں فہرست ہے
واں لکھا ہے چہرۂ قیصر کھلا

توسنِ شہ میں ہے وہ خوبی کہ جب ق
تھان سے وہ غیرتِ صرصر کھلا

نقشِ پا کی صورتیں وہ دل فریب — تو کہے بت خانۂ آذر کھلا
مجھ پہ فیضِ تربیت سے شاہ کے — منصبِ مہر و مہ و محور کھلا
لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک — میری حدِ وسع سے باہر کھلا
تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید — کس نے کھولا کب کھلا کیونکر کھلا
باغِ معنی کی دکھاؤں گا بہار — مجھ سے گر شاہِ سخن گستر کھلا
ہو جہاں گرمِ غزل خوانی نفس — لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کُنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا — کاشکے ہوتا قفس کا در کھلا
ہم پکاریں، اور کھلے، یوں کون جائے — یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
ہم کو ہے اس رازداری پر گھمنڈ — دوست کا ہے راز دشمن پر کھلا
واقعی دل پر بھلا لگتا تھا داغ — زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا
ہاتھ سے رکھ دی کب ابرو نے کمان — کب کمر سے غمزے کی خنجر کھلا
مُفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ — رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک — آگ بھڑکی مینہ اگر دم بھر کھلا
نامے کے ساتھ آگیا پیغامِ مرگ — رہ گیا خط میری چھاتی پر کھلا

دیکھیو غالبؔ سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر کھلا

؟

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال — پھر مہ و خورشید کا دفتر کھلا
خامے نے پائی طبیعت سے مدد — بادباں بھی اُٹھتے ہی لنگر کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ — عرض سے یاں رتبۂ جوہر کھلا
مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا
بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب — اب عُلوِ پایۂ منبر کھلا
سکۂ شہ کا ہوا ہے روشناس — اب عیارِ آبروئے زر کھلا
شاہ کے آگے دھرا ہے آئنہ — اب مآلِ سعیِ اسکندر کھلا
مُلک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریبِ طغرل و سنجر کھلا
ہو سکے کیا مدح، ہاں اک نام ہے — دفترِ مدحِ جہاں داور کھلا
فکر اچھی، پر ستائش ناتمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
جانتا ہوں ہے خطِ لوحِ ازل — تم پہ اے خاقانِ نام آور کھلا

تم کرو صاحبقرانی، جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا

در صفتِ انبہ

ہاں دلِ دردمندِ زمزمہ ساز — کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا — شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے کیا لکھیے — نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے
بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے — خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے — ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے
تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں — آئے یہ گوئے اور یہ میداں
آم کے آگے پیش جائے خاک — پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور — بادۂ ناب بن گیا انگور
یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے
مجھ سے پوچھو تمہیں خبر کیا ہے — آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اُس میں نہ شاخ و برگ نہ بار — جب خزاں آئے تب ہو اس کی بہار
اور دوڑائیے قیاس کہاں — جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں
جان میں ہوتی گر یہ شیرینی — کوہکن، باوجودِ، غمگینی
جان دینے میں اُس کو یکتا جان — پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر — کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام — شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے — باغبانوں نے باغِ جنت سے
انگبیں کے، بحکمِ ربُّ النّاس — بھر کے بھیجے ہیں سر بمہر گلاس
یا لگا کر خضر نے شاخِ نبات — مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل — ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل
تھا ترنجِ زر، ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد پر کہاں بو باس
آم کو دیکھتا اگر اک بار — پھینک دیتا طلائے دست افشار
رونقِ کارگاہِ برگ و نوا — نازشِ دودمانِ آب و ہوا
رہروِ راہِ خلد کا توشہ — طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ
صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے آم — ناز پروردۂ بہار ہے آم
خاص وہ آم جو نہ ارزاں ہو — نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو
وہ، کہ ہے والیٔ ولایتِ عہد — عدل سے اُس کے ہے حمایتِ عہد
فخرِ دیں، عزِّ شان و جاہِ جلال — زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمائے دین و دولت و بخت — چہرہ آرائے تاج و مسند و تخت
سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ہے — خلق پر وہ خدا کا سایہ ہے
اے مفیضِ وجودِ سایہ و نُور — جب تلک ہے نمودِ سایۂ و نُور
اُس خداوندِ بندہ پرور کو — وارثِ گنج و تخت و افسر کو
شاد و دل شاد و شادماں رکھیو
اور غالبؔ پہ مہرباں رکھیو

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر — اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل
پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ — فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل
تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام — تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل
تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم — تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل
بہ سخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ — بکرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل
تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر — تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل
ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر — زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل
تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین — تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل
تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید — تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل
بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں — چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل
پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ — پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل
تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم — کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل
درِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی — غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل
فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر — کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح — میرے اجمال پہ کرتی ہے تراوش تفصیل
نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف — جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل
قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر — کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

قطعہ

گئے وہ دن کہ نا دانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر، ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی، جانے دو، مل جاؤ
قسم لو ہم سے گر یہ بھی کہیں کیوں ہم نہ کہتے تھے

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں،
اک تیر میرے سینہ پہ مارا کہ ہائے ہائے

وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب
وہ نازنیں بتانِ خود آرا کہ ہائے ہائے

صبر آزما وہ اُن کی نگاہیں، کہ حف نظر
طاقت رُبا وہ اُن کا اشارا کہ ہائے ہائے

وہ میوہ ہائے تازہ و شیریں کہ واہ واہ
وہ بادہ ہائے ناب گوارا کہ ہائے ہائے

چکنی ڈلی کی تعریف میں

ہے جو صاحب کے کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے

خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے
ناطقہ سر بگریباں، کہ اسے کیا کہیے

مُہرِ مکتوبِ عزیزانِ گرامی لکھیے
حرزِ بازوئے شگرفانِ خود آرا کہیے

مسی آلود سر انگشتِ حسیناں لکھیے
داغِ طرفِ جگرِ عاشقِ شیدا کہیے

خاتمِ دستِ سلیماں کے مشابہ لکھیے
سرِ پستانِ پری زاد سے مانا کہیے

اخترِ سوختۂ قیس سے نسبت دیجے
خالِ مشکینِ رخِ دل کشِ لیلا کہیے

حجر الاسود دیوارِ حرم کیجے فرض
نافہ آہوئے بیابانِ ختن کا کہیے

وضع میں اُس کو اگر سمجھیے قافِ تریاق
رنگ میں سبزۂ نوخیزِ مسیحا کہیے

صومعے میں اسے ٹھہرائیے گر مُہرِ نماز
میکدے میں اسے خشتِ خُمِ صہبا کہیے

کیوں اسے قفلِ درِ گنجِ محبت لکھیے
کیوں اسے نقطۂ پرکارِ تمنا کہیے

کیوں اسے تکمۂ پیراہنِ لیلیٰ لکھیے
کیوں اسے نقشِ پئے ناقۂ سلمیٰ کہیے

بندہ پرور کے کفِ دست کو دل کیجے فرض
اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی

سہرا

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

کیا ہی اس چاند سے مکھڑے پہ بھلا لگتا ہے
ہے ترے حسنِ دل افروز کا زیور سہرا

سر پہ چڑھنا تجھے پھبتا ہے پر اے طرفِ کلاہ
مجھ کو ڈر ہے کہ نہ چھینے ترا لمبر سہرا

ناؤ بھر کر ہی پروئے گئے ہوں گے موتی
ورنہ کیوں لائے ہیں کشتی میں لگا کر سہرا

سات دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

رخ پہ دولہا کے جو گرمی سے پسینہ ٹپکا
ہے رگِ ابرِ گہر بار سراسر سہرا

یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ قبا سے بڑھ جائے
رہ گیا آن کے دامن کی برابر سہرا

جی میں اترائیں نہ موتی کہ ہمیں ہیں اک چیز
چاہیے پھولوں کا بھی ایک مقرر سہرا

جبکہ اپنے میں سماویں نہ خوشی کے مارے
گوندھے پھولوں کا بھلا پھر کوئی کیونکر سہرا

رُخِ روشن کی دمک، گوہرِ غلطاں کی چمک | کیوں نہ دکھلائے فروغِ مہ و اختر سہرا
تار ریشم کا نہیں، ہے یہ رگِ ابرِ بہار | لائے گا تابِ گراں باریِ گوہر سہرا؟

ہم سُخن فہم ہیں، غالبؔ کے طرفدار نہیں
دیکھیں، اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

گُزارش

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی | اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سَو پُشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری | کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
آزادہ رَو ہوں اور مرا مسلک ہے صلحِ کُل | ہرگز کبھی کسی سے عداوت نہیں مجھے
کیا کم ہے یہ شرف کہ ظفر کا غلام ہوں | مانا کہ جاہ و منصب و ثروت نہیں مجھے
اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال | یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر | سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
میں کون اور ریختہ، ہاں اس سے مدعا | جز انبساطِ خاطرِ حضرت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا ز رہِ امتثالِ امر | دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آپڑی ہے سُخن گسترانہ بات | مقصود اس سے قطعِ محبت نہیں مجھے
روئے سُخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ | سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں | ہے شکر کی جگہ کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں غالبؔ خُدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

مدح

نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

گرچہ تو وہ ہے کہ ہنگامہ اگر گرم کرے
رونقِ بزمِ مہ و مہر تری ذات سے ہے

اور میں وہ ہوں کہ گر جی میں کبھی غور کروں
غیر کیا، خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے

خستگی کا ہو بھلا، جس کے سبب سے سرِ دست
نسبت اک گو نہ مرے دل کو ترے ہات سے ہے

ہاتھ میں تیرے رہے توسنِ دولت کی عناں
یہ دعا شام و سحر قاضیِ حاجات سے ہے

تو سکندر ہے، مرا فخر ہے ملنا تیرا
گو شرف خضر کی بھی مجھ کو ملاقات سے ہے

اُس پہ گزرے نہ گماں ریو و ریا کا زنہار
غالبِ خاک نشیں اہلِ خرابات سے ہے

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو
رکھ دیں چمن میں بھر کے مئے مشک بو کی ناند

جو آئے، جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست
سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں
ہے جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشاہ
بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشتِ وخواند

در مدحِ شاہ

اے شاہِ جہانگیر جہاں بخشِ جہاں دار
ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت

جو عقدۂ دشوار کہ کوشش سے نہ وا ہو
تو وا کرے اس عقدے کو، سو بھی باشارت

ممکن ہے کرے خضر سکندر سے ترا ذکر؟
گر لب کو نہ دے چشمۂ حیواں سے طہارت

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت

ہے نقشِ مریدی ترا فرمانِ الٰہی
ہے داغِ غلامی ترا توقیعِ امارت

تو آب سے گر سلب کرے طاقتِ سیلاں
تو آگ سے گر دفع کرے تابِ شرارت

ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی
باقی نہ رہے آتشِ سوزاں میں حرارت

ہے گرچہ مجھے نکتہ سرائی میں توغل
ہے گرچہ مجھے سحر طرازی میں مہارت

کیونکر نہ کروں مدح کو میں ختم دعا پر
قاصر ہے ستائش میں تری میری عبارت

نو روز ہے آج اور وہ دن ہے کہ ہوئے ہیں
نظارگیِ صنعتِ حق اہلِ بصارت

تجھ کو شرفِ مہرِ جہاں تاب مبارک
غالب کو ترے عتبۂ عالی کی زیارت

افطارِ صوم کی کچھ اگر دستگاہ ہو
اس شخص کو ضرور ہے روزہ رکھا کرے

جس پاس روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نہ کھائے تو ناچار کیا کرے

گزارشِ مصنف بحضورِ شاہ

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ
اے جہاندارِ آفتاب آثار

تھا میں اک بے نوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمندِ سینہ فگار

تم نے مجھ کو جو آبرو بخشی
ہوئی وہ میری گرمیِ بازار

کہ ہوا مجھ سا ذرّۂ ناچیز
روشناسِ ثوابت و سیّار

گرچہ از روئے ننگِ بے ہنری ق
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں لیکن اپنے جی میں کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مدّاح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخّص چار

نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں؟
مدّعائے ضروری الاظہار

پیر و مرشد، اگرچہ مجھ کو نہیں
ذوقِ آرائشِ سر و دستار

کچھ تو جاڑے میں چاہیئے آخر
تا نہ دے بادِ زمہریر آزار

کیوں نہ درکار ہو مجھے پوشش
جسم رکھتا ہوں، ہے اگرچہ نزار

کچھ خریدا نہیں ہے اب کے سال
کچھ بنایا نہیں ہے اب کی بار

رات کو آگ اور دن کو دھوپ
بھاڑ میں جائیں ایسے لیل و نہار

آگ تاپے کہاں تلک انساں
دھوپ کھائے کہاں تلک جاندار

دھوپ کی تابش، آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

میری تنخواہ جو مقرّر ہے
اس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے مردہ کی چھ ماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات
اور چھ ماہی ہو سال میں دو بار

بس کہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار

میری تنخواہ میں تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ساہوکار

آج مجھ سا نہیں زمانے میں
شاعرِ نغز گوئے خوش گفتار

رزم کی داستاں اگر سنیے — ہے زباں میری تیغِ جوہر دار
بزم کا التزام گر کیجے — ہے قلم میرا ابرِ گوہر بار
ظلم ہے گر نہ دو سخن کی داد — قہر ہے گر کرو نہ مجھ کو پیار
آپ کا بندہ اور پھروں ننگا — آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ — تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام — شاعری سے نہیں مجھے سروکار

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

قطعات

سیہ گلیم ہوں لازم ہے میرا نام نہ لے — جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہُوا نہ غلبہ میسّر کبھی کسی پہ مجھے — کہ جو شریک ہو میرا شریکِ غالب ہے

سہل تھا مسہل، و لے یہ سخت مشکل آ پڑی — مجھ پہ کیا گزرے گی اتنے روز حاضر بِن ہوئے
تین دن مسہل سے پہلے، تین دن مسہل کے بعد — تین مسہل، تین تبریدیں، یہ سب کَے دن ہوئے

بسکہ فعّالِ مایرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آبِ انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہرِ دہلی کا ذرّہ ذرّۂ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آ سکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا

---

[1] یہ قطعہ اردوئے معلّیٰ کے صفحہ ۳۰۶، ۳۰۹ سے یہاں نقل کیا ہے۔ مطبوعہ دیوانوں میں نہیں پایا جاتا۔

میں نے مانا کہ مل گئے، پھر کیا | وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ | سوزشِ داغ ہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم | ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اِس طرح کے وصال سے یارب
کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

قطعاتِ تاریخ

خجستہ انجمنِ طوے (بیاہ) میرزا جعفر | کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالبؔ | نہ کیوں ہو مادۂ سالِ عیسوی محظوظ ۱۸۵۴ء

ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی | ہوا بزمِ طرب میں رقصِ ناہید
کہا غالبؔ سے تاریخ اس کی کیا ہے | تو بولا "اِنشراحِ جشنِ جمشید" ۱۲

گو ایک بادشاہ کے سب خانہ زاد ہیں | دربار دار لوگ بہم آشنا نہیں
کانوں پہ ہاتھ دھرتے ہیں کرتے ہوئے سلام | ہے اس سے یہ مراد کہ ہم آشنا نہیں

رُباعیات

بعد از اِتمامِ بزمِ عیدِ اطفال ۰ ایّامِ جوانی رہے ساغر کشِ حال
آپہنچے ہیں تا سوادِ اقلیمِ عدم ۰ اے عمرِ گزشتہ، یک قدم استقبال

شب زُلف و رُخِ عرق فشاں کا غم تھا ۰ کیا شرح کروں کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک ۰ { ہر قطرۂ اشک چشم چشمِ نم تھا
ہر قطرۂ اشک دیدۂ پُر نم تھا }

دل تھا کہ جو جانِ دردِ تمہید سہی ۰ بیتابیِ رشک و حسرتِ دید سہی
ہم اور فسردن، اے تجلّی افسوس ۰ تکرار روا، نہیں تو تجدید سہی

ہے خلق حسد قماش لڑنے کے لئے ۰ وحشت کدۂ تلاش لڑنے کے لئے
{ یعنی ہر بار صورتِ کاغذِ باد
مفرد رد خانہ ہو کر جوں کاغذِ باد } ۰ ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کے لئے

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ۰ سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ۰ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

ہر چند کہ دوستی میں کامل ہونا — ممکن نہیں یک زبان و یک دل ہونا
میں تجھ سے اور مجھ سے تو پوشیدہ — ہے مفت نگاہ کا مقابل ہونا

سامانِ ہزار جستجو یعنی دل — ساغر کشِ خونِ آرزو یعنی دل
پُشت و رُخِ آئینہ ہے دین و دنیا — منظور ہے دو جہاں سے تو یعنی دل

اے کاش بتاں کا خنجرِ سینہ شگاف — پہلوئے حیات سے گزر جاتا صاف
اک تسمہ لگا رہا کہ تا روزے چند — ہے منتِ مشقتِ گدائی سے معاف

اے کثرتِ فہمِ بے شمار اندیشہ — ہے اصلِ خرد سے شرمسار اندیشہ
یک قطرۂ خون و دعوتِ صد نشتر — یک وہم و عبادتِ ہزار اندیشہ

دل سوزِ جنوں سے جلوہ منظر ہے آج — نیرنگِ زمانہ فتنہ پرور ہے آج
یک تارِ نفس ہیں جوں طنابِ صناع — ہر پارۂ دل برنگِ دیگر ہے آج

گر جوہرِ امتیاز ہوتا ہم میں — رسوا کرتے نہ آپ کو عالم میں
ہیں نام و نگیں کمیں گہ نقبِ شعور — یہ چور پڑا ہے خانۂ خاتم میں

آتش بازی ہے جیسے شغلِ اطفال — ہے سوزِ جگر کا بھی اسی طور کا حال
تھا موجدِ عشق بھی قیامت کوئی — لڑکوں کے لئے گیا ہے کیا کھیل نکال

؎ یہ رباعیاں مروجہ دیوان سے نقل کی گئی ہیں قلمی نسخہ میں ان کا کوئی شعر موجود نہیں پایا جاتا۔

دل سخت نژند ہو گیا ہے گویا
اُس سے گلہ مند ہو گیا ہے گویا
پر یار کے آگے بول سکتے ہی نہیں
غالبؔ مُنہ بند ہو گیا ہے گویا

دُکھ جی کے پسند ہو گیا ہے غالبؔ
دل رُک رُک کر بند ہو گیا ہے غالبؔ
واللہ کہ شب کو نیند آتی ہی نہیں
سونا سوگند ہو گیا ہے غالبؔ

بھیجی ہے جو مجھ کو شاہِ جم جاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال

ہیں شہ میں صفاتِ ذوالجلالی باہم
آثارِ جلالی و جمالی باہم
ہوں شاد نہ کیوں سافل و عالی باہم
ہے اب کی شبِ قدر و دیوالی باہم

حق شہ کی بقا سے خلق کو شاد کرے
تا شاہ شیوعِ دانش و داد کرے
یہ دی جو گئی ہے رشتۂ عمر میں گانٹھ
ہے صفر کہ افزائشِ اعداد کرے

اس رشتہ میں لاکھ تار ہوں بلکہ سوا
اتنے ہی برس شمار ہوں بلکہ سوا
ہر سیکڑہ کو ایک گرہ فرض کریں
ایسی گرہیں ہزار ہوں بلکہ سوا

کہتے ہیں کہ اب وہ مردم آزار نہیں
عُشّاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں
جو ہاتھ کہ ظُلم سے اُٹھایا ہو گا
کیونکر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں

ہم گرچہ بنے سلام کرنے والے
کرتے ہیں درنگ کام کرنے والے
کہتے ہیں، کہیں خدا سے، اللہ اللہ
وہ آپ ہیں صبح و شام کرنے والے

سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مِرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خس خانہ و برف آب کہاں سے لاؤں

ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہِ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزہ کی تسبیح کے ہیں یہ دانے

نوکِ قلم :- محمد اقبال عباسی خوش نویس لاہور

ضمیمہ

دیوانِ غالب

مرزا غالب کے وہ اشعار، غزلیات، رباعیات، قطعات اور قصائد جو مروّجہ مطبوعہ دیوانوں میں شامل نہیں ہیں :۔

(۱) غزل مندرجہ صفحہ ۹۹ کا ایک شعر ؎

پیٹھ محراب کی قبلے کی طرف رہتی ہے | محو نسبت ہیں، تکلف ہمیں منظور نہیں

(۲) غزل مندرجہ صفحہ ۱۰۹ کے دو شعر ؎

طاقتِ رنجِ سفر ہی نہیں پاتے اتنی | ہجرِ یارانِ وطن کا بھی الم ہے ہم کو

لائی ہے معتمد الدولہ بہادر کی امید | جادۂ رہ، کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

(۳) غزل مندرجہ ۱۷۰ کا ایک اور مطلع ؎

وہ بات چاہتے ہیں کہ جو بات چاہیے | صاحب کے ہم نشیں کو کرامات چاہیے

(۴) غزل مندرجہ صفحہ ۱۸۴ کے دو شعر ؎

اے بے خبراں میرے لبِ زخمِ جگر پر | بخیہ جسے کہتے ہو شکایت ہے رفو کی

گو زندگیٔ زاہدِ بے چارہ عبث ہے | اتنا ہے کہ رہتی تو ہے تدبیر وضو کی

ذیل کا قطعہ مروجہ دیوانوں میں درج ہے لیکن زیرِ نظر دیوان میں درج ہونے سے رہ گیا تھا۔

قطعہ (۱)

ہے چار شنبہ آخرِ ماہِ صفر چلو | رکھ دیں چمن میں بھر کے مے مشکبو کی ناند

جو آئے جام بھر کے پیئے اور ہو کے مست | سبزے کو روندتا پھرے، پھولوں کو جائے پھاند

غالبؔ، یہ کیا بیاں ہے، بجز مدحِ بادشاہ — بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

بٹتے ہیں سونے روپے کے چھلّے حضور میں — ہے، جن کے آگے سیم و زرِ مہر و ماہ ماند

یوں سمجھیے کہ بیچ سے خالی کیے ہوئے
لاکھوں ہی آفتاب ہیں اور بے شمار چاند

(۲)

اٹھا اک دن بگولا سا جو کچھ، میں جوشِ وحشت میں — پھرا آسیمہ سر، گھبرا گیا تھا جی بیاباں سے

نظر آیا مجھے اک طائرِ مجروح پر بستہ — ٹپکتا تھا سرِ شوریدہ دیوارِ گلستاں سے

کہا میں نے کہ او گمنام، آخر ماجرا کیا ہے؟ — پڑا ہے کام تجھ کو کس ستمگر آفتِ جاں سے؟

ہنسا کچھ کھلکھلا کر پہلے، پھر مجھ کو جو پہچانا — تو یہ رویا کہ جوئے خوں بہی پلکوں کے داماں سے

کہا، میں صید ہوں اس کا کہ جس کے دامِ گیسو میں — پھنسا کرتے ہیں طائر روز آ کر باغِ رضواں سے

اسی کے زلف و رخ کا دھیان ہے شام و سحر مجھ کو — نہ مطلب کفر سے ہے، اور نہ ہے کچھ کام ایماں سے

بچشمِ غور جو دیکھا، مرا ہی طائرِ دل تھا
کہ جل کر ہو گیا یوں خاک، میری آہِ سوزاں سے

(۳)

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس — یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب؟

بال و پر دو چار دکھلا کر، کہا صیاد نے — 'یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب'

(۴)

مسلمانوں کے میلوں کا ہوا قُل
نتیجے ہے جوگ مایا اور دیبی
نشاں باقی نہیں اب سلطنت کا
مگر، ہاں، نام کو اورنگ زیبی

(۵)

جب[1] کہ سیّد غلام بابا نے | مسندِ عیش پر جگہ پائی
ایسی رونق ہوئی برات کی رات | کہ کواکب ہوئے تماشائی

(۶)

اس[2] کتابِ طرب نصاب نے جب | آب و تاب انطباع کی پائی
فکرِ تاریخ سال میں، مجھکو | ایک صورت نہیں نظر آئی
ہندسے پہلے سات سات کے دو | دیے ناگاہ مجھکو دکھلائی
اور پھر ہندسہ تھا بارہ کا | باہزاراں ہزار زیبائی
سالِ ہجری تو ہو گیا معلوم | بے شمولِ عبارت آرائی
مگر اب ذوقِ بذلہ سنجی کو | ہے جداگانہ کارفرمائی
سات اور سات ہوتے ہیں چودہ | باامیدِ سعادت افزائی
غرض اس سے ہیں چاردہ معصوم | جس سے ہے چشمِ جاں کو زیبائی
اور بارہ امام ہیں بارہ | جن سے ایماں کو ہے توانائی

ان کو، غالب، یہ سال اچھا ہے
جو ائمہ کے ہیں تولائی

(۷)

ہندوستان کی بھی عجب سرزمین ہے | جس میں وفا و مہر و محبت کا ہے وفور

---

[1] نواب سید غلام باباخاں رئیسِ سورت۔ یہی قطعہ بحر تبدیل کر کے کہا ہے
ہزار شکر کہ سید غلام بابا نے | فرازِ مسندِ عیش و طرب جگہ پائی
زمیں پہ ایسا تماشا ہوا برات کی رات | کہ آسماں پہ کواکب بنے تماشائی

[2] تذکرہ "سراپا سخن" کا قطعہ تاریخ ہے۔ جو ۱۲۷۷ھ میں طبع ہوا۔

جیسا کہ آفتاب نکلتا ہے شرق سے
اخلاص سے ہوا ہے اسی ملک سے ظہور

ہے اصل تخم ہند سے، اور اس زمین سے
پھیلا ہے سب جہان میں یہ میوہ دور دور

(۸)

گڑگانویں کی ہے جتنی رعیت وہ یک قلم
عاشق ہے اپنے حاکم عادل کے نام کی

سو یہ نظر فروز قلمدان نذر ہے
مسٹر کوواں[1] صاحبِ عالی مقام کی

(۹)

سلیم[2] خان کہ وہ نورِ چشم و اصل خاں
حکیم حاذق و دانا ہے، وہ لطیف کلام

تمام دہر میں اس کے مطب کا چرچا ہے
کسی کو یاد بھی لقمان کا نہیں ہے نام

اُسے فضائلِ علم و ہنر کی افزائش
ہوئی ہے، مبدعِ عالم سے، اس قدر انعام

کہ بحثِ علم میں، اطفالِ ابجدی اس کے
ہزار بار فلاطوں کو دے چکے الزام

عجیب نسخۂ نادر، لکھا ہے، ایک اس نے
کہ جس میں حکمت و طب ہی کے مسئلے ہیں تمام

نہیں کتاب، ہے اک منبعِ نکاتِ بدیع
نہیں کتاب، ہے اک معدنِ جواہرِ کام

کل اس کتاب کے سالِ تمام میں جو مجھے
کمال فکر میں دیکھا، خرد نے، بے آرام

کہا یہ جلا کہ، تو اس میں سوچتا کیا ہے؟
لکھا ہے نسخۂ تحفہ، یہی ہے سالِ تمام

۱۲۸۹ھ

---

[1] مسٹر کوواں اسسٹنٹ کمشنر گوڑگاؤں کی تبدیلی کے موقع پر لوگوں نے انھیں چاندی کا ایک قلمدان بطور تحفہ پیش کیا تو رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب نے مرزا غالب سے یہ قطعہ قلمدان پر کندہ کرانے کے لیے لکھوایا۔

[2] یہ قطعہ تاریخ حکیم محمد سلیم خان کی کتاب "تکشیفِ حکمت" کے لیے لکھا گیا تھا۔ کتاب کا سالِ اختتام ۱۲۷۹ ہجری (۱۸۶۲ء) ہے۔ کتاب پہلی بار ۱۲۸۵ ہجری میں مطبع نولکشور میں چھپی۔

(۱۰)

خوشی[۱] ہے یہ، آنے کی برسات کے
پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں

سرِ آغازِ موسم میں، اندھے ہیں ہم
کہ دِلّی کو چھوڑیں، لوہارو کو جائیں

سوا ناج کے، جو ہے مقلوبِ جاں
نہ واں آم پائیں، نہ انگور پائیں

وہ کھٹّے، کہاں پائیں، املی کے پھول
وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں

فقط گوشت، سو بھیڑ کا ریشے وار
کہو، اس کو، کیا، کھا کے ہم حظ اٹھائیں

(۱۱)

مقامِ شکر ہے اے ساکنانِ خطّۂ خاک
رہا ہے زور سے، ابرِ ستارہ بار، برس

کہاں ہیں ساقیٔ مہوش، کہاں ہے ابرِ مطیر
'یسار' لائے گلنار گوں، 'یسار' برس

خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درِ حضور پر، اے ابر، بار بار، برس

ہر ایک قطرے کے ساتھ آئے جو ملک وہ کہے
امیر[۲] کلب علی خاں، جئیں ہزار برس

فقط ہزار برس پر کچھ انحصار نہیں
کئی ہزار برس بلکہ بے شمار برس

جنابِ قبلۂ حاجات! اس بلاکش نے
بڑے عذاب سے کاٹے ہیں پانچ چار برس

شفا ہو آپ کو، غالب کو بندِ غم سے نجات
خدا کرے کہ یہ ایسا ہو سازگار برس

(۱۲)

پور[۳] وہ فرزند احمد کو ملا
رحمتِ باری کا جو گنجینہ ہے

سالِ تاریخِ ولادت یوں لکھا
راحتِ جاں ہے، سرورِ سینہ ہے
۱۲۸۳ھ

---

[۱] یہ قطعہ نواب لوہارو کو اُن کی لوہارو آنے کی دعوت کے جواب میں لکھا تھا۔

[۲] نواب کلب علی خاں والیٔ رامپور

[۳] یہ قطعہ صغیر بلگرامی کے بیٹے کی ولادت کی تاریخ میں ہے۔

(۱۳۱)

ہند میں اہلِ تسنن کی ہیں دو سلطنتیں
حیدر آباد دکن، رشکِ گلستانِ ارم

رامپور، اہلِ نظر کی ہے، نظر میں وہ شہر
کہ جہاں ہشت بہشت آ کے ہوئے ہیں باہم

حیدر آباد بہت دور ہے، اس ملک کے لوگ
اُس طرف کو نہیں جاتے ہیں، جو جاتے ہیں تو کم

رامپور آج وہ ہے بقعۂ معمور کہ ہے
مرجع و مجمعِ اشرافِ نژادِ آدم

رامپور ایک بڑا باغ ہے، از روئے مثال
دل کش و تازہ و شاداب و وسیع و خرم

جس طرح باغ میں ساون کی گھٹائیں برسیں
ہے اسی طور پہ یاں، دجلہ فشاں دستِ کرم

ابرِ دستِ کرمِ کلبِ علی خاں سے مدام
دُرِ شہوار ہیں جو گرتے ہیں قطرے پیہم

صبحدم باغ میں آ جائے، جسے ہو نہ یقیں
سبزہ و برگِ گل و لالہ پہ دیکھے شبنم

حبذا باغِ ہمایونِ تقدس آثار
کہ جہاں چرنے کو آتے ہیں غزالانِ حرم

مسلکِ شرع کے ہیں، راہرو و راہ شناس
خضر بھی یاں اگر آ جائے، تو لے ان کے قدم

مدح کے بعد دعا چاہیے اور اہلِ سخن
اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم

حق سے کیا مانگیے ان کے لیے، جب ہو موجود
ملک و گنجینہ و خیل و سپہ و کوس و علم

ہم نہ تبلیغ کے مائل، نہ غلو کے قائل
دو دعائیں ہیں، کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم

یا خدا غالبِ عاصی کے خداوند کو دے
دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم

اولاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ امم

مثنویات

(۱)

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی[1] لے کے دل، سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا، اے دل، ہوائے دلبراں بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں
پیچ میں اس کے نہ آنا، زینہار یہ نہیں ہیں گے کسی کے یارِ غار
گورے پنڈے پر، نہ، ان کے کر نظر کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی ان سے تیری سانٹھ لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے قہر ہے دل اُن سے اُلجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے بھول مت اس پر، اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو اڑا دیں گے کہیں مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں
دل نے سن کر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب غوطے میں جا کر، دیا کٹ کر جواب

رشتۂ در گردنم افگندہ دوست
می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست

(۲)

(پنج آہنگ کا منظوم اشتہار)

مژدہ اے رہروانِ راہِ سخن پایہ سنجانِ دست گاہِ سخن
طے کرو راہِ شوق زود از زود آن پہنچی ہے منزلِ مقصود

---

[1] مرزا غالب نے یہ مثنوی ۹ سال کی عمر میں اکبر آباد (آگرہ) میں لکھی تھی جبکہ پتنگ بازی کا شوق زوروں پر تھا

پاس ہے اب سوادِ اعظمِ نثر — دیکھیے، چل کے نظمِ عالمِ نثر
سب کو اُس کا سواد ارزانی — چشمِ بینش ہو جس سے نورانی
یہ تو دیکھو کہ کیا نظر آیا — جلوۂ مدعا نظر آیا
ہاں یہی شاہراہِ دہلی ہے — مطبعِ بادشاہِ دہلی ہے
منطبع ہو رہی ہے پنج آہنگ — گل و ریحان و لالہ رنگا رنگ
ہے یہ وہ گلشنِ ہمیشہ بہار — بار ور جس کا سرو، گُل بے خار
نہیں، اس کا جواب عالم میں — نہیں، ایسی کتاب عالم میں
اس سے اندازِ شوکتِ تحریر — اخذ کرتا ہے آسماں کا دبیر
مرحبا طرزِ نغز گفتاری — حبذا رسم و راہ نثاری
نثرِ مدحت سرائے ابراہیم — ہے معتبر جواب بے تعلیم
اس کے فقروں میں کون آتا ہے — کیا کہیں، کیا وہ راگ گاتا ہے
تین نثروں سے کام کیا نکلے — ان کے پڑھنے سے نام کیا نکلے
ورزشِ قصہ کہن کب تک — داستانِ شہ و کن کب تک
تا کجا درسِ نثر ہائے کہن — تازہ کرتا ہے دل کو، تازہ سخن
تھے ظہوری و عرفی و طالب — اپنے اپنے زمانے میں غالب
نہ ظہوری ہے اور نہ طالب ہے — اسد اللہ خاں غالب ہے
قول حافظ کا ہے بجائے دوست — ہر کرا پنج روزہ نوبتِ اوست
کل وہ سرگرم خود نمائی تھے — شمعِ بزمِ سخن سرائی تھے
آج یہ قدر دانِ معنی ہے — بادشاہِ جہانِ معنی ہے
نثر اس کی ہے کارنامۂ راز — نظم اس کی، نگار نامۂ راز
دیکھو اس دفترِ معانی کو — سیکھو آئینِ نکتہ دانی کو

اس سے جو کوئی بہرہ ور ہوگا — سینہ گنجینۂ گہر ہوگا
ہو سخن کی جسے طلبگاری — کرے اس نسخے کی خریداری
آج جو دیں ور کرے درخواست — تین بھیجے رُپے وہ بے کم و کاست
منطبع جب کہ ہو چکے گی کتاب — زرِ قیمت کا ہوگا اور حساب
چار سے پھر نہ ہوگی کم قیمت — اس سے لیویں گے کم، نہ ہم قیمت
جس کو منظور ہو کہ زر بھیجے — احسن اللہ خاں کے گھر بھیجے
وہ بہارِ ریاضِ عہد و وفا — جس کو کہتے ہیں عمدۃ الحکما
میں جو ہوں درپئے حصولِ شرف — نام عاصی کا ہے غلام نجف
ہے یہ القصہ حاصلِ تحریر — کہ نہ ارسالِ زر میں ہو تاخیر

چشمۂ انصباح جاری ہے
ابتدائی ورق شماری ہے

(۳)

قادر نامہ (امیر خسرو کی خالق باری کے جواب میں)

قادر، اللہ اور یزداں، ہے خدا — ہے، نبی، مرسل، پیمبر، رہنما
پیشوائے دیں کو کہتے ہیں، امام — وہ رسول اللہ کا قائم مقام
ہے صحابی دوست، خالص ناب ہے — جمع اس کی یاد رکھ اصحاب ہے
بندگی کا ہاں عبادت نام ہے — نیک بختی کا سعادت نام ہے
کھولنا افطار ہے، اور روزہ صوم — لیل یعنی رات، دن اور روز یوم
ہے صلوٰۃ اے مہرباں اسمِ نماز — جس کے پڑھنے سے ہو راضی بے نیاز
جانماز اور پھر مصلّا ہے وہی — اور سجادہ بھی گویا ہے وہی
اسم وہ ہے جس کو تم کہتے ہو نام — کعبہ، مکّہ جو کہ ہے بیت الحرام

گرد پھرنے کو کہیں گے ہم طواف — بیٹھ رہنا گوشے میں ہے اعتکاف

پھر فلک، چرخ اور گردوں اور سپہر — آسماں کے نام ہیں اے رشکِ مہر

مہر سورج، چاند کو کہتے ہیں ماہ — ہے محبت مہر، لازم ہے نباہ

غرب پچھم، اور پورب شرق ہے — ابر بدلی اور بجلی برق ہے

آگ کا آتش اور آذر نام ہے — اور انگارے کا اخگر نام ہے

تیغ کی ہندی اگر تلوار ہے — فارسی پگڑی کی بھی دستار ہے

نیولا راسو ہے، اور طاؤس مور — کبک کو ہندی میں کہتے ہیں چکور

خُم ہے مٹکا اور ٹھلیا ہے سبُو — آب پانی، بحر دریا، نہر، جُو

چاہ کو ہندی میں کہتے ہیں کنواں — دُود کو ہندی میں کہتے ہیں دھواں

دُودھ جو پینے کا ہے وہ شیر ہے — طفل لڑکا اور بوڑھا پیر ہے

سینہ چھاتی، دست ہاتھ، اور پاے پاؤں — شاخ ٹہنی، برگ پتا، سایہ چھاؤں

ماہ چاند، اختر ہیں تارے، رات شب — دانت دنداں، ہونٹ کو کہتے ہیں لب

استخواں ہڈی ہے، اور ہے پوست کھال — سگ ہے کتا، اور گیدڑ ہے شغال

تل کو کنجد، اور رُخ کو گال کہہ — گال پر جو تل ہے اس کو خال کہہ

کیکڑا سرطاں ہے، کچھوا سنگ پشت — ساق پنڈلی فارسی مٹھی کی مشت

ہے شکم پیٹ اور بغل آغوش ہے — کہنی آرنج اور کندھا دوش ہے

ہندی میں عقرب کا بچھّو نام ہے — فارسی میں بھوں کا ابرو نام ہے

ہے وہی کژدُم جسے عقرب کہیں — نیش ہے وہ، ڈنک جس کو سب کہیں

ہے لڑائی حرب اور جنگ ایک چیز — کعب ٹخنا اور شتالنگ ایک چیز

ناک بینی، پرّہ نتھنا، گوش کان — کان کی لو نرمہ ہے، اے مہربان

چشم ہے آنکھ اور مژگاں ہے پلک — آنکھ کی پتلی کو کہیے مردمک

منہ پہ گر جھُرّی پڑے اژنگ جان | فارسی چھلکے کی تو ہے آونگ جان
مسّا آژخ اور چھالا آبلہ | اور ہے دائی جَنائی قابلہ
اونٹ اُشتر اور اُشغر سیہ ہے | گوشت ہے لحم اور چربی پیہ ہے
ہے زنخ ٹھوڑی، گلا ہے حنجرہ | سانپ ہے مار، اور جھینگیر زنجرہ
ہے زنخ ٹھوڑی، ذقن بھی ہے وہی | خاد ہے چیل اور زغن بھی ہے وہی
پھر غلیواز اس کو کہیے جو ہے چیل | چیونٹی ہے مور اور ہاتھی ہے پیل
لومڑی روباہ اور آہو ہرن | شمس سورج اور شعاع اس کی کرن
اسپ جب ہندی میں گھوڑا نام پائے | تازیانہ کیوں نہ کوڑا نام پائے
گربہ بلّی، موش چوہا، دام جال | رشتہ تاگا، جامہ کپڑا، قحط کال
خر گدھا، اور اس کو کہتے ہیں اُلاغ | دیگ واں چولھا، جسے کہیے اجاغ
ہندی چڑیا، فارسی کنجشک ہے | میگنی جس کو کہیں وہ پشک ہے
تابہ ہے بھائی، توے کی فارسی | اور تنہو ہے لوے کی فارسی
نام مکڑی کا کلاش اور عنکبوت | کہتے ہیں مچھلی کو ماہی اور حوت
پشہ مچھر اور مکھی ہے مگس | آشیانہ گھونسلا، پنجرہ قفس
بھیڑیا گرگ اور بکری گوسفند | میش کا ہے نام بھیڑ اے خود پسند
نام گل کا پھول، شبنم اوس ہے | جس کو نقارہ کہیں وہ کوس ہے
سقف چھت ہے، سنگ پتھر، اینٹ خشت | جو بُرا ہے اس کو ہم کہتے ہیں زشت
خار کانٹا، داغ دھبّا، نغمہ راگ | سیم چاندی، مس ہے تانبا، بخت بھاگ
زر ہے سونا، اور زرگر ہے سُنار | موز کیلا اور ککڑی ہے خیار
ریش داڑھی، موچھ سَبلَت اور بروت | احمق اور نادان کو کہتے ہیں اُوت
زندگانی ہے حیات اور مرگ موت | شوے خاوند، اور ہے انباغ سَوت

جملہ سب اور نصف آدھا، ربع پاؤ — صرصر آندھی، سیل نالا، باد باؤ
ہے جراحت اور زخم اور گھاؤ ریش — بھینس کو کہتے ہیں بھائی گاؤمیش
ہفت سات، اور ہشت آٹھ اور بست بیس — سی اگر کہیے تو ہندی اس کو تیس
ہے چہل چالیس، اور پنجہ پچاس — ناامیدی یاس اور امید آس
دوش کل کی رات اور امروز آج — آرد آٹا اور غلہ ہے اناج
چاہیے ہے ماں کو مادر جاننا — اور بھائی کو برادر جاننا
پھاوڑا ایل اور درانتی داس ہے — فارسی کاہ اور ہندی گھاس ہے
سبز ہو جب تک اسے کہیے گیاہ — خشک ہو جاتی ہے تب کہتے ہیں کاہ
چکسہ پڑیا، کیسے کا تھیلی ہے نام — فارسی میں دھپے کا سیلی ہے نام
اُغلگند و جھنجھنا، نیرو ہے زور — بادفر پھرکی ہے اور ہے دُزد چور
انگبیں، شہد اور عسل ہے اے عزیز — نام کو ہیں تین، پر ہے ایک چیز
آجل اور آروغ کی ہندی ڈکار — مے شراب اور پینے والا مے گسار
روئی کو کہتے ہیں پنبہ سن رکھو — آم کو کہتے ہیں انبہ سن رکھو
خانہ گھر ہے، اور کوٹھا بام ہے — قلعہ دِژ، کھائی کا خندق نام ہے
ہے بنولا پنبہ دانہ، لا کلام — اور تربز، ہندوانہ لا کلام
گر دریچہ فارسی کھڑکی کی ہے — سرزنش بھی فارسی جھڑکی کی ہے
ہے کہانی کی فسانہ فارسی — اور شعلے کی زبانہ فارسی
نعل در آتش اسی کا نام ہے — جو کہ بے چین اور بے آرام ہے
پست اور ستو کو کہتے ہیں سویق — ژرف اور گہرے کو کہتے ہیں عمیق
تار تانا، پود بانا، یاد رکھ — آزمودن آزمانا یاد رکھ
بوسہ چمّی، چاہنا ہے خواستن — کم ہے اندک اور گھٹانا کاستن

خوش رہو، ہنسنے کو خندیدن کہو — گر ڈرو، ڈرنے کو ترسیدن کہو

ہے ہراسیدن بھی ڈرنا، کیوں ڈرو — اور جنگیدن ہے لڑنا، کیوں لڑو

ہے گزرنے کی گزشتن فارسی — اور پھرنے کی ہے گشتن فارسی

وہ سرودن ہے، جسے گانا کہیں — ہے وہ آوردن جسے لانا کہیں

زیستن کو جانِ من! جینا کہو — اور نوشیدن کو تم پینا کہو

دوڑنے کی فارسی ہے تاختن — کھیلنے کی فارسی ہے باختن

دوختن سینا، دریدن پھاڑنا — کاشتن بونا ہے، رُفتن جھاڑنا

کاشتن بونا ہے، اور کشتن بھی ہے — کاتنے کی فارسی رِشتن بھی ہے

ہے ٹپکنے کی چکیدن فارسی — اور سُننے کی شنیدن فارسی

کودنا جستن، بریدن کاٹنا — اور لیسیدن کی ہندی چاٹنا

دیکھنا دیدن، رمیدن بھاگنا — جان لو، بیدار بودن جاگنا

آمدن آنا، بنانا ساختن — ڈالنے کی فارسی، انداختن

سوختن جلنا، چمکنا تافتن — ڈھونڈنا جُستن ہے، پانا یافتن

باندھنا بستن، کشادن کھولنا — داشتن رکھنا ہے، سنجتن تولنا

تولنے کو اور سنجیدن کہو — پھر خفا ہونے کو رنجیدن کہو

فارسی سونے کی خفتن جانیے — منہ سے کچھ کہنے کو گفتن جانیے

کھینچنے کی ہے کشیدن فارسی — اور اُگنے کی دمیدن فارسی

اونگھنا پوچھو، غنودن جان لو — مانجھنا چاہو، زدودن جان لو

ہے قلم کا فارسی میں خامہ نام — ہے غزل کا فارسی میں چامہ نام

کس کو کہتے ہیں غزل ارشاد ہو
ہاں غزل پڑھئے سبق گر یاد ہو

غزل

صبح سے دیکھیں گے رستا یار کا
جمعہ کے دن، وعدہ ہے دیدار کا

وہ چرا دے باغ میں میوہ جسے
پھاند جانا، یاد ہو، دیوار کا

پل ہی پر سے پھیر لائے ہم کو لوگ
ورنہ تھا اپنا ارادہ پار کا

شہر میں چھڑیوں کے میلے کی ہے بھیڑ
آج، عالم اور ہے، بازار کا

لال ڈگی پر کرے گا جا کے کیا
پل پہ چل، ہے آج ’دن، اتوار کا

گر نہ ڈر جاؤ، تو دکھلاؤں تمہیں
کاٹ، اپنی کاٹھ کی تلوار کا

واہ بے، لڑکے پڑھی اچھی غزل
شوق ابھی سے ہے تجھے اشعار کا

لو سنو کل کا سبق آ جاؤ تم
پوزی افسار اور دمچی پار دُم

چھلنی کو غربال، پرویزن کہو
چھید کو تم رخنہ اور روزن کہو

چپ کے معنی کیا، چگوئیم، کیا کہوں
می شوم خاموش، میں چپ ہو رہوں

باز خواہم رفت، میں پھر جاؤں گا
نان خواہم خورد، روٹی کھاؤں گا

فارسی کیوں کی، چرا ہے یاد رکھ
اور گھنٹا لا درا ہے یاد رکھ

دشت، صحرا اور جنگل ایک ہے
پھر سہ شنبہ اور منگل ایک ہے

جس کو ناداں کہئے، وہ انجان ہے
فارسی بیگن کی بادنجان ہے

جس کو کہتے ہیں جمائی فازہ ہے
جو ہے انگڑائی وہی خمیازہ ہے

بارہ کہتے ہیں کڑے کو ہم سے پوچھ
پاڑ ہے نالار، ایک عالم سے پوچھ

جس طرح گہنے کی زیور فارسی
اُس طرح ہنسلی کی پر گرفارسی

بھڑ کی بھائی، فارسی زنبور ہے
وسپنا انبر ہے اور انبور ہے

فارسی آئینہ، ہندی آرسی
اور ہے کنگھے کی شانہ فارسی

ہینگ انگوزہ ہے، اور ارزیر رانگ
ساز باجا اور ہے آواز بانگ

زوجہ جورو، یزنہ بہنوئی کو جان
خشم غصہ اور بدخوئی کو جان

لوہے کو کہتے ہیں آہن اور حدید
جو نئی ہو چیز، اسے کہیے جدید

ہے نوا آواز، ساماں اور اُول
نرخ، قیمت اور بہا یہ سب ہیں مول

سیر لہسن، تُرب مولی، ترّہ ساگ
کھا، بخُر، برخیز اُٹھ، بگریز بھاگ

روئی کی پونی کا ہے، پاغند نام
دُوک تکلے کو کہیں گے لا کلام

گیتی اور گیہاں ہے دنیا یاد رکھ
اور ہے نداف دھنیا یاد رکھ

کوہ کو ہندی میں کہتے ہیں پہاڑ
فارسی گلخن ہے اور ہندی ہے بھاڑ

تکیہ بالش اور بچھونا بسترا
اہل بستر ہے، سمجھ لو تم ذرا

بسترا بوہیں، سپاہی اور فقیر
ورنہ بستر کہتے ہیں برنا و پیر

پیر بوڑھا اور برنا ہے جواں
جان کو البتہ کہتے ہیں رُواں

اینٹ کے گارے کا نام آژند ہے
ہے نصیحت بھی وہی جو پند ہے

پند کو اندرز بھی کہتے ہیں، ہاں
ارض ہے، پر مرز بھی کہتے ہیں، ہاں

کیا ہے ارض اور مرز تم سمجھے، زمین
عُنق گردن، اور پیشانی جبیں

آس چکی، آسیا مشہور ہے
اور فوفل چھالیہ مشہور ہے

بانسلی نَے، اور جلاجل جھانجھ ہے
پھر سُتُروَن اور عقیمہ بانجھ ہے

کُحل سرمہ اور سلائی مِیل ہے
جس کو جھولی کہیے وہ زنبیل ہے

پایا قادر نامے نے آج اختتام
اک غزل تم اور پڑھ لو والسّلام

غزل

شعر کے پڑھنے میں کچھ حاصل نہیں
مانتا، لیکن ہمارا دل نہیں

علم ہی سے قدر ہے انسان کی
ہے وہی انسان، جو جاہل نہیں

کیا کہیں کھائی ہے حافظ جی کی مار
آج ہنستے آپ جو کھل کھل نہیں

کس طرح پڑھتے ہو رُک رُک کر سبق
ایسے پڑھنے کا تو میں قائل نہیں

جس نے قادر نامہ سارا پڑھ لیا
اُس کو آمد نامہ کچھ مشکل نہیں

(۴)

(مسٹر مکلوڈ گورنر پنجاب جو لارڈ منٹگمری کے مستعفی ہونے پر گورنر پنجاب مقرر ہوئے)

اے جہاں آفریں، خدائے کریم
صانعِ ہفت چرخ و ہفت اقلیم

نام مکلوڈ جن کا ہے مشہور
یہ ہمیشہ بصد نشاط و سرور

عمر و دولت سے شادمان رہیں
اور غالب پہ مہربان رہیں

قصائد

(۱)

(یہ قصیدہ مسٹر ایلن برون کے یہاں بیٹا پیدا ہونے پر منشی شونارائن نے لکھوایا تھا)

مِلاذِ کشور و لشکر پناہِ شہر و سپاہ
جنابِ عالیٔ ایلن برون والا جاہ

بلند رتبہ وہ حاکم، وہ سرفراز امیر
کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرفِ کلاہ

وہ محض رحمت و رافت کہ بہرِ اہلِ جہاں
نیابتِ دمِ عیسیٰ کرے ہے، جس کی نگاہ

وہ عینِ عدل کہ دہشت سے جس کی پرسش کی
بنے ہے شعلۂ آتش، انیسِ پرّۂ کاہ

زمیں سے سودہ گوہر اٹھے بجائے غبار
جہاں ہو، توسنِ حکمت کا اس کے جولاں گاہ

وہ مہرباں ہو، تو انجم کہیں، الٰہی شکر
وہ خشمگیں ہو، تو گردوں کہے خدا کی پناہ

یہ اس کے عدل سے، اضداد کو ہے آمیزش
کہ دشت و کوہ کے اطراف میں بہر سر راہ

ہنر بر پنجے سے لیتا ہے کام شانے کا
کبھی جو ہوتی ہے الجھی ہوئی، دمِ روباہ

نہ آفتاب، ولے آفتاب کا ہم چشم
نہ بادشاہ، ولے مرتبے ہیں ہمسرِ شاہ

خدا نے اس کو دیا ایک خوب رو فرزند
ستارہ جیسے چمکتا ہوا بہ پہلوئے ماہ

زہے ستارۂ روشن، کہ جو اسے دیکھے
شعاعِ مہرِ درخشاں ہو، اس کا تارِ نگاہ

خدا سے ہے یہ توقع کہ عہدِ طفلی میں
بنے گا شرق سے تا غرب اس کا بازی گاہ

جوان ہو کے کرے گا یہ، وہ جہاں بانی
کہ تابع اس کے ہوں روز و شب سپید و سیاہ

کہے گی خلق اسے داورِ سپہر شکوہ
لکھیں گے لوگ اسے خسروِ ستارہ سپاہ

عطا کرے گا خداوندِ کارساز اسے
روانِ روشن و خوئے خوش و دلِ آگاہ

ملے گی اس کو وہ عقلِ نہفتہ داں کہ اسے
پڑے نہ، قطعِ خصومت میں، احتیاجِ گواہ

یہ، ترکتاز سے برہم کرے گا کشورِ روس
یہ لے گا بادشہِ چیں سے، چھین تخت و کلاہ

سنینِ عیسوی اٹھارہ سو اور اٹھاون
یہ چاہتے ہیں جہاں آفریں سے شام و پگاہ

یہ جتنے سینکڑے ہیں سب ہزار ہو جاویں
دراز اس کی ہو عمر اس قدر، سخن کوتاہ

امیدوارِ عنایات، شیو نارائن
کہ آپ کا ہے نمک خوار اور دولت خواہ

یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں عزّ و جاہ کے ساتھ
تمھیں اور اس کو سلامت رکھے سدا، اللہ

---

(۲)

(یہ قصیدہ راجہ شیودان سنگھ والیٔ الور کی بیسویں سالگرہ کے جشن کے موقع پر غالبؔ ۱۸۶۳ء میں لکھا گیا تھا)

گنی ہیں سال کے رشتے میں بیس بار گرہ
ابھی حساب میں باقی ہیں، سو ہزار گرہ

گرہ کی ہے یہی گنتی کہ تا بہ روزِ شمار
ہوا کرے گی ہر اک سال پیش کار، گرہ

یقین جان، برس گانٹھ کا جو ہے تاگا
یہ کہکشاں ہے کہ ہیں اس میں بے شمار گرہ

گرہ سے اور گرہ کی اُمید کیوں نہ بڑھے
کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں، تین چار گرہ

دکھا کے رشتہ کسی جوتشی سے پوچھا تھا
کہ دیکھ کتنی اٹھا لائے گا یہ تار، گرہ

کہا کہ چرخ پہ ہم نے گنی ہیں نو گرہیں
جو یاں گنیں گے تو پائیں گے نو ہزار گرہ

خود آسماں ہے ہمارا راؤ راجہ پر صدقے
کرے گا سینکڑوں، اس تار پر نثار گرہ

وہ راؤ راجہ بہادر کے حکم سے جن کے
رواں ہو تار بہ فی الفور دانہ وار گرہ

انھیں کی سالگرہ کے لیے ہے سال بسال
کہ لائے غیب سے غنچوں کی نوبہار گرہ

انھیں کی سال گرہ کے لیے بناتا ہے
ہوا میں بوند کو، ابرِ تگرگ بار گرہ

انھیں کی سالگرہ کی یہ شادمانی ہے
کہ ہو گئے ہیں گہر ہائے شاہوار گرہ

انھیں کی سالگرہ کے لیے ہے یہ توقیر
کہ بن گئے ہیں ثمر ہائے شاخسار گرہ

سُن اے ندیم، برس گانٹھ کے یہ تاگے نے
تجھے بتاؤں کہ کیوں کی ہے اختیار، گرہ

پئے دعائے بقائے جنابِ فیض مآب
لگے گی اس میں ثوابت کی، استوار گرہ

ہزار دانے کی تسبیح چاہتا ہے، یہی
بلا مبالغہ، درکار ہے ہزار گرہ

عطا کیا ہے خدا نے یہ جاذبہ اس کو
کہ چھوڑتا ہی نہیں رشتہ، زینہار گرہ

کشادہ رُخ نہ پھرے کیوں، جب اس زمانے میں
بچے نہ از پئے بندِ نقابِ یار، گرہ

متاعِ عیش کا ہے قافلہ، چلا آتا
کہ جادہ رشتہ ہے، اور ہے شُتر قطار، گرہ

خدا نے دی ہے وہ، غالبؔ کو دستگاہِ سخن
کروڑ ڈھونڈ کے لاتا یہ خاکسار، گرہ

کہاں مجالِ سخن سانس لے نہیں سکتا | پڑی ہے دل میں مرے غم کی پیچ وار، گرہ
گرہ کا نام لیا، پر نہ کر سکا کچھ بات | زباں تک آکے ہوئی اور استوار گرہ
کھلے یہ گانٹھ تو البتہ دم نکل جائے | بری طرح سے ہوئی ہے گلے کا ہار، گرہ
ادھر نہ ہوگی، تو جبہ حضور کی مجب تک | کبھی کسی سے کھلے گی نہ زینہار، گرہ
دعا یہ ہے کہ مخالف کے دل میں، ازرہِ بغض | پڑی ہے یہ جو بہت سخت نابکار، گرہ

دل اس کا پھوڑ کے نکلے بشکلِ پھوڑے کی
خدا کرے کہ کرے اس طرح ابھار گرہ

(۳)

(یہ قصیدہ نواب یوسف علی خاں بہادر والئ رامپور کے غسلِ صحت کے موقع پر ۱۸۶۴ء یا ۱۸۶۵ء میں پیش کیا گیا تھا)

مرحبا سالِ فرخی آئیں | عیدِ شوال و ماہِ فروردیں
شب و روز، افتخارِ لیل و نہار | ماہ و سال اشرفِ شہور و سنین
گرچہ ہے بعد عید کے نوروز | ایک بیش از سہ ہفتہ، بعد نہیں
سو اس اکیس دن میں، ہولی کی | جا بجا، مجلسیں ہوئیں رنگیں
شہر میں، کو بکو، عبیر و گلال | باغ میں، سو بہ سو، گل و نسریں
شہر، گویا نمونۂ گلزار | باغ، گویا نگارخانۂ چیں
تین تیوہار اور ایسے خوب | جمع ہرگز ہوئے نہ ہوں گے کہیں
پھر ہوئی ہے اسی مہینے میں | منعقد محفلِ نشاط قریں
محفلِ غسلِ صحتِ نواب | رونق افزائے مسندِ تمکیں
بزمگہ میں، امیرِ شاہ نشاں | رزمگہ میں، حریفِ شیرِ کمیں
پیش گاہِ حضور، شوکت و جاہ | خیر خواہِ جناب، دولت و دیں
جن کی مسند کا، آسماں گوشہ | جن کی خاتم کا آفتاب نگیں

جن کی دیوارِ قصر کے نیچے
آسماں ہے گدائے سایہ نشیں

دہر میں اس طرح کی بزم سرور
نہ ہوئی ہو کبھی بروئے زمیں

انجمیں چرخ، گوہر آگیں فرش
نور مے، ماہ ساغرِ سیمیں

راجہ اِندر کا جو اکھاڑا ہے
ہے وہ بالائے سطحِ چرخِ بریں

وہ، نظرگاہِ اہلِ وہم و خیال
یہ ضیا بخشِ چشمِ اہلِ یقیں

واں کہاں، یہ عطا و بذل و کرم
کہ جہاں گدیہ گر کا نام نہیں

یاں زمیں پر نظر جہاں تک جائے
ژالہ آسا، بچھے ہیں دُرِ ثمیں

نغمۂ مطربانِ زہرہ نوا
جلوۂ لولیانِ ماہ جبیں

اس اکھاڑے میں جو کہ ہے مظنون
یاں، وہ دیکھا بچشمِ صورت بیں

سرورِ مہرِ فر ہوا جو سوار
بکمالِ تجمل و تزئیں

سب نے جانا کہ ہے پری، توسن
اور بالِ پری ہے، دامنِ زیں

نقشِ سمِ سمند سے، یکسر
بن گیا، دشت، دامنِ گلچیں

فوج کی گردِ راہ، مشک فشاں
رہروؤں کے مشام عطر آگیں

بسکہ، بخشی ہے فوج کو عزت
فوج کا ہر پیادہ، ہے فرزیں

مرکبِ خاص یوں زمیں پر تھا
جس طرح ہو سپہر پر پرویں

چھوڑ دیتا تھا گور کو بہرام
ران پر داغِ تازہ دیکے، وہیں

اور داغ آپ کی غلامی کا
خاص بہرام کا ہے زیبِ سریں

بندہ پرور، شناطرازی سے
مدعا عرضِ فنِ شعر نہیں

آپ کی مدح اور میرا منہ
گر کہوں بھی، تو آئے کس کو یقیں

اور پھر اب، کہ ضعفِ پیری سے
ہو گیا ہوں نزار و زار و حزیں

پیری و نیستی، خدا کی پناہ
دستِ خالی و خاطرِ غمگیں

صرف، اظہار ہے، ارادت کا ہے قلم کی جو سجدہ ریز جبیں
مدح گستر نہیں دعا گو ہے غالبِ عاجزِ نیاز آگیں

ہے دعا بھی یہی کہ دنیا میں
تم رہو زندہ جاوداں آمیں

(۴)

(یہ قصیدہ مسٹر میکلوڈ لیفٹننٹ گورنر پنجاب کی مدح میں لکھا گیا ہے، لیکن اس میں جس دربار میں نشیب جگہ ملنے کی شکایت ہے وہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے بیان کے مطابق لارڈ کیننگ گورنر جنرل ہند کا دربار آگرہ تھا جو ۲۱ جنوری ۱۸۶۰ء کو منعقد ہوا۔ چونکہ دہلی اس زمانے میں پنجاب میں شامل تھی اور گورنر جنرل کلکتہ میں رہتا تھا اس لیے دربار کا اہتمام لفٹنٹ گورنر پنجاب کے سپرد ہوا ہوگا۔ ورنہ مسٹر میکلوڈ سے شکایت کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی)

کرتا ہے، چرخ روز بصد گونہ احترام فرماں روائے کشورِ پنجاب کو، سلام
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس نوابِ مستطاب، امیرِ شہ احتشام
جمِ رتبہ میکلوڈ بہادر کہ وقتِ رزم ترکِ فلک کے ہاتھ سے، وہ، چھین لے حسام
جس بزم میں کہ ہو وہ نہیں آہنگِ میکشی واں آسمان شیشہ بنے، آفتاب جام
چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چار دہ کہوں دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیالِ خام
دو رات میں، تمام ہے ہنگامہ ماہ کا حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدّوام
سچ ہے، تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے دریائے نور ہے فلکِ آبگینہ فام
میری سنو کہ آج تم اس سرزمین پر حق کے تفضّلات سے ہو مرجعِ انام
اخبارِ لودھیانہ میں میری نظر پڑی تحریر ایک، جس سے ہوا، بندہ تلخ کام
ٹکڑے ہوا ہے، دیکھ کے، تحریر کو جگر کاتب کی آستیں ہے، مگر، تیغ کا نیام

وہ فرد جس میں نام ہے میرا غلط لکھا
جب یاد آگئی ہے، کلیجا لیا ہے تھام

سب صورتیں بدل گئیں، ناگاہ، یک قلم
نمبر رہا، نہ نذر، نہ خلعت کا انتظام

ستر برس کی عمر میں یہ داغ جاں گداز
جس نے، جلا کے راکھ مجھے کر دیا تمام

تھی جنوری مہینے کی تاریخ تیرھویں
استادہ ہو گئے لبِ دریا پہ جب خیام

اس بزمِ پُر فروغ میں، اس تیرہ بخت کو
نمبر ملا نشیب میں، از روئے اہتمام

سمجھا اُسے گراب، ہوا پاش پاش دل
دربار میں جو، مجھ پہ چلی چشمکِ عوام

عزت پہ، اہلِ نام کی ہستی کی ہے بنا
عزت جہاں گئی، تو نہ ہستی رہی، نہ نام

تھا ایک گونہ ناز جو اپنے کمال پر
اُس ناز کا فلک نے لیا مجھ سے انتقام

آیا تھا، وقت ریل کے کھلنے کا بھی قریب
تھا بارگاہِ خاص میں خلقت کا اژدہام

اس کشمکش میں آپ کا مدّاح درد مند
آقائے نامور سے نہ کچھ کر سکا کلام

جو واں نہ کہہ سکا، وہ لکھا ہے حضور کو
دیں آپ میری داد کہ ہوں فائز المرام

ملک و سپہ نہ ہو، تو نہ ہو، کچھ ضرر نہیں
سلطانِ بر و بحر کے در کا ہوں میں، غلام

وکٹوریا کا دہر میں جو، مدح خوان ہو
شاہانِ عصر، چاہیے، ہیں عزت اس کی دام

خود ہے تدارک اس کا، گورنمنٹ کو ضرور
بے وجہ کیوں ذلیل ہو، غالب ہے جس کا نام

امرِ جدید کا، تو نہیں ہے مجھے، سوال
بارے قدیم قاعدے کا، چاہیے، قیام

ہے بندے کو اعادۂ عزت کی آرزو
چاہیں اگر حضور، تو مشکل نہیں یہ کام

دستورِ فنِ شعر یہی ہے، قدیم سے
یعنی، دعا پہ مدح کا، کرتے ہیں اختتام

ہے یہ دعا کہ زیرِ نگیں آپ کے رہے
اقلیمِ ہند و سندھ سے تا ملکِ روم و شام

مرثیہ

(۱)

ہاں اے نفسِ بادِ سحر شعلہ فشاں ہو — اے دجلۂ خوں! چشمِ ملائک سے رواں ہو
اے زمزمۂ قُم، لبِ عیسیٰ پہ فغاں ہو — اے ماتمیانِ شہِ مظلوم کہاں ہو
بگڑی ہے بہت بات، بنائے نہیں بنتی
اب گھر کو بغیر آگ لگائے نہیں بنتی

تابِ سخن و طاقتِ غوغا نہیں ہم کو — ماتم میں شہِ دیں کے ہیں، سودا نہیں ہم کو
گھر پھُونکتے ہیں اپنے، محابا نہیں ہم کو — گر چرخ بھی جل جائے تو پروا نہیں ہم کو
یہ خرگہِ نو پایہ جو مدت سے بپا ہے
کیا خیمۂ شبیر سے رتبے میں سوا ہے

کچھ اور ہی عالم ہے دل و چشم و زباں کا — کچھ اور ہی نقشہ نظر آتا ہے، جہاں کا
کیسا فلک، اور مہرِ جہاں تاب کہاں کا — ہوگا دلِ بے تاب کسی سوختہ جاں کا
اب صاعقہ و مہر میں کچھ فرق نہیں ہے
گرتا نہیں، اس رُو سے کبھو، برق نہیں ہے

سہرا

(۱)

چرخ تک دھوم ہے کس دھوم سے آیا سہرا — چاند کا دائرہ لے، زہرہ نے گایا سہرا
رشک سے لڑتی ہیں، آپس میں اُلجھ کر لڑیاں — باندھنے کیلئے جب سر پہ اٹھایا سہرا

---

(۲)

ہم نشیں تارے ہیں اور چاند شہاب الدین خاں
بزمِ شادی ہے فلک، کاہکشاں ہے سہرا
ان کو لڑیاں نہ کہو، بحر کی موجیں سمجھو
ہے تو کشتی میں ولے بحرِ رواں ہے سہرا

مخمس بر غزلِ ظفر

گھستے گھستے پاؤں میں زنجیر آدھی رہ گئی
مر گئے پر، قبر کی تعمیر آدھی رہ گئی
سب ہی پڑھتا، کاش کیوں تکبیر آدھی رہ گئی
کھینچ کے قاتل، جب تری شمشیر آدھی رہ گئی
غم سے جانِ عاشقِ دلگیر آدھی رہ گئی

بیٹھ رہتا، لیکے جسمِ پُر الم، اس کے روبرو
کیوں کہا تو نے کہ، کہہ دل کا غم اس کے روبرو
بات کرنے میں نکلتا ہے دم اس کے روبرو
کہہ سکے ساری حقیقت کب ہم، اس کے روبرو
ہم نشیں آدھی ہوئی تقریر، آدھی رہ گئی

تو نے دیکھا مجھ پہ کیسی بن گئی اے راز دار
خواب و بیداری پہ کب ہے، آدمی کو اختیار
مثلِ زخم، آنکھوں کو سی دیتا، جو ہوتا اختیار
کھینچتا تھا، رات کو میں خواب میں تصویرِ یار
جاگ اٹھا جو کھینچی تصویر آدھی رہ گئی

غم نے جب گھیرا، تو چاہا ہم نے یوں، اے دلنواز
مستیِ چشمِ سیہ سے چل کے ہوویں چارہ ساز
تو صدائے پا سے جاگا، تھا جو محوِ خوابِ ناز
دیکھتے ہی، اے ستمگر، تیری چشمِ نیم باز
کی تھی پوری ہم نے جو تدبیر آدھی رہ گئی

اس بتِ مغرور کو ہو، کیا کسی پر التفات
جس کے حسنِ روز افزوں کی یہ اک ادنیٰ ہے بات
ماہِ نو نکلے پہ گذری ہوں گی راتیں پانچ سات
اس رخِ روشن کے آگے ماہِ یک ہفتہ کی رات
تابشِ خورشید پر تنویر آدھی رہ گئی

تا مجھے پہنچائے کاہش، بختِ بد ہے گھات میں — ہاں، فراوانی اگر کچھ ہے، تو ہے آفات میں
جز غم و رنج و الم، گھاٹا ہے ہر اک بات میں — کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے ہات میں
آتے ہی خاصیتِ اکسیر آدھی رہ گئی

سب سے یہ گوشہ کنارے ہے، گلے لگ جا مرے — آدمی کو کیوں پکارے ہے، گلے لگ جا مرے
سر سے گر چادر اتارے ہے، گلے لگ جا مرے — مانگ کیا بیٹھا سنوارے ہے، گلے لگ جا مرے
وصل کی شب، اے بتِ بے پیر! آدھی رہ گئی

یہ میں کیا جانوں کہ وہ کس واسطے ہوں پھر گئے — پر نصیب اپنا انھیں جانا، سنا، جوں پھر گئے
دیکھنا قسمت، وہ آئے اور پھر یوں پھر گئے — آ کے آدھی دور میرے گھر سے وہ کیوں پھر گئے
کیا کشش میں دل کی، اب تاثیر آدھی رہ گئی

ناگہاں یاد آ گئی ہے مجھ کو، یا رب! کب کی بات — کچھ نہیں کہتا کسی سے، سُن رہا ہوں سب کی بات
کس لیے تجھ سے چھپاؤں، ہاں، وہ پرسوں شب کی بات — نامہ بر! جلدی میں تیری وہ جو تھی مطلب کی بات
خط میں آدھی ہو سکی تحریر آدھی رہ گئی

ہو تجلی برق کی صورت میں، ہے یہ بھی غضب — ہاں کچھ گھنٹے کی تو ہوتی فرصتِ عیش و طرب
شام سے آتے تو کیا اچھی گزرتی رات سب — پاس میرے وہ جو آئے بھی تو بعد از نصف شب
نکلی آدھی حسرتِ تقریر، آدھی رہ گئی

تم جو فرماتے ہو، دیکھ، اے غالبِ آشفتہ سر — ہم نہ تجھ کو منع کرتے تھے، گیا کیوں اس کے گھر
جان کی پاؤں اماں، باتیں یہ سب سچ ہیں، مگر — دل نے کی ساری خرابی، لے گیا مجھ کو، ظفر
واں کے جانے میں، مری توقیر، آدھی رہ گئی

غزلیات

(۱)

جگر سے ٹوٹے ہوئے مو کی، ہے سناں پیدا
دہانِ زخم میں آخر، ہوئی زباں پیدا

(۲)

سات جلدوں کا پارسل پہنچا
واہ! کیا خوب برمحل پہنچا

(۳)

ان دلفریبیوں پہ نہ کیوں اُس پہ پیار آئے
روٹھا جو بے گناہ، تو بے عذر من گیا

(۴)

خوشی جینے کی کیا مرنے کا غم کیا
ہماری زندگی کیا، اور ہم کیا

(۵)

تھا تو خط پر نہ تھا جواب طلب
کوئی اس کا جواب کیا لکھتا

(۶)

دو رنگیاں یہ زمانے کی جیتے جی ہیں سب
کہ مُردوں کو، نہ بدلتے ہوئے کفن، دیکھا

(۷)

پیری میں بھی کمی نہ ہوئی تاک جھانک کی
روزن کی طرح، دید کا آزار رہ گیا

وہ مُرغ ہے خزاں کی صعوبت سے بے خبر
آئندہ سال تک جو گرفتار رہ گیا

(۸)

آفت آہنگ ہے کچھ نالۂ بلبل، ورنہ
پھول ہنس ہنس کے، گلستاں میں فنا ہو جاتا

کاش! ناقدر نہ ہوتا ترا اندازِ خرام
میں غبارِ سرِ دامانِ فنا ہو جاتا

یک شبہ فرصتِ شوخی، ہے اک آئینۂ غم
رنگِ گل، کاش، گلستاں کی ہوا ہو جاتا

مستقل مرکزِ غم پر ہی نہیں تھے، ورنہ
ہم کو اندازۂ آئینِ وفا ہو جاتا

دستِ قدرت، ہے، مرا خشت بدیوارِ فنا
گر فنا بھی نہ میں ہوتا، تو فنا ہو جاتا

حیرت اندوزیٔ اربابِ حقیقت مت پوچھ
جلوہ اک روز تو آئینہ نما ہو جاتا

قصدِ کعبہ تھا، مگر موت کی عجلت طلبی
....

(۹)

ملے دو مرشدوں کو قدرتِ حق سے، ہیں دو طالب
نظام الدین کو خسرو، سراج الدین[1] کو غالب

(۱۰)

کوئی اس کا جواب دو صاحب
سائلوں کا ثواب، لو صاحب

(۱۱)

خدا سے میں بھی چاہوں ازرہِ مہر
فروغِ میرزا حاتم علی مہر

(۱۲)

نیازِ عشق، خرمن سوزِ اربابِ ہوس بہتر
جو، ہو جائے نثارِ برق، مشتِ خار و خس بہتر

(۱۳)

سنینِ عمر کے، ستر ہوئے، شمار برس
بہت جیوں تو جیوں اور تین چار برس

(۱۴)

یاد آیا جو وہ کہنا کہ "نہیں، واہ، غلط"
کی تصور نے بصحرائے ہوس، راہ غلط

(۱۵)

بد تر از ویرانہ ہے فصلِ خزاں میں صحنِ باغ
خانۂ بلبل، بغیر از خندۂ گل ہے بے چراغ

پتہ پتہ اب چمن کا انقلاب آسودہ ہے
نغمۂ مرغِ چمن زا ہے صدائے بوم و زاغ

---

[1] سراج الدین بہادر شاہ ظفر شاہِ دہلی

ہاں، بغیر از خوابِ مرگ، آسودگی ممکن نہیں | رخصتِ سستی باندھ، تا حاصل ہو دنیا سے فراغ
شورِ طوفانِ بلا ہے، خندۂ بے اختیار | کیا ہے گُل کی بے زبانی، کیا ہے یہ لالے کا داغ
چشم پُر نم رہ، زمانہ منقلب ہے اے اسد | اب بھی ہے بس، مے شادی سے پُر ہوتا ایاغ

(۱۶)

دیکھنے میں ہیں گرچہ دو، پر ہیں یہ دونوں یار ایک | وضع میں گر ہوئی دو سر، تیغ ہے ذوالفقار ایک
ہم سخن اور ہم زباں، حضرتِ قاسم[1] و طباں | ایک تپش کا جانشیں، درد کا یادگار ایک
نقدِ سخن کے واسطے، ایک عیارِ آگہی | شعر کے فن کے واسطے، مایۂ اعتبار ایک
ایک وفا و مہر میں، تازگیِ بساطِ دہر | لطف و کرم کے باب میں، زینتِ روزگار ایک
گل کدۂ تلاش کو، ایک ہے رنگ، ایک بُو | ریختے کے قماش کو، پود ہے ایک، تار ایک
مملکتِ کمال میں، ایک امیرِ نامور | عرصۂ قیل و قال میں، خسروِ نامدار ایک
گلشنِ اتفاق میں، ایک بہارِ بے خزاں | میکدۂ وفاق میں، بادۂ بے خمار ایک
زندۂ شوقِ شعر کو، ایک چراغِ انجمن | کُشتۂ ذوقِ شعر کو، شمعِ سرِ مزار ایک
دونوں کے دل حق آشنا، دونوں رسول پر فدا | ایک محبِ چار یار، عاشقِ ہشت و چار ایک
جانِ وفا پرست کو، ایک شمیمِ نوبہار | فرقِ ستیزہ مست کو، ابرِ تگرگ بار ایک

لایا ہے کہہ کے یہ غزل، شائبۂ ریا سے دور
کر کے دل و زباں کو، غالبِ خاکسار، ایک

(۱۷)

ولی عہدی میں شاہی ہو مبارک | عنایاتِ الٰہی ہو مبارک

(۱۸)

پیر و مرشد معاف کیجئے گا | میں نے جمنا کا کچھ نہ لکھا حال

---

[1] مصلح الدولہ سید ابوالقاسم خاں وقائع نگار سلطانی

(۱۹)

محفلِ شمع عذاراں میں جو آجاتا ہوں شمع ساں، میں تہِ دامانِ صبا جاتا ہوں

ہوئے ہے، جادۂ رہ، رشتۂ گوہر ہر گام جس گزر گاہ میں، میں آبلہ پا جاتا ہوں

سرگراں مجھ سے سبک روکے نہ، رہنے سے ہو کہ بیک جنبشِ لب، مثلِ صدا جاتا ہوں

(۲۰)

اپنا احوالِ دلِ زار کہوں یا نہ کہوں؟ ہے حیا مانعِ اظہار، کہوں یا نہ کہوں؟

نہیں کرنے کا میں، تقریر ادب سے باہر میں بھی ہوں محرمِ اسرار، کہوں یا نہ کہوں؟

شکر سمجھو اسے، یا کوئی شکایت سمجھو اپنی ہستی سے ہوں بیزار، کہوں یا نہ کہوں؟

اپنے دل ہی سے، میں، احوالِ گرفتاریٔ دل جب نہ پاؤں کوئی غمخوار، کہوں یا نہ کہوں؟

دل کے ہاتھوں سے کہ ہے دشمنِ جانی میرا ہوں اک آفت میں گرفتار، کہوں یا نہ کہوں؟

میں تو دیوانہ ہوں، اور ایک جہاں ہے غمّاز گوش ہیں درپسِ دیوار، کہوں یا نہ کہوں؟

آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو، اسدؔ

حسبِ حال اپنے پھر اشعار، کہوں یا نہ کہوں؟

(۲۱)

جس دن سے کہ ہم غمزدہ زنجیر بپا ہیں کپڑوں میں جوئیں بخیوں کے ٹانکوں سے سوا ہیں

(۲۲)

تم سلامت رہو قیامت تک دولت و عز و جاہ، روز افزوں

(۲۳)

درم و دام اپنے پاس کہاں چیل کے گھونسلے میں ماس کہاں

(۲۴)

جوں شمع ہم اک سوختہ سامانِ وفا ہیں اور اس کے سوا، کچھ نہیں معلوم کہ کیا ہیں

اک سرحدِ معدوم میں، ہستی ہے، ہماری — سازِ دلِ بشکستہ کی بیکار صدا ہیں

جس رُخ پہ ہوں ہم، سجدہ اسی رُخ پہ ہے واجب — گو قبلہ نہیں ہیں، مگر اک قبلہ نما ہیں

مت ہوجیو، اے سیلِ فنا، ان سے مقابل — جانبازِ الم، نقش بدامانِ بقا ہیں

پائی ہے جگہ ناصیۂ بادِ صبا پر — خاکسترِ پروانۂ جانبازِ وفا ہیں

ہر حال میں ہیں، مرضیِ صیاد کے تابع — ہم طائرِ پرسوختۂ رشتہ بپا ہیں

اے وہم طرازانِ مجازی و حقیقی — عشاق، فریبِ حق و باطل سے جدا ہیں

ہم بےخودیِ شوق میں کر لیتے ہیں سجدے — یہ ہم سے نہ پوچھو کہ کہاں ناصیہ سا ہیں

اب منتظرِ شورِ قناعت نہیں غالبؔ — دنیا کے ہر اک ذرے میں سو حشر بپا ہیں

(۲۵)

در پر امیرِ کلبِ علی خاں کے ہوں مقیم — شائستۂ گدائیِ ہر در نہیں ہوں میں

بوڑھا ہوا ہوں، قابلِ خدمت نہیں، اسدؔ — خیرات خوارِ محض ہوں، نوکر نہیں ہوں میں

(۲۶)

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں — میں، دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

ہوں دردمند، جبر ہو یا اختیار ہو — گہ نالۂ کشیدہ، گہ اشکِ چکیدہ ہوں

جاں لب پہ آئی، تو بھی نہ شیریں ہوا دہن — از بسکہ تلخیِ غمِ ہجراں چشیدہ ہوں

نے سبحہ سے علاقہ، نہ ساغر سے واسطہ — میں معرضِ مثال میں، دستِ بریدہ ہوں

ہوں خاکسار، پر نہ کسی سے ہے مجھ کو لاگ — نے دانۂ فتادہ ہوں، نے دامِ چیدہ ہوں

جو چاہیے، نہیں وہ، مری قدر و منزلت — میں، یوسفِ بقیمتِ اوّل خریدہ ہوں

ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ — ہوں میں کلامِ نغز، و لے ناشنیدہ ہوں

اہلِ ورع کے حلقے میں، ہر چند ہوں ذلیل — پر عاصیوں کے زمرے میں، میں برگزیدہ ہوں

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسدؔ — ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

(۲۷)

میں بھولا نہیں تجھ کو، اے میری جاں
کروں کیا؛ کہ یاں گرِ رہے ہیں مکاں

(۲۸)

نسخہ سوزشِ دل درخورِ عنّاب نہیں
سرِ سودا زدہ، آتش کدۂ تاب نہیں

ہمت و حوصلۂ شورشِ شبنم معلوم
قلزمِ اشک، نم دیدۂ خونناب نہیں

. . . .
شبِ تاریک خیالِ دلِ مہتاب نہیں

پرسشِ عشق سے ہے ان کو فراغت مقصود
ہدیۂ پارۂ دل، نازشِ جلباب نہیں

شمع یہ، زیب دہ مجلسِ احباب نہیں

ہمت و شوقِ طلبگاریٔ مقصود کہاں
برق، خرمن زنِ بیتابیٔ سیماب نہیں

تارِ تمکین، حریفِ سرِ مضراب نہیں

گلشنِ ہستیٔ عالم ہے دبستانِ نشاط
نقشِ گل، رونق بے مشقیٔ طلاب نہیں

غم ہی اک چیز ہے دنیا میں، جو کمیاب نہیں

(۲۹)

بے چارہ کتنی دور سے آیا ہے، شیخ جی
کعبے میں کیوں دبائیں نہ ہم برہمن کے پاؤں

(۳۰)

دیکھتا ہوں اسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو
آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو

(۳۱)

شمشیرِ صافِ یار، جو زہراب دادہ ہو
وہ خطِ سبز ہے کہ بہ رخسارِ سادہ ہو

(۳۲)

وضعِ نیرنگیٔ آفاق نے مارا ہم کو
ہو گئے سب ستم و جور گوارا ہم کو

دشتِ وحشت میں نہ پایا کیسی صورت سے فراغ
گردِ جولانِ جنوں تک نے پکارا ہم کو

عجز ہی اصل میں تھا حاملِ صد رنگ عروج
ذوقِ پستی مصیبت نے ابھارا ہم کو

ضعف، مشغول ہے بیکار بہ سعیِ بے جا
کر چکا جوشِ جنوں اب تو اشارا ہم کو

صدرِ محشر کی صدا میں ہے، فسونِ امید
خواہشِ زیست ہوئی آج دوبارا ہم کو

تختۂ گور، سفینے کے مماثل ہیں، اسد
بحرِ غم کا، نظر آتا ہے، کنارا ہم کو

(۳۳)

حسنِ بے پروا، گرفتارِ خود آرائی نہ ہو
گر کمیں گاہِ نظر میں، دل، تماشائی نہ ہو

ہیچ ہے، تاثیرِ عالمگیریِ ناز و ادا
ذوقِ عاشق گر اسیرِ دامِ گیرائی نہ ہو

خود گدازِ شمع، اعجازِ فروغِ شمع ہے
سوزشِ غم، در پئے، ذوقِ شکیبائی نہ ہو

تار تارِ پیرہن، ہے اک رگِ جانِ جنوں
عقلِ غیرت پیشہ، حیرت سے تماشائی نہ ہو

بزمِ کثرت عالمِ وحدت ہے بینا کے لیے
بے نیازِ عشق، اسیرِ زورِ تنہائی نہ ہو

ہے محبت، رہزنِ ناموسِ انساں، اے اسد
قامتِ عاشق پہ کیوں ملبوسِ رسوائی نہ ہو

(۳۴)

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو، جو ابلقِ دوراں بھی رام ہو

تا گردشِ فلک سے یونہی صبح و شام ہو
ساقی کی چشمِ مست ہو اور دورِ جام ہو

بیتاب ہوں، بلا سے کن انکھوں سے دیکھ لیں
اے خوش نصیب! کاش قضا کا پیام ہو

کیا شرم ہے، حریم ہے، محرم ہے رازدار
میں سر بکف ہوں، تیغِ ادا بے نیام ہو

میں چھیڑنے کو، کاش اسے گھور لوں کہیں
پھر شوخ دیدہ بر سرِ صد انتقام ہو

وہ دن کہاں کہ حرفِ تمنا ہو لب شناس
ناکام، بد نصیب کبھی شاد کام ہو

گھل مل کے چشمِ شوق قدمبوس ہی سہی
وہ بزمِ غیر ہی میں ہوں، پر ازدحام ہو

اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اٹھوں
مجھ پر جو چشمِ ساقیِ بیت الحرام ہو
پیرانہ سال غالبِ مے کش کرے گا کیا؟
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

(۳۵)

گاتی تھیں شمرو کی بیگم، تننتنا ہا یا ہو
دودھ میں پکے تھے شلغم، تننتنا ہا یا ہو

(۳۶)

شبِ وصال میں، مونس گیا ہے بن تکیہ
مرا ہے، موجبِ آرامِ جان و تن تکیہ
خراجِ بادشہِ چیں سے کیوں نہ مانگوں آج؟
کہ بن گیا ہے، خمِ جعدِ پر شکن تکیہ
بنا ہے تختۂ گلہائے یاسمیں، بستر
ہوا ہے دستۂ نسرین و نسترن، تکیہ
فروغِ حسن سے روشن ہے، خوابگاہ تمام
جو رختِ خواب ہے پرویں، تو ہے پرن تکیہ
مزا ملے، کہو، کیا خاک ساتھ سونے کا
رکھے جو بیچ میں، وہ شوخِ سیم تن تکیہ
اگرچہ تھا یہ ارادہ، مگر خدا کا شکر!
اٹھا سکا نہ نزاکت سے گل بدن تکیہ
ہوا ہے کاٹ کے چادر کو، ناگہاں غالبؔ
اگرچہ زانوئے نل پر رکھے، دمن، تکیہ
بضربِ تیشہ وہ اس واسطے ہلاک ہوا
کہ ضربِ تیشہ پہ رکھتا تھا، کوہکن تکیہ
یہ رات بھر کا ہے ہنگامہ، صبح ہونے تک
رکھو نہ شمع پر، اے اہلِ انجمن، تکیہ
اگرچہ پھینک دیا تم نے دور سے، لیکن
اٹھائے کیونکہ، یہ رنجورِ خستہ تن، تکیہ
غش آ گیا جو، پس از قتل، میرے قاتل کو
ہوئی ہے اس کو مری لاشِ بے کفن، تکیہ
شبِ فراق میں یہ حال ہے اذیت کا
کہ سانپ فرش ہے، اور سانپ کا ہے من، تکیہ
روا رکھو نہ رکھو، تھا جو لفظ تکیہ کلام
اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن، سخن تکیہ
ہم اور تم فلکِ پیر جس کو کہتے ہیں
فقیرِ غالبِ مسکیں کا ہے، کہن تکیہ

(۳۷)

نہ پوچھ حال اس انداز، اس عتاب کے ساتھ
لبوں پہ جان بھی آ جائے گی جواب کے ساتھ

مجھے بھی تاکہ تمنا سے ہو نہ مایوسی　　ملو رقیب سے لیکن ذرا حجاب کے ساتھ

نہ ہو، بہ ہرزہ، روادارِ سعیِ بے ہودہ　　کہ دورِ عیش ہے، مانا، خیال و خواب کے ساتھ

بہر نمط، غمِ دل، باعثِ مسرت ہے　　نموئے حسرتِ دل ہے، ترے شباب کے ساتھ

سکونِ دل کو تعلق ہے اضطراب کے ساتھ

لگاؤ اس کا، ہے باعثِ قیامِ ہستی کا　　ہوا کو لاگ بھی ہے کچھ، مگر حباب کے ساتھ

ہزار حیف! کہ اتنا نہیں کوئی غالبؔ　　کہ جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

(۳۸)

ہنستے ہیں، دیکھ دیکھ کے، سب، ناتواں مجھے　　یہ رنگِ زرد، ہے چمنِ زعفراں مجھے

(۳۹)

دیکھ وہ برقِ تبسم، بسکہ، دل بیتاب ہے　　دیدۂ گریاں مرا، فوارۂ سیماب ہے

کھول کر دروازۂ میخانہ، بولا مے فروش　　اب شکستِ توبہ میخواروں کو فتح الباب ہے

(۴۰)

اب گرمِ آہ کی، تو ہزاروں کے گھر جلے　　رکھتے ہیں عشق میں یہ اثر ہم جگر جلے

پروانے کا نہ غم ہو، تو پھر کس لیے، اسدؔ　　ہر رات شمع، شام سے لے تا سحر جلے

(۴۱)

ماہِ نو ہوں، کہ فلک عجز سکھاتا ہے مجھے　　عمر بھر ایک ہی پہلو پہ سلاتا ہے مجھے

(۴۲)

زخمِ دل تم نے دکھایا ہے کہ جی جانے ہے　　ایسے ہنستے کو رلایا ہے کہ جی جانے ہے

(۴۳)

صبا، لگا وہ طمانچہ طرف سے بلبل کی　　کہ روئے غنچہ، گل سوئے آشیاں پھر جائے

(۴۴)

نسیمِ صبح جب کنعاں میں بوئے پیرہن لائی　　پئے یعقوب ساتھ اپنے نویدِ جان و تن لائی

وقارِ ماتمِ شبِ زندہ دارِ ہجر رکھتا تھا
سپیدی صبحِ غم کی، دوش پر رکھ کر کفن لائی

زآفت گاہِ صحرائے ازل تا عرصۂ امکاں
مگر روحِ رواں، فتراک میں رنج و محن لائی

شہیدِ شیوۂ منصور ہے، اندازِ رسوائی
مصیبت پیشگیِ مدعا، دار و رسن لائی

وفا، دامن کشِ پیرایۂ ہستی ہے، اے غالبؔ
کہ پھر نزہت گہِ غربت سے تا حدِ وطن لائی

(۴۵)

وفا، جفا کی طلب گار ہوتی آئی ہے
ازل کے دن سے یہ، اے یار، ہوتی آئی ہے

جوابِ جنتِ بزمِ نشاطِ جاناں ہے
مری نگاہ جو خونبار ہوتی آئی ہے

نمودِ جوشِ جنوں، وحشیو، مبارک ہو
بہار، ہدیۂ انظار ہوتی آئی ہے

دل و دماغِ وفا پیشگاں کی خیر نہیں
جگر سے، آہ، شرر بار ہوتی آئی ہے

(۴۶)

وجہِ مایوسیٔ عاشق ہے تغافل اُن کا
نہ کبھی قتل کریں گے، نہ پشیماں ہوں گے

دل سلامت ہے، تو صدموں کی کمی کیا ہم کو
اُنسے اُنسے تو بہت جان کے خواہاں ہوں گے

منتشر ہو کے بھی، دل جمع رکھیں گے، یعنی
ہم بھی اب پیروِ گیسوئے پریشاں ہوں گے

گردشِ بخت نے مایوس کیا ہے، لیکن
اب بھی ہر گوشۂ دل میں کئی ارماں ہوں گے

ہے ابھی خوں سے فقط، گرمیٔ ہنگامۂ اشک
پر یہ حالت ہے، تو نالے شرر افشاں ہوں گے

باندھ کر عہدِ وفا، اتنا تنفّر، ہے ہے
تجھ سے بے مہر کم، اے عمرِ گریزاں ہوں گے

اس قدر بھی دلِ سوزاں کو نہ جان افسردہ
ابھی کچھ داغ تو، اے شمعِ فروزاں ہوں گے

عہد میں تیرے کہاں، گرمیٔ ہنگامۂ عیش
گل، مری قسمتِ واژونہ پہ خنداں ہوں گے

خوگرِ عیش نہیں ہیں، ترے برگشتہ نصیب
ان کو دشوار ہیں وہ کام، جو آساں ہوں گے

موت، پھر زیست نہ ہو جائے، یہ ڈر ہے غالبؔ
وہ مری نعش پہ انگشت بدنداں ہوں گے

(۴۷)

نمائش پردہ دارِ طرزِ بیدادِ تغافل ہے
تسلّی، جانِ بلبل کے لیے، خندیدنِ گُل ہے

نمودِ عالمِ اسباب کیا ہے؟ لفظِ بے معنی / کہ ہستی کی طرح، مجھ کو عدم میں بھی تامّل ہے
نہ رکھ پابندِ استغنا کہ قیدی رسمِ عالم کا / ترا دستِ دعا بھی رخنہ اندازِ توکّل ہے
نہ چھوڑا قید میں بھی وحشیوں کو یادِ گلشن نے / یہ چاکِ پیرہن، گویا، جوابِ خندۂ گل ہے
ابھی دیوانگی کا راز کہہ سکتے ہیں ناصح سے / ابھی کچھ وقت ہے، غالبؔ! ابھی فصلِ گل و مل ہے

(۴۸)

بھولے ہوئے جو غم ہیں، انھیں یاد کیجیے / تب جا کے اُن سے شکوۂ بیداد کیجیے
خود جان دے کے روح کو آزاد کیجیے / تا کے خیالِ خاطرِ جلاد کیجیے
حالانکہ اب زباں میں نہیں طاقتِ فغاں / پر دل یہ چاہتا ہے کہ فریاد کیجیے
بس ہے دلوں کے واسطے، اک جنبشِ نگاہ / اُجڑے ہوئے گھروں کو پھر آباد کیجیے
کچھ دردمند، منتظرِ انقلاب ہیں / جو شاد ہو چکے، انھیں ناشاد کیجیے
شاید کہ یاس، باعثِ افشائے راز ہو / لطف و کرم بھی شاملِ بیداد کیجیے
بیگانۂ رسومِ جہاں ہے، مذاقِ عشق / طرزِ جدیدِ ظلم کچھ ایجاد کیجیے

(۴۹)

ہم سے، خوبانِ جہاں، پہلوتہی کرتے رہے / ہم ہمیشہ مشقِ از خود رفتگی کرتے رہے
کثرت آرائی خیالِ ماسوا کی، وہم تھی / مرگ پر، غافل، گمانِ زندگی کرتے رہے
داغہائے دل، چراغِ خانۂ تاریک تھے / تا مغاکِ قبر، پیدا روشنی کرتے رہے
شورِ نیرنگِ بہارِ گلشنِ ہستی نہ پوچھ / ہم، خوشی اکثر رہینِ ناخوشی کرتے رہے
رخصت، اے تمکینِ آزارِ فراقِ ہمرہاں / ہو سکا جب تک، غمِ وارفتگی کرتے رہے

(۵۰)

درد ہو دل میں، تو دوا کیجے / دل ہی جب درد ہو، تو کیا کیجے
ہم کو فریاد کرنی آتی ہے / آپ سنتے نہیں، تو کیا کیجے

ان بتوں کو خدا سے کیا مطلب — توبہ توبہ، خدا خدا کیجے
رنج اٹھانے سے بھی خوشی ہوگی — پہلے دل دردآشنا کیجے
عرضِ شوخی، نشاطِ عالم ہے — حسن کو اور خودنما کیجے
دشمنی ہو چکی بقدرِ وفا — اب حقِ دوستی ادا کیجے
موت آتی نہیں کہیں، غالبؔ — کب تک افسوس زیست کا کیجے

(۵۱)

سکوتِ وخامشی، اظہارِ حالِ بے زبانی ہے — کمینِ درد میں پوشیدہ، رازِ شادمانی ہے
عیاں ہے حال و قالِ شیخ سے اندازِ دلچسپی — مگر رندِ قدح کش کا ابھی دورِ جوانی ہے
ثباتِ چند روزہ، کارفرمائے غم و حسرت — اجل، سرمایہ دارِ دورِ عیش و کامرانی ہے
گدازِ داغِ دل، شمعِ بساطِ خانہ ویرانی — تپش گاہِ محبت میں فروغِ جاودانی ہے
وفورِ خودنمائی، رہنِ ذوقِ جلوہ آرائی — بو ہمِ کامرانی، جذبِ دل کو شادمانی ہے
دلِ حرماں لقب کی داد دے، اے چرخِ بے پروا — بغارت دادۂ رختِ متاعِ کامرانی ہے

(۵۲)

کس کی برقِ شوخیٔ رفتار کا دلدادہ ہے؟ — ذرہ ذرہ اس جہاں کا اضطراب آمادہ ہے
ہے، غرورِ سرکشی، صورت نمائے عجز بھی — منقلب ہو کر، بسانِ نقشِ پا، افتادہ ہے
خانہ ویراں سازیٔ عشقِ جفا پیشہ نہ پوچھ — نامرادوں کا خطِ تقدیر تک بھی سادہ ہے
خود، نشاط و سرخوشی ہے، آمدِ فصلِ بہار — آج، ہر سیل رواں، عالم میں موجِ بادہ ہے
زندگانی، رہبرِ راہِ فنا ہے، اے اسدؔ — ہر نفس، ہستی سے تا ملکِ عدم، اک جادہ ہے

(۵۳)

اس جور و جفا پر بھی بدظن نہیں ہم تجھ سے — کیا طرفہ تمنا ہے، امیدِ کرم تجھ سے
امیدِ نوازش میں، کیوں جیتے ہیں ہم، آخر — سہتے ہی نہیں کوئی جب درد و الم تجھ سے

وارفتگیٔ دل ہے یا دستِ تصرف ہے ۔۔۔ ہیں اپنے تخیل میں دن رات بہم تجھ سے
یہ جور و جفا سہنا، پھر ترکِ وفا کرنا ۔۔۔ اے ہرزہ پژوہی بس، عاجز ہوئے ہم تجھ سے
غالبؔ کی وفا کیشی اور تیری ستم رانی ۔۔۔ مشہورِ زمانہ ہے، اب کیا کہیں ہم تجھ سے

(۵۴)

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے ۔۔۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ کیا ہوتا ہے

(۵۵)

دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سو آپ کا ۔۔۔ دل لیجیے مگر مرے ارماں نکال کے

(۵۶)

زرافشاں مانگ ہے اور سبز اس پر اک دوشالا ہے ۔۔۔ غضب ہے، پرِ طاؤس میں کالے کو پالا ہے

(۵۷)

بتو، توبہ کرو، تم کیا ہو جب اوبار آتا ہے ۔۔۔ تو یوسفؑ سا حسیں بکنے سرِ بازار آتا ہے

(۵۸)

بجا ہے شیریں اگر چھوڑ دی حج کو چلی ۔۔۔ مثل ہے، تو سو چوہے کھا کے بلّی حج کو چلی

(۵۹)

ذرا[1] اگر زور سینے پر، کہ تیرِ پُرستم نکلے ۔۔۔ جو وہ نکلے تو دل نکلے، جو دل نکلے تو دم نکلے

(۶۰)

گو، نہ ملتے تھے، پر اک شہر میں تو رہتے تھے

(۶۱)

آپ نے مسّنیَ الضُّرُ کہا ہے تو سہی ۔۔۔ یہ بھی اے حضرتِ ایوبؑ گلا ہے تو سہی
رنج، طاقت سے سوا ہو، تو نہ پیٹوں کیونکر ۔۔۔ ذہن میں، خوبیٔ تسلیم و رضا، ہے تو سہی

---

[1] مرزا داغ کا مطلع ہے ؎
نکال اب تیر سینے سے کہ جانِ پُرالم نکلے ۔۔۔ جو یہ نکلے تو دل نکلے، جو دل نکلے تو دم نکلے

ہے غنیمت کہ بہ امید گزر جائے گی عمر — نہ ملے داد، مگر روزِ جزا ہے تو سہی
دوست گر کوئی نہیں ہے جو کرے چارہ گری — نہ سہی، ایک تمنائے دوا ہے تو سہی
غیر سے دیکھیے، کیا خوب نباہی اس نے — نہ سہی ہم سے، پر اس بت میں وفا ہے تو سہی
نقل کرتا ہوں اسے نامۂ اعمال میں، میں — کچھ نہ کچھ روزِ ازل تم نے لکھا ہے تو سہی
کبھی آجائے گی، کیوں کرتے ہو جلدی، غالبؔ — شہرۂ تیزیِ شمشیرِ قضا ہے تو سہی

(۶۲)

کٹے، تو شب کہیں، کاٹے تو سانپ کہلائے — کوئی بتائے کہ وہ زلفِ خم بہ خم کیا ہے
لکھا کرے کوئی احکامِ طالعِ مولود — کسے خبر ہے کہ واں جنبشِ قلم کیا ہے
نہ حشر و نشر کا قائل، نہ کیش و ملت کا — خدا کے واسطے، ایسے کی پھر قسم کیا ہے
وہ داد و دیدِ گراں مایہ شرط ہے، ہمدم — وگرنہ مہرِ سلیمان و جامِ جم کیا ہے

(۶۳)

لطفِ نظارۂ قاتل، دمِ بسمل آئے — جان جائے، تو بلا سے، پہ کہیں دل آئے
ان کو کیا علم کہ کشتی پہ مری کیا گزری — دوست جو ساتھ مرے تا لبِ ساحل آئے
وہ نہیں ہم کہ چلے جائیں حرم کو، اے شیخ — ساتھ حجاج کے اکثر کئی منزل آئے
آئیں جس بزم میں وہ، لوگ پکار اٹھتے ہیں — لو، وہ برہم زنِ ہنگامۂ محفل آئے
دیدہ خونبار ہے مدت سے، و لے آج، ندیم — دل کے ٹکڑے بھی کئی خون کے شامل آئے
سامنا، حور و پری نے، نہ کیا ہے، نہ کریں — عکس تیرا ہی، مگر، تیرے مقابل آئے
اب ہے دلی کی طرف کوچ ہمارا، غالب — آج ہم حضرتِ نواب سے بھی مل آئے

(۶۴)

مسجد کے زیرِ سایہ اک گھر بنا لیا ہے — یہ بندۂ کمینہ، ہمسایۂ خدا ہے

(۶۵)

آج یک شنبے کا دن ہے، آؤ گے — یا فقط رستا ہمیں بتلاؤ گے؟

(۶۶)

تحریر ہے، یہ، غالبِ یزداں پرست کی ۔۔۔ تاریخ اس کی آج نویں ہے اگست ہے

(۶۷)

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے ۔۔۔ عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

رباعیات

(۱)

جن لوگوں کو ہے مجھ سے عداوت گہری ۔۔۔ کہتے ہیں مجھے وہ رافضی اور دہری
دہری کیونکر ہو، جو کہ ہووے صوفی ۔۔۔ شیعی کیونکر ہو ماوراء النہری

(۲)

رقعے کا جواب کیوں نہ بھیجا تم نے ۔۔۔ ثاقبؔ! حرکت یہ کی ہے بے جا تم نے
حاجی کلّو کو دے کے بے وجہ جواب ۔۔۔ غالبؔ کا پکا دیا کلیجا تم نے

(۳)

اے[1] روشنیٔ دیدہ شہاب الدیں خاں ۔۔۔ کٹتا ہے، بتاؤ، کس طرح سے رمضاں
ہوتی ہے تراویح سے فرصت کب تک ۔۔۔ سنتے ہو تراویح میں کتنا قرآں

(۴)

اے غشّیِ خیرہ سر، سخن ساز نہ ہو ۔۔۔ عصفور ہے تو مقابلِ باز نہ ہو
آواز تری نکلی، اور آواز کے ساتھ ۔۔۔ لاٹھی وہ لگی کہ جس میں آواز نہ ہو

(۵)

. . . .
. . . . کھانا نہ انھیں کہ یہ پرائے ہیں آم

---

[1] نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ

ضمیمہ

رکھے امام سے جو بغض کیا کہیں اس کو؟

سلام اُسے کہ اگر بادشا کہیں اُس کو
تو پھر کہیں کہ کچھ اس سے سوا کہیں اُس کو

نہ بادشاہ، نہ سلطاں، یہ کیا ستائش ہے؟
کہو کہ خامسِ آلِ عبؑا کہیں اُس کو

خدا کی راہ میں شاہی و خسروی کیسی؟
کہو کہ رہبرِ راہِ خدا کہیں اُس کو

فروغِ جوہرِ ایماں، حسینؑ ابنِ علیؑ
کہ شمعِ انجمنِ کبریا کہیں اُس کو

کفیلِ بخششِ اُمّت ہے، بن نہیں پڑتی
اگر نہ شافعِ روزِ جزا کہیں اُس کو

مسیح جس سے کرے اخذِ فیضِ جاں بخشی،
ستم ہے کشتۂ تیغِ جفا کہیں اُس کو

وہ جس کے ماتمیوں پر ہے سلسبیل سبیل
شہیدِ تشنہ لبِ کربلا کہیں اُس کو

عدو کے سمعِ رضا میں جگہ نہ پائے وہ بات
کہ جنّ و انس و ملک سب بجا کہیں اُس کو

بہت ہے پایۂ گردِ رہِ حسینؑ بلند
بقدرِ فہم ہے گر کیمیا کہیں اُس کو

نظارہ سوز ہے یاں تک ہر ایک ذرۂ خاک
کہ لوگ جوہرِ تیغِ قضا کہیں اُس کو

ہمارے درد کی یارب کہیں دوا نہ ملے
اگر نہ درد کی اپنے دوا کہیں اُس کو

ہمارا منہ ہے کہ دیں اُسکے حسنِ صبر کی داد؟
مگر نبیؐ و علیؑ مرحبا کہیں اُس کو

زمامِ ناقہ کف اُسکے میں ہے کہ اہلِ یقیں
پس از حسینؑ علیؑ پیشوا کہیں اُس کو

وہ ریگِ تفتۂ وادی پہ گام فرسا ہے
کہ طالبانِ خدا رہنما کہیں اُس کو

امامِ وقت کی یہ قدر ہے کہ اہلِ عناد
پیادہ لے چلیں اور ناسزا کہیں اُس کو

یہ اجتہاد عجب ہے کہ ایک دشمنِ دیں
علیؑ سے آکے لڑے اور خطا کہیں اُس کو

یزید کو تو نہ تھا اجتہاد کا پایہ — بُرا نہ مانیئے، گر ہم بُرا کہیں اُس کو
علی کے بعد حسنؑ اور حسنؑ کے بعد حسینؑ — کرے جو اُن سے بُرائی، بھلا کہیں اُس کو
نبیؐ کا ہو نہ جسے اعتقاد، کافر ہے — رکھے امام سے جو بغض، کیا کہیں اُس کو

بھرا ہے غالبِ دل خستہ کے کلام میں درد
غلط نہیں ہے کہ خونیں نوا کہیں اُس کو

غزل

جنوں رسوائیِ وارستگی زنجیر بہتر ہے — بقدرِ مصلحت، دل تنگیِ تدبیر بہتر ہے
خوشا خود بینی و تدبیر و غفلت نقد اندیشہ — بدینِ عجز اگر بدنامیِ تقدیر بہتر ہے
کمالِ حسن اگر موقوفِ اندازِ تغافل ہو — تکلف برطرف، تجھ سے تری تصویر بہتر ہے
دلِ آگاہ تسکیں خیزِ بیدردی نہ ہو یارب — نفس آئینہ دارِ آہِ بے تاثیر بہتر ہے
خدایا چشم تا دل درد ہے افسونِ آگاہی! — نگہ حیرت سوادِ خوابِ بے تعبیر بہتر ہے
درونِ جوہرِ آئینہ جوں برگِ حنا خوں ہے — بنائے نقشِ خود آرائی، حیا تحریر بہتر ہے

تمنائے اسد قتلِ رقیب اور شکر کا سجدہ
دعائے دل بمحرابِ خمِ شمشیر بہتر ہے

اور تو رکھنے کو ہم دہر میں کیا رکھتے تھے — مگر اک شعر میں اندازِ رسا رکھتے تھے
اس کا یہ حال کہ کوئی نہ ادا سنج ملا، — آپ لکھتے تھے ہم اور آپ اٹھا رکھتے تھے

زندگی[1] اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

---

[1] - سارے متداول ایڈیشنوں میں صرف یہ مقطع ہی ملتا ہے دوسرے شعر نہیں پائے جاتے۔

مصرع — معلوم ہوا غیر کہ ٹھینگا با جب

مصرع — خوشنودیٔ احباب کا طالب غالب

خدا کے بعد نبیؐ اور نبی کے بعد امام
یہی ہے مذہبِ حق، والسلام والاکرام

میں قائلِ خدا و نبیؐ و امام ہوں
بندہ خدا کا اور علیؑ کا غلام ہوں

مصرع — جو پائے حالِ دہلی والور سلام لو

مصرع دیکھئے کیا جواب آتا ہے

مصرع یہ خبط نہیں تو اور کیا ہے؟

مصرع اے اہلِ بزم کوئی تو بولو خدا لگی

رباعی

اصحاب کو جو ناسزا کہتے ہیں
سمجھیں تو ذرا دل میں کہ کیا کہتے ہیں
سمجھا تھا نبیؐ نے ان کو اپنا ہمدم
ہے ہے، نہ کہو کسے بُرا کہتے ہیں

رباعی

یارانِ رسولؐ یعنی اصحابِ کبار
ہیں گرچہ بہت خلیفہ ان میں ہیں چار
ان چار میں ایک سے ہو جس کو انکار
غالبؔ وہ مسلمان نہیں ہے زنہار

رباعی

یارانِ نبی میں تھی لڑائی کس میں
الفت کی نہ تھی جلوہ نمائی کس میں
وہ صدق، وہ عدل، وہ حیا اور وہ علم
بتلاؤ کوئی کہ تھی بُرائی کس میں؟

رباعی

یارانِ نبیؐ سے رکھ تولّا باللہ
ہر یک ہے کمال دیں میں یکتا، باللہ
وہ دوست نبیؐ کے اور تم ان کے دشمن
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

اس قدر ضبط کہاں ہے کبھی آبھی نہ سکوں
ستم اتنا تو نہ کیجیے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو راہیں[لہ]
موت کچھ تم تو نہیں ہو کہ بلا بھی نہ سکوں

لگ گئی آگ اگر گھر کو تو اندیشہ کیا
شعلۂ دل تو نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں

ہنس کے بلوائیے، مٹ جائیگا سب دل سے گلہ
کیا تصوّر ہے تمہارا کہ مٹا بھی نہ سکوں

رباعی

شاہا! تجھے باد دولت و بختِ فیروز
فرّخ ہو سدا جہاں میں جشنِ نوروز
ہو دے شرف اندوز ترے طالع سے
ہر سال حمل میں، مہرِ عالم افروز

قطعہ

عید آئی ہے، دلِ اہلِ زمانہ شاد ہے
عیش سے وابستہ ہے غم سے ہر اک آزاد ہے
عشرت و عیش و طرب چھائے ہوئے ہیں جابجا
ہر طرف اک جشن ہے ہر سو مبارک باد ہے

قطعہ

گلشنِ دہر میں بسنت آئی
خوب گلدستۂ خوشی لائی
گوشِ گل سوئے دیدۂ بلبل
دیدۂ گلرخاں تماشائی

مزا تو جب ہے کہ اے آہِ نارسا ہم سے
وہ خود کہے کہ بتا، تیری آرزو کیا ہے

جو معشوق زلفِ دوتا باندھتے ہیں
مرے سر سے کالی بلا باندھتے ہیں

لہ تم نہ آؤ گے تو مرنے کی ہیں سو تدبیریں۔ اس غزل کے دوسرے اشعار اس دیوان کے صفحہ ۹۶ پر ملاحظہ ہوں۔ (مولانا حامد حسن قادری کے مملوکہ دیوان میں یہ مصرع اس طرح ہے)

وصل میں ہجر کا ڈر یاد آیا — عین جنت میں سقر یاد آیا

پوچھے ہے کیا معاشِ جگر تفتگانِ عشق — جوں شمع اپنی آپ وہ خوراک ہو گئے

حالت نزع عاشق کی یار اب آن بنی ہے — اعضا شکنی ہو چکی اب جاں شکنی ہے

گھر سے نکالنا ہے اگر، ہاں نکالیے — ناحق کی حجتیں نہ مری جاں نکالیے

بس بوسہ یا مصیبتِ ہجراں بیاں کریں — اک منہ ہے کون کون سے ارماں نکالیے

دل کو ہر چند میں دیتا رہا قسم چند رہا — آخر اس زلف کا قیدی بدمِ چند رہا

جور سے اُس کے اُٹھاتا ستم چند رہا — دلِ بیتاب کہ سینے میں دمِ چند رہا

بہ دمِ چند گرفتارِ غمِ چند رہا

عشق میں ہونے نہ پلے تھے ہنرمند تمام — اور نہ کچھ عیش و طرب سے ہوئے خورسند تمام

حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں بند تمام — زندگی کی ہوئیں ناگہ نفسِ چند تمام

کوچۂ یار جو مجھ سے قدمِ چند رہا

یاد کر کر کے شب و روز تری گلبدنی — حسرتِ عشق میں پھر ایسی ہوئی کم سخنی

جز خموشی کے کوئی بات نہ پھر مجھ سے بنی — لکھ سکا میں نہ اُسے شکوۂ پیماں شکنی

لاجرم توڑ کے عاجز قلمِ چند رہا

مجھ کو دولت سے نہیں کام سنا اے گردوں — گوہرِ اشک سے چاہوں تو میں جنگل بھر دوں،

جو کہ عاشق ہیں وہ دولت کو سمجھتے ہیں زبوں — الفتِ زر ہمہ نقصان ہے کہ آب تک قاروں

زیرِ بارِ غمِ دام و درمِ چند رہا،

دیکھ کر حسنِ بتاں اور وہ رعنائی قد — نشۂ عشق جو اُبلا خمِ دل سے بے حد

تب ہدایت کا گیا صبر و قرار عقل و خرد — عمر بھر ہوش نہ بجا رہے میرے کہ اسدؔ

میں پرستندۂ روئے صنمِ چند رہا[1]

---

[1] ہماری زبان علی گڑھ مطابق یکم اگست، ۸ اگست ۱۹۶۱ء میں تبرکاتِ غالب کے عنوان سے جناب سراج دھولپوری نے شائع کرائے ہیں۔

تضمین

واہ وا شرطِ محبت ہے یہی   یاد ہیں، ہم سے جو وعدے تھے کبھی
خیر او پیماں شکن، یوں ہی سہی   مرورِ سیمینا، بصحرا می روی
نیک بد عہدی کہ بے ما می روی

تو جو نکلا شب کی تاریکی گئی،   ہر طرف پھیلی ہے دن کی روشنی
عقل حیراں اس میں ہے جانانِ مری   روئے پنہاں دار و از مردم پری
تو پری رو آشکارا می روی۔

دی کبھی راحت کبھی تکلیف دی   جاں بخشی کی کسی دم جان لی
جانِ جاں ہے، شانِ معشوقی یہی   می نوازی بندہ را یا می کشی
می نشینی یک نفس یا می روی

حسن کا تیرے ہے شہرہ کو بکو   دید بازوں کا ہے میلہ چار سو
کیوں ہے پھر سیرِ چمن کی آرزو   اے تماشا گاہِ عالم روے تو
تو کجا بہرِ تماشا می روی!

جانِ جاں طبع اسد ہے نادرست   ساتھ چلتا، گر وہ ہوتا چاق و چست
تو دمِ رخصت عبث بیٹھا ہے سست   دیدۂ سعدی و دل ہمراہِ تست
نہ پنداری کہ تنہا می روی — !

---

[2] نتیجہ اپنی آہوں کا ہے شکلِ مستوی پیدا   ہیولا صورتِ کالبوس پھر خوابِ گراں کیوں ہے

جو حدِ تقویٰ ادا نہ ہووے تو اپنا مذہب یہی ہے غالبؔ[3]
ہوس نہ رہ جائے کوئی باقی، گناہ کیجے تو خوب کیجے

۱؎ ہماری زبان علی گڑھ ۸ راگست ۱۹۶۱ء میں یہ مخمسہ بھی شائع ہوا۔
۲؎ "طوفان" نواب شاہ جولائی ۱۹۵۱ء میں شائع ہوا ۳؎ گلزارِ سخن ص ۲۹۷

جدید و قدیم

منظومات

خم کاکل (بشمول دور و دراز)	سیف الدین سیف	5.00
ترجمان اسرار	جسٹس ایس-اے-رحمان	4.00
برگ نے (تیسرا ایڈیشن)	ناصر کاظمی	3.50
رم جھم (چھٹا ایڈیشن)	احمد ندیم قاسمی	4.00
جزیروں کے گیت	میجر سید ضمیر جعفری	2.00
لہو ترنگ	,,	2.00
زنداں نامہ	فیض احمد فیض	3.00
دست صبا	,,	3.00
نقش فریادی	,,	3.00
دست تہ سنگ	,,	3.00
تیز ہوا اور تنہا پھول	منیر نیازی	3.00
زخم بہار	باقی صدیقی	2.50
برگ آوارہ	حبیب جالب	4.00
خوں آہنگ	نعیم صدیقی	4.00
کلیات غالب (اردو) مع مقدمہ	از پروفیسر یوسف جمال انصاری	10.00
نقش چغتائی	(دیوان غالب مصور ایڈیشن)	25.00
گردش جام	سید عبدالحمید عدم	2.25
شہر خوباں	,,	2.00
گلنار	,,	2.00
بط مے	,,	2.00
ساز و صدف	,,	2.50
سرو و سمن	,,	3.00
عکس جام	,,	2.50
حبسیات	مولٰینا ظفر علی خاں	2.00
خیالستان	,,	2.00
چمنستان	,,	3.50
نگارستان	,,	3.50
بہارستان	,,	10.00

مکتبۂ کارواں - لاہور

ڈسٹ کور مطبوعہ : مکتبہ جدید پریس لاہور